دل گداز تحریریں، ٥ زندگی کی تصویریں

کراچی

ماہنامہ

سچی کہانیاں

35 سال

DECEMBER
2018

ونرز

تیسری چابی — ثمینہ مشتاق

وہ سرد رات — ڈاکٹر جویریہ ندا

کیو ریسٹورنٹ — کوثر اسلام

☜ عامل کامل، سچی کہانیاں کا نیا ہوشربا سلسلہ جو پڑھنے والوں کو جادو کی کالی دنیا سے آشنا کرائے گا

☜ مسئلہ یہ ہے، آپ کے مسائل کا روحانی حل، سچی کہانیاں کا مقبول ترین سلسلہ

ماہنامہ سچی کہانیاں کراچی

E-mail pearlpublications@hotmail.com

بانی سہام مرزا



مدیرہ اعلیٰ: منزہ سہام

مدیر: دانیال شمسی

نائب مدیرہ: ماہم اوزلین

منیجر مارکیٹنگ
زین شمسی
0331-8221212

منیجر سرکولیشن
آفتاب عالم
0334-3193174

انکم ٹیکس ایڈوائزر
مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹس)

رابطے کے لیے
021-35893121
021-35893123

MEMBER APNS CPNE	رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

خط و کتابت کا پتا C-II-88 فرسٹ فلور خیابان جامی کمرشل (یونائیٹڈ بیکری کے اوپر) ڈیفنس فیز-7 ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

قیمت فی شمارہ: 70 روپے ✵ جلد: 35 - شمارہ: 12 ✵ دسمبر 2018ء

ایڈیٹر، پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

فون: 021-35893121-35893122 / پرنٹر: حسام محی الدین عباسی، سٹی پریس OB-7، تالپور روڈ، کراچی

زرسالانہ بذریعہ رجسٹری پاکستان 1000 روپے افریقہ 75 ڈالرز کینیڈا، آسٹریلیا 75 ڈالرز ایشیا، یورپ 65 ڈالرز



دکھ ہوئے تمام...

زندگی بڑی ظالم ہے، جینے کے لیے جتنے جتن کرو یہ بالآخر ختم ہو ہی جاتی ہے۔ چند یادیں، چند باتیں اور دکھوں کی ایک طویل فہرست کل سرمایۂ حیات ہے اور اس سرمایہ حیات کے لیے انسان کتنی جدوجہد کرتا ہے۔ کتنی بار دل ٹوٹتا ہے۔ آنکھیں بھی نم ہوتی ہیں، سانسیں سینے میں اٹکتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں مگر ہم پھر بھی جئے جاتے ہیں۔ لوگوں پر پاؤں رکھ کر چلتے چلے جاتے ہیں۔ فہمیدہ ریاض بھی چلی گئیں وہ بے مثال شاعرہ، وہ حق کی خاطر علم بلند کرنے والی دلیر خاتون، سالوں خود ساختہ جلاوطنی جھیلنے والی مرد مار فہمیدہ ریاض روز ٹوٹتی رہی، بکھرتی رہی یہ کوئی نہیں جانتا جس کو ہاتھ تھام کر چلنا سکھایا تھا، جن کے بازو تھام کر اب چلنا تھا وہ پیارا اور لاڈلا بیٹا تو پہلے ہی قبر میں جا سویا۔ کبیر کی جواں سال موت کو جھیلنے والی یہ ماں واقعی میں بہت بہادر تھی مر تو بہت پہلے گئی تھی اب لحد میں بھی اتر گئی، یوں ایک کہانی ہوئی ختم، دکھ ہوئے تمام......

منزہ سہام

احوال

مدیرہ اعلیٰ

قارئین کے درمیان رابطہ' آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

عزیز احوالیو! دسمبر کی ٹھنڈ میں آپ کے لیے گرما گرم سچی کہانیاں حاضر ہے۔ اس بار ہر کہانی ایک سے بڑھ کر ایک ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ لوگ گرما گرم چائے اور کافی کے ساتھ ان کہانیوں کو بھی خوب انجوائے کریں گے۔ ایک بار پھر یاد دہانی کروادوں کہ فروری 2019ء کا شمارہ پُراسرار نمبر ہوگا اور اپریل کا شمارہ عشق نمبر لہٰذا کاغذ قلم اٹھالیں اور اپنا دل کھول کر رکھ دیں۔ آج 18 تاریخ تک موصول ہونے والے تمام خطوط احوال میں شامل ہیں دیر سے ملنے والے خطوط کی رسید دی جارہی ہے۔ سچی کہانیاں کے قارئین سے گزارش ہے کہ اپنا تعارف ضرور ارسال کرتے رہیں باری آنے پر سب شائع ہوں گے۔ ایک گزارش اور ہے کہ برائے مہربانی چھپی ہوئی تحریریں مت ارسال کریں یہ انتہائی قبیح حرکت ہے' یا ایک ہی کہانی دو اداروں میں بھیجنا بھی برا فعل ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ کسی کو بھی Ban کروں لہٰذا احتیاط لازم ہے' چلیے اب بڑھتے ہیں اپنے پہلے خط کی جانب......

ارشد اقبال چوہان فیصل آباد سے لکھتے ہیں۔ پیاری بہنا السلام علیکم! اللہ کرے سب بخیر ہوں میں چونکہ اپنے مقام پر نہ تھا اس لیے پرچہ دیر سے حاصل کرسکا۔ میں نے اگر کچھ کیا ہے (بلکہ ابھی تو کچھ بھی نہیں کیا کیونکہ میں اپنے سچی کہانیاں کو بلندیوں پر دیکھنے کا آرزومند ہوں) تو یہ قرض حسنہ ہے۔ اب شمارہ نومبر کی بات ہوجائے تو میرے ہی خط میں دو غلطیاں ہیں۔ اسلام کو انعام بنادیا گیا ہے اور دوسری جگہ اسلام کی جگہ پر ایسا ہی لکھ دیا گیا ہے۔ ملازم حسین شیرازی صاحب کی بلائے جان میں صفحات کی ترتیب بری طرح غلط ہے۔ خود غور فرمالیں۔ پچھلے ماہ کا تحریر کردہ خط میں نے 10 اکتوبر کو بھجوایا تھا۔ جو 11 کو مل گیا ہوگا۔ منیجر صاحب کا فون 31 اکتوبر کو آیا تھا مگر مکمل بات نہ ہوسکی تھی۔ 13 نومبر کو میں سفر میں تھا تو پی ٹی سی ایل نمبر سے کال آئی نہ جانے کس کی تھی' میں سن نہ سکا۔ اب انشاء اللہ میں خود رابطہ کروں گا۔ پُراسرار کہانی نمبر میں کوئی کہانی ایسی نہیں جس پر کوئی تنقید کی جاسکے۔ سب ہی ایک سے بڑھ کر ایک ہیں میرا خیال ہے اتنا تبصرہ ہی کافی ہے۔ صرف اپنی بیٹی مون شاہ کے تعارف پر بات کروں گا اللہ میرے پاکستان کی ہر بیٹی آپ جیسی ہوجائے آمین آپ نے اپنی چند خامیوں کی بات کی ہے۔ تو میری پیاری بیٹی پوری کائنات میں اگر کوئی مکمل ہستی ہے تو وہ ہمارے نبی پاک ﷺ ہیں اس لیے ایسا مت سوچا کریں آپ کی مزید کامیابیوں کے لیے دعا گو ہوں۔ شوبز والا اضافہ اچھا لگا۔ ایک تجویز ہے کہ قیمت میں صرف دس روپے کا اضافہ کردیں۔ دوسروں نے تو 100 کردیا ہے اپنے ملک قوم اور سچی کہانیاں کے لیے بہت سی دعاؤں کے ساتھ اگلے ماہ تک کے لیے اجازت۔

☆ بھائی ارشد! آپ نے بالکل صحیح غلطیوں کی طرف نشاندہی کی ہے آئندہ احتیاط برتی جائے گی۔ آپ کی اس سطر نے ہی میرا حوصلہ ہمالیہ سے بلند کردیا کہ میرا خیال ہے کہ اتنا تبصرہ ہی کافی ہے۔ بھائی قیمت میں اضافہ اس وقت کریں گے جب حالات ناگزیر ہوں گے ابھی میں اپنے پڑھنے والوں پر بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی۔ دعا کیجیے حالات ایسے ہوجائیں کہ قیمت کم کرسکیں۔

عابدہ مغل کراچی سے لکھتی ہیں۔ السلام علیکم ڈیئر منزہ آپی کیسی ہیں آپ اللہ عزوجل سے آپ کی صحت وکامرانی اور حقیقی خوشیوں بے بہا ترقیوں کے لیے دعا گو ہوں میں اپنی نئی کہانی آپ کو ارسال (بذریعہ رجسٹری) کررہی ہوں موصول

ہونے پر ایک پیغام بھیج دیجیے گا میرے نمبر پر یہ کہانی بالکل سچی ہے امید ہے آپ کو پسند آئے گی۔ ہمارے مومن آباد میں پوسٹ آفس دور پڑتا ہے میں نے اس بار اکتوبر 2018ء کے لیے بھی احوال میں خط بذریعہ رجسٹری بھیجا ہے خط ضرور لگایئے گا آپی کیونکہ میں اپنے بچوں کو لینے جب اسکول جاتی ہوں تو واپسی پر پوسٹ آفس جاتی ہوں بچے بھاری بیگ لے کر میرے ساتھ ویٹنگ میں کھڑے ہوتے ہیں ایسے میں احوال میں خط نہ چھپے تو دل دکھتا ہے باقی میری ساری کہانیاں آپ نے شائع کیں آپ کی مہربانی ہے خوفناک کہانی بھی لکھی ہے مگر فیئر نہ کر سکی کیونکہ میرے بیٹے کو بخار تھا پورا ہفتہ اسی میں گزر گیا یوں میں خوفناک نمبر میں چاہ کر بھی شامل نہ ہو سکی۔ اللہ حافظ آپی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

☆ ولسن ساگر سیالکوٹ سے لکھتے ہیں۔ سلام عرض ہے ماشاء اللہ سے سب کا سچی کہانیاں دن بہ دن نکھرتا جا رہا ہے۔ اس کی تمام تحریریں بہت عمدہ ہوتی ہیں ممتاز احمد کو پڑھ لیں یا جاوید راہی کو فیصل مشتاق کو پڑھ لیں یا مجید احمد جائی کو ایک سے بڑھ کر ایک نگینہ ہیں منزہ آپی کے خطوں کے جوابات دینا اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ تمام خطوط اور تحریروں کو حرف بہ حرف پڑھتی ہوں اور خطوط کا شائع ہو جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ سچی کہانیاں کے آفس میں کوئی ردی کی ٹوکری نہیں ہے۔ میں اپنی ایک اور کہانی "کرایہ دار" کے عنوان سے بھجوا رہا ہوں امید ہے کہ یہ جلد ڈائجسٹ کے صفحات پر جگہ بنانے میں کامیاب ہو جائے گی آپی فریدہ جاوید فری، نفیسہ فضل، حسن نظامی، ڈاکٹر طارق محمود آکاش کو بہت بہت سلام زندگی رہی تو آئندہ ماہ پھر ملاقات ہوگی۔

◆ بھائی ولسن! یہ خیال دل سے نکال دیں کہ سچی کہانیاں کے آفس میں ردی کی ٹوکری نہیں ہے۔ بالکل ہے اور میری میز کے نیچے بڑے کروفر سے براجمان ہے مگر اس کی غذا ردی ہے سچی کہانیاں سے محبت کرنے والوں کے خطوط نہیں کھوٹ سکہ شائع کردی ہے امید کرتی ہوں کہ آئندہ اسی انداز میں کہانی لکھیں گے۔

☆ طاہر مقصود ہاشمی مچن آباد سے لکھتے ہیں۔ السلام علیکم! اللہ پاک آپ کو اور سچی کہانیاں کے تمام ساتھیوں کو سدا خوش رکھے تندرستی والی لمبی عمر دے آمین سب سے پہلے تو میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری کہانی لگائی مجھے بہت خوشی ہوئی ماہ اکتوبر کے سچی کہانیاں کو میں نے بہت غور سے پڑھا ہے۔ مجھے اس کی تمام تحریریں بہت پسند آئی ہیں۔ غزالہ عزیز صاحبہ کی تحریر غلام جو بنے سردار بہت ایمان افروز تحریر تھی۔ جاوید راہی کی آخری گھاؤ بڑی دل اور دماغ کو تکلیف دینے والی تحریر تھی۔ عورتوں کے ساتھ مرد حضرات ایسا کر لیتے ہیں۔ افتخار چوہدری کی تحریر ٹرانسفر لیٹر نے بڑا مزہ کیا۔ شروع سے لے کر آخر تک تجسس اور تسلسل قائم رہا۔ مگر اگر رفعت زندہ رہتی تو دل کو خوشی ہوتی، اس کے مر جانے سے دل کو تکلیف ہوئی، شاہد رفیق سہو کی تحریر بڑی دیر کی مہرباں بہت اچھی تھی۔ اس میں ارحان کا کردار بہت عمدہ اور عظیم لوگوں والا تھا۔ مقصود احمد بلوچ کی تحریر نازو کہاں چلی گئی بہت اچھی تھی مگر نازو کے چلے جانے سے تحریر افسردہ ہو گئی۔ مجید احمد جائی کی تحریر نادانیاں بڑی دلچسپ اور حقیقت پر مبنی تھی اس کا انجام بہت اچھا ہوا۔ احمد کی بیوی نے خوب اس سے بدلہ لیا۔ پیار محبت، خوشی، غمی کی ملی جلی تحریر تھی۔ اس میں لڑکیوں کے لیے سبق بھی تھا اور والدین کے لیے بھی کہ ان کو اپنی اولاد پر کڑی نظر رکھنی چاہیے۔ سید ابو محمد آزاد کی میاں چھوڑ و مزاح "بذلہ سنجی" شگفتگی کا امتزاج تھی۔ فرزانہ نگہت کی تحریر یم جی بہت اچھی لگی شروع سے آخر تک کوئی جھول نہیں تھی پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ذہین لڑکی نے اپنی عقل و دانش سے اپنی بیماری کو کیسے چھپایا اور لوگوں کو کیسے بدھو بنایا۔ عبدالغفار عابد کا تعارف پڑھا جس سے اندازہ ہوا کہ وہ ادارہ سچی کہانیاں سے کس قدر مخلص ہیں۔ ناصر ملک کی غزل عمدہ شاعری کی ایک مثال تھی عاکف عثمان کی تحریر ہائی اور شاہ مرید پیار محبت اور بلوچی ادب سے آگاہی پر مبنی اچھی تحریر تھی۔ عمران قریشی کی تحریر ستم گزیدہ بہت عمدہ تحریر تھی۔ آج بھی ہمارے وڈیرے اور جاگیردار اپنے مزارعوں کی بیٹیاں کے ساتھ ایسا سلوک روا رکھتے ہیں مگر کبھی کبھی انہیں بھاری قیمت بھی ادا کرنا پڑتی ہے صفیہ نے اپنے خاوند کی جان کی خاطر اپنی عزت بیچ دی۔ مگر خاوند روایتی خاوند ثابت ہوا۔ ریحانہ اعجاز فتح محبت عمدہ تحریر تھی۔ منزہ سہام صاحبہ کی تحریر ریت کی گود میں بہت دکھی اور رنجیدہ تھی۔ پڑھنے کے بعد کئی گھنٹے دل پریشان رہا۔ عابدہ مغل کی مینا تو جھلی ہے تحریر نے اتنی ہنسی دی کہ بتا نہیں سکتا ایسا لٹریچر صرف سعادت حسن منٹو لکھتے تھے اس تحریر میں زمانے کی آنکھ سے ایک پردہ ہٹایا گیا ہے عالی کاکل، غفلت کے پردے وہ ایک ڈکیتی، قسمت کی لکیر، ستارہ خواب زادی، ساڈا حق ایتھے رکھ وہ ایک ڈکیتی، مان ٹوٹ

گیا' المناس' سب تحریریں بہت اچھی اور حقیقی کے عین قریب تھیں۔ آخر میں ایک بار پھر ادارہ سچی کہانیاں کے اسٹاف اور قارئین کی خدمت میں دعا سلام۔

◀ طاہر بھائی! شمارہ پسند کرنے کا شکریہ آپ نے بہت جامع خط لکھا امید کرتی ہوں کہ اگلے ماہ بھی احوال میں ضرور شرکت کریں گے۔

☆ ایم ایمان قاضی ڈیرہ غازی خان سے لکھتی ہیں۔ ڈیئر منزہ صاحبہ' السلام علیکم! کیسی ہیں منزہ جی' امید اور دعا ہے کہ ٹھیک ہوں گی۔ ایک ئی کاوش جو کہ ایک حقیقت پر مبنی واقعے پر مشتمل ہے روانہ خدمت ہے مجھے خوشی ہے کہ رائٹرز کی حساسیت اور آنکھوں دیکھے کو شائع کر کے جہاں آپ ان کی روحانی تسکین کو جلا پہنچاتی ہیں وہاں ہو سکتا ہے ہمارے ہاتھوں اور دل سے نکلے کچھ الفاظ اگر کسی کو راہِ راست سے بھٹکانے سے روک دیں یا اچھائی کی طرف راغب کر دیں تو یہ ہمارے لیے زادِ راہ کا ایک ذریعہ ہوگا۔ وہاں مجھے فخر ہے کہ میں آپ کی بھی ٹیم کا حصہ ہوں' امید ہے میری کاوش کو جگہ دے کر شفقت سے کام لیں گی۔

◀ پیاری اُمِ ایمان! تم نے درست کیا ہمارا مقصد بھی یہی ہونا چاہیے کہ ہمارا ہر لفظ اور ہر قدم کسی اور اکے لیے مشعل راہ ہو۔ زبان کے چٹخانے کے لیے میں اپنے ڈائجسٹ کے صفحات سیاہ کرنے کی بالکل قائل نہیں۔ تم جیسی اچھی لکھاری کے تعاون کی ہمیشہ متمنی رہوں گی۔

☆ محسن علی طاب ساہیوال سے لکھتے ہیں۔ السلام علیکم! آپی منزہ سہام' امید ہے آپ باخیریت ہوں گی اللہ پاک آپ کو صحت و ایمان والی لمبی عمر عطا فرمائے آمین پُراسرار نمبر 2 کے لیے کہانی بھیا نک چیلہ اس خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں امید ہے آپ کو پسند آئے گی۔ یہ کہانی سچی ہے مگر میں نے حالات نام کردار بدل دیے ہیں اب ہو جائے ماہنامہ سچی کہانیاں نومبر 2018ء پُراسرار نمبر پر تبصرہ پُراسرار نمبر کا ٹائٹل مجھ سمیت کافی دوستوں کو پسند آیا۔ آپ نے صفحہ بس ایک پھاٹک میں کڑوا سچ بولا مگر کیا کریں وطن سے کوئی مخلص نہیں سب کی نظر بس اپنی بھری جیب پر ہے دوسرے جائیں بھاڑ میں' جلدی سے خطوط کی طرف بڑھا میرا خط وزنی تھا بہت شکریہ آپی آپ کی محبت ہے ورنہ بندہ ناچیز کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ ڈاکٹر طارق صاحب میں ٹھیک اللہ پاک کا کرم ہے دعائیں مجید احمد جائی کی بک واقعی زبردست ہے آپ کا افسانہ بھی پڑھا تھا مجید جائی کو میری طرف سے ایک بار پھر مبارکباد' مجید احمد جائی اللہ پاک حاسدوں سے بچائے اور زیادہ کامیابیاں عطا فرمائے آمین آپی نزہت جبیں ضیا کی بک بھی بہت خوشی ہوئی تھی اللہ پاک آپی نزہت جبیں ضیاء کو سلامت رکھے آمین۔ میں یہ بتاتا چلوں کہ اروشہ خان بہنا سوشل میڈیا پر موجود ہیں فیصل مشتاق یا ریحانہ اعجاز کے ذریعے تصدیق کر لیں یا اروشہ خان کو سرچ کر لیں آئی ڈی مل جائے گی ملازم حسین شیراز بھائی سلامت رہو' ہاجرہ عمران ویلکم سسٹر' آپ بھی آجائیں مستقل یہاں' جنہوں نے مجھے یاد رکھا اُن کا بہت شکریہ مجھے جن کے خط اچھے لگے حسن نظامی' نازیہ بتول' حمیرا وحید' ڈاکٹر طارق' رفعت خان' خالق بھٹی' ملازم حسین شیرازی' اروشہ خان عروش اور سور شاہد پسند آئے گے بڑھے نئے آنے والوں کو ویلکم شمیم صاحبہ کی ساس کو رب کریم جنت عطا فرمائے اور سب گھر والوں کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین' ونرز کو دلی مبارکباد خاص کر مجید احمد جائی کو سلامت رہیں۔ حضرت اسلم حبشیؓ کو جان کر اچھا لگا یہ سلسلہ بہت اچھا ہے اسلامی تاریخ کے بارے میں معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ تیسری چابی بے شک زبردست تحریر تھی نیل گری افتخار چوہدری بھی اچھی تحریر لائے لاجونتی عمدہ تحریر تھی۔ حافظ سون شاہ بخاری کا تعارف اچھا لگا۔ ساحل قادری سے بھی ملاقات اچھی رہی اسرارِ غیب لاجواب تحریر تھی وظیفے کرنا اتنے آسان نہیں۔ پیر شاہ محمد قادری کی سلسلے وار عامل کامل اچھی جا رہی ہے۔ ارے واہ ملازم حسین شیرازی بلائے جان اچھی تحریر لائے۔ ارم ناز کے قلم سے کالا جادو حقیقت محسوس ہوئی۔ صوابی سے کوثر اسلام کی آمد بھی کیو ریسٹورنٹ کے ساتھ عمدہ رہی۔ فیصل مشتاق بھی بھیانک روحیں کے ساتھ ڈرانے موجود تھے۔ حسن نظامی بھی عمدہ تحریر لائے سچ بولا کسی کو برباد کرنے والے آباد نہیں ہوا کرتے۔ پُراسرار نمبر کی باقی تحریریں بھی اپنی مثال آپ تھیں۔ شوبز پیج پر مایا علی اداکارہ کے نکاح کا پڑھ کر خوشی ہوئی۔ فیصل مشتاق آپ کی فیورٹ ایکٹر صبا قمر کی اونچی اڑان چلیں آپ کو ہی مبارکباد اب ہالی وڈ میں اُن کی اداکاری دیکھیے گا۔ باقی سلسلے بھی اچھے تھے

اس بار خطوط میں پرنس افضل کی کمی محسوس ہوئی وہ پُرمزاج لکھتے ہیں باقی بھی لوٹ آئیں یہاں ثناء اللہ ظہیر کی نعت بھی عمدہ تھی اب دیں اجازت۔

بھائی محسن! آپ کو یہ کیوں کہنا پڑا کہ آئی ڈی کی تصدیق کرلیں کون انٹیلی جنس افسر ہماری صفوں میں آ گیا ہے مجھے ضرور بتائے گا کیونکہ ایسے فارغ لوگوں سے میں سچی کہانیاں کو محفوظ رکھنا چاہتی ہوں۔ کہانی مل گئی ہے جلد آگاہ کروں گا۔

☆عامر شہزاد ننکانہ صاحب سے لکھتے ہیں۔ پیاری آپی جان ایڈیٹرز اسٹاف' رائٹرز' شعراء اور معزز قارئین السلام علیکم! یقین کامل ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے سب خیریت سے ہوں گے نومبر کا شمارہ بطور اعزازی کاپی بر وقت ارسال کرنے پر ادارہ کا شکریہ' تبدیلی کا نعرہ پورے ملک میں پھیلا ہوا ہے مگر تمام سہولیات کی موجودگی کے باوجود سرکاری اسپتالوں میں مریض تڑپ تڑپ کر لقمہ اجل بن رہے ہیں حکومت کی مخلصانہ کوششوں کے باوجود سرکاری اسکولز کا کوئی حال نہیں ہمارے بزرگ پنشن کے حصول کے لیے پورا پورا دن بینکوں کے سامنے قطاروں میں کھڑے نظر آتے ہیں بلند و بالا دعوؤں کے باوجود رشوت اپنے عروج پر ہے۔ معذور افراد کے لیے کوئی واضح اقدامات نظر نہیں آرہے اخلاقی اقدار تباہی کے دہانے پر پہنچ چکی ہیں بے حیائی اور فحاشی عام ہو رہی ہے ان حالات کی وجہ سے دل قدرے غمگین ہے اللہ سے دعا ہے کہ ہمارے ملک کے حالات بہتر ہو جائیں اور یہ واقعی مدینہ کی ریاست کی مثل بن جائے' اب شمارے کی طرف آتا ہوں سرورق انتہائی خوبصورت اور شاندار ہے پُراسرار نمبر کے لحاظ سے مکمل اور جاندار ہے کسی قسم کی کوئی خامی نظر نہیں آئی عمدہ اور بہترین شمارہ آپی جان کی محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ آپی جان آپ کا کالم ہمیشہ کی طرح بہت عمدہ ہے میں آپ کی باتوں سے پوری طرح متفق ہوں واقعی حکمرانوں کو زبانی باتوں کی بجائے عملی کام کرنے چاہیے۔ خطوط پڑھ کر دلی خوشی ہوئی کہ سب تبصرہ نگار بہت محنت اور لگن سے لکھ رہے ہیں جن کا مقصد صرف رسالے کو خوب سے خوب بنانا ہے ثناء اللہ ظہیر کی نعت پڑھ کر دل خوش ہو گیا کیا ہی بات ہے اگر ہمیشہ نعت اور حمد سے رسالے کا آغاز کیا جائے۔ نازیہ بتول صاحبہ اچھی رائٹر ہیں ان کی کہانیاں ضرور شائع ہونی چاہیے۔ ایم حسن نظامی آپ کی پختہ سوچ اور انداز بیان منفرد اور اعلیٰ ہے۔ طارق محمود صاحب یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ خدمت انسانی کے جذبہ سے سرشار ہیں اور آپ کی رائٹرز کے لیے محبت سراہنے لائق ہے۔ راکی ولسن آپ کو رسالے میں موسٹ ویلکم' عابدہ مغل صاحبہ آپ نے جن معاشرتی برائیوں کا ذکر کیا ہمیں ان سے اجتناب کرنا چاہیے۔ ایم یعقوب' ارشد اقبال' غلام مرتضیٰ علوی' حمیرا وحید' رفعت خان' فوزیہ اختر' نفیسہ فضل' ایم اے خالق' ملازم حسین شیرازی' ہاجرہ عمران' ریحانہ اعجاز' اروشہ خان' ثریا کنول' نظر علی برمانی' محسن علی طاب' سور شاہد قمر' مومنہ بتول' میرے دوست فیصل ندیم اور ابو ہریرہ نے بہترین تبصرے لکھے میری طرف سے اس ماہ کے ونرز افتخار چوہدری' فرزانہ نگہت' مجید احمد اور محسن علی کو مبارکباد قبول ہو یقیناً آپ عظیم رائٹر ہیں۔ نمبر کے حوالے سے تمام کہانیاں شاندار ہیں فوزیہ فرید کی نیک جنات سے ثابت ہوتا ہے کہ اچھے جنات کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے محمد حنیف شاکر نے بہترین ڈراؤنی کہانی میں شہر لاہور کی تاریخ بیان کر کے منفرد اسلوب بیان اختیار کیا نیز آپ کو عمرہ پر جانے پر میری طرف سے سلام اور مبارکباد' نفیسہ فضل نے بھی عمدہ کہانی لکھی اب بھلا بچے کو کیا معلوم تھا کہ جس بلی کے بچے کو وہ مار رہا ہے آخر وہ کون ہے؟ ام ایمان نے حضرت اسلم حبشیؓ پر لکھ کر دل خوش کر دیا۔ فیصل مشتاق کی بھیانک روحیں' مجھے سب سے اچھی لگیں۔ تیسری جابی' نیل گری' لاجونتی' آج کا شاعر' اسرار غیب' وہ سرد رات' بلائے جان' کالا جادو' کیو ریسٹورنٹ' آسیبی درخت' کوئی تھا جنگل' سرد رات اور انسانی ڈھانچے جنات کی معافی' موت کا پنجہ' وہ لوٹ آیا' وبال جان' بانسری بہترین ڈراؤنی اور عمدہ کہانیاں لگیں سلسلہ وار کہانیاں بھی ٹھیک چل رہی ہیں انعامی سلسلہ اور مسئلہ یہ ہے بھی لاجواب' شعر و سخن میں اجمل سراج' خضر حیات' نفیسہ فضل' سمعیہ نسیم' محمد حنیف شاکر' فریدہ فری' فیصل مشتاق' ایم حسن نظامی' رفعت خان اور شاہد حسین نے بہترین شاعری تخلیق کی۔ مشہور شیف طاہر چوہدری کی وفات کا سن کر دلی دکھ ہوا میری تحاریر پسند کرنے والے تمام معزز رائٹرز صاحبان کا تہہ دل سے تھینکس' خالد عباس' نیناں خان' محترم پرویز احمد دولو' شاکر صاحب' تحسین جونیجو' حافظہ موّن شاہ اور فریدہ آپی کے خطوط کو بہت مس کیا۔ حافظہ سیدہ موّن شاہ بخاری صاحبہ یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ کو میرے مرشد پاک حضرت

عمر فاروقؓ سے خاص عقیدت ہے براہ مہربانی مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھا کریں آپی منزہ صاحبہ آپ سے میری ادب سے گزارش ہے کہ پلیز کسی ریگولر سلسلے کو مس نہ کیا کریں کیونکہ ہر شخص کا شوق و ذوق الگ ہوتا ہے اس لیے کسی کے فیورٹ سلسلے کو اچانک مس کر کے اسے افسردہ کرنا مناسب نہیں' نیز میری تین کہانیاں بھیانک انتقام جدائی اور حاجی میاں آپ کے پاس موجود ہیں اگر اشاعت کے قابل نہ ہو تو مجھے ضرور آگاہ کر دیجیے گا اللہ تعالیٰ آپ کو لمبی عمر اور تندرستی عطا فرمائے تاکہ آپ ہمارے لیے ہمیشہ پرفیکٹ شمارے شائع کرتی رہیں۔

✿ بھائی عامر! آپ کی خواہش کا احترام ضرور کیا جائے گا اور آئندہ کوئی سلسلہ مس نہیں کریں گے اصل میں اس بار پُراسرار کہانیاں اس قدر زیادہ تھیں کہ مجھے ڈر تھا کہ پُراسرار نمبر2 اور 3 کے بعد بھی بہت سارے لوگ رہ جائیں گے' بس اسی لیے' میں امید کرتی ہوں کہ سچی کہانیاں کی ترقی اور مقبولیت میں آپ اپنا حصہ ڈالتے رہیں گے اور خوب سے خوب تر لکھ کر ہمیں ارسال کریں گے۔

☆ ملازم حسین شیرازی بھکر سے لکھتے ہیں۔ محترمہ بہن منزہ سہام سلامت رہیں۔ سچی کہانیاں نے اب تک لاتعداد پُراسرار نمبر شائع کیے لیکن تازہ شمارہ نومبر 2018ء سب پر بازی لے گیا۔ بلاشبہ لاجواب بے مثال لاثانی کہا جا سکتا ہے مبارک قبول فرمائیں۔ سب سے پہلی گزارش کہ میرا شائع شدہ قصہ بالائے جان بک بائینڈر یا کمپوزر نے اُلٹ پلٹ دیا۔ صفحات آگے پیچھے کر دیے۔ اب قاری سینس کی حالت میں کیوں پڑھے گا کہ ٹیمپو ٹوٹ گیا۔ اب صحیح کیسے ہو سکتی ہے؟ دوسری گزارش جہاں میں رہتا ہوں کچھ فاصلے پر وزیرستان ہے جہاں دہشت گردی کی پناہ گاہیں اور مراکز ہیں (اب تو پاک آرمی کی وجہ سے حالات نارمل ہیں) کچھ دوستوں نے اصرار کیا ہے کہ میں لکھوں کہ دہشت گردی کیوں ہوتی ہے؟ کیا مقاصد' وجوہات ہیں۔ ان کے عوامل اور محرکات کیا ہیں؟ کیوں معصوم بچے آمادہ و راغب ہوتے ہیں؟ ان کی برین واشنگ' ٹریننگ کیسے کی جاتی ہے۔ کیوں والدین اپنے پیاروں کو جہنم کی آگ میں دھکیلتے ہیں۔ ان کے ماسٹر مائنڈ سہولت کار کون ہیں؟ میرے خیال میں اس کی آگاہی سب کو ہونی چاہیے کچھ عرصہ پہلے مذکورہ بالا امور در پیش ہوئے۔ ایک قصہ کی صورت میں اس کی نشاندہی کی گئی ہے یہ ایک معلومات' سچا' حقیقت پر مبنی واقعہ ہے جو قارئین کے لیے عبرت اور سبق ہو گا۔ مہربانی فرما کر اگر شرف قبولیت ہو تو دسمبر کے شمارے میں اسے شائع کریں۔ میں احسان مند ہوں گا (موت کے سوداگر کے نام سے خط مذکورہ کے ساتھ ارسال ہے) تازہ شمارے کے سرورق پر ہیبت ناک چہرہ دیکھ کر چیخیں نکل گئیں واقعی ڈر خوف اور اسراریت سے پُر ہے۔ اداریہ' صحیح فرمایا آپ نے اگر ریلوے کراسنگ پر پھاٹکیں لگ جائیں تو آئے روز حادثوں کے جاں گسل صدمات نہ سہنے پڑیں گے۔ تبدیلی کے پیش نظر پھاٹک کی کیا بساط غلام بنے سردار ام ایمان ایک حبشی چرواہا جب حضور پاک ﷺ کے دامنِ محبت اور عافیت میں پناہ لی۔ اور شہادت کے رتبے پر فائز ہوئے تو جنت کی حوریں رشک کر رہی تھیں کتنی بڑی سعادت...... تیسری چابی ثمینہ مشتاق ڈر خوف اور وحشت سے بھرپور تحریر خوب لکھا۔ نیل گری' افتخار چوہدری جو دوسروں کے لیے برا سوچتے ہیں برا کرتے ہیں خود ہی تباہی اور بربادی کے گڑھے میں جا گرتے ہیں۔ برائی کا انجام برا عمدہ تحریر' لاجونتی' جاوید راہی محبت صرف انسانوں میں نہیں جانوروں اور جنات میں بھی پائی جاتی ہے۔ غیر مرئی مخلوق اس سے مستثنیٰ نہیں۔ تعارف حافظہ سیدہ مون آپ کے مذہبی رجحانات' زریں خیالات قابل صد تحسین ہیں۔ اسرار غیب حنا بشریٰ استاد کی رہنمائی کے بغیر کوئی عمل احسن طریقے سے پایہ تکمیل نہیں ہوتا۔ عملیات وضائف و چلے کم علمی اور مرشد کی ہدایت کے بغیر نفع کے بجائے نقصان کا پیش خیمہ بنتے ہیں بہترین تحرین۔ وہ سرورات' ڈاکٹر جویریہ ندا چھوٹی کہانی ماشاء اللہ' عامل کامل پیر شاہ محمد قادری ایک مردِ مومن کی شیطانی اور طاغوتی قوتوں سے ٹکر آسیبی نیم کا درخت' عثمان غنی گھنا' گھاٹا' گنجان نیم اور بوہڑ کا درخت اکثر جنات کا مسکن ہوتا ہے اس کی چھاؤں میں بیٹھنے سے اجتناب کرنا چاہیے تحریر عمدہ' کوئی تھا جنگل قاسم بلوچ کسی مخلوق کو چاہیے وہ جنات ہو ماورتی کیوں نہ ہوں تنگ نہیں کرنا چاہیے ایک مظلوم جن کیسے انسانوں کا قاتل بنا دلچسپ تحریر' بھیانک روحیں فیصل مشتاق' وہ موت کا مقابلہ کرنا چاہتے تھے لیکن شیطانی روحوں نے انہیں اپنے حصار میں بند کر دیا بابرکت تعویذ کے حصار نے انہیں بچا لیا معذوری قائم' جنات کی معافی حسن نظامی ایک عبرت ناک سبق آموز کہانی لالچ حرص ہوس کے حامل ہمیشہ برباد رہتے ہیں۔ انسان عبرت کا نشان بن جاتا ہے عمدہ تحریر' موت

کا پنچھ حمیرا و حید جنات اور آسیبی مخلوق کا یقین نہ رکھنے والے قرآن پاک کے منکر ہوتے ہیں ان سے انکار عقیدہ کی کمزوری ہے نہایت عمدہ التماس پاکستان شوبز شعر و سخن خوب رہے۔ احوال نامے میں یعقوب احمدانی آپ کا خط عاجزی انکساری کا مرکب ہے معذرتوں نیک تمناؤں اور دعاؤں کی طلب سے بھرپور ماشاء اللہ نازیہ بتول تہذیب کے دائرے میں رہتے ہوئے شکوے شکایات کرتے ہوئے اپنی بات منوانا ادبی شان ہے۔ ماشاء اللہ ارشد اقبال چوہان اگر کوئی کم ظرف فون بھی کرے تو درگزر سے کام لیں یہ آپ کے فرائض منصبی کا تقاضا ہے۔

جو اعلیٰ ظرف ہوتے ہیں ہمیشہ جھک کے ملے ہیں
صراحی سرنگوں ہوکر بھرا کرتی ہے پیمانہ

ایم حسن نظامی ہمیشہ کی طرح آپ کا خط پر مغز اور لاجواب السلام علیکم نفیسہ فضل محمود خوبصورت تحریروں سے مزین دو خطوط غزلیں اشعار کہانی لاجواب آپ تو محفل میں چھا گئیں آداب ڈاکٹر طارق محمود آپ کی شرکت پر ویلکم ایم اے خالق بھٹی آپ کی تحریر نے بہت لطف دیا سلامت رہیں نظر علی برمانی آپ کا خط بامعنی با مقصد ہوتا ہے میں نے گزشتہ شمارے میں خط مختصر نہیں لکھا تھا شاید پیاری بہن منزہ سہام کو خط کی طوالت پسند نہ آئی مختصر کر کے تھوڑا دکھی کر دیا سلام قبول ہو عابدہ مغل سچی کہانیاں سے آپ کی محبت لگن کی جتنی قدر کی جائے کم ہے۔ محسن علی طاب بہترین خط لکھنے پر مبارکباد ہو۔ مور شاہد حسین سب لکھاریوں تبصرہ نگاروں قارئین کو اپنی دعاؤں سلام میں یاد کرنا باعث افتخار ہے سلام قبول فرمائیں۔ فیصل ندیم بھٹی آپ کے خط کی تعریف میں الفاظ کا چناؤ کہاں سے لائیں سلام عرض ہے باقی خطوط بھی عمدہ تحریر کیے گئے افسوس کہ خط کی طوالت کے پیش نظر تبصرہ نہ کر سکا پیاری بہن منزہ سہام صاحبہ انہی گزارشات کے ساتھ اجازت کا طلب گار ہوں ہمیشہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ خوش و خرم اور سلامت رہیں۔ آپ میرے استاد محترم کی لخت جگر ہیں آپ کی عزت تکریم فرض ہے۔

☆ شیرازی بھائی! بالکل آپ کی کہانی کے صفحات آگے پیچھے ہو گئے۔ اس غلطی پر میں شرمندہ ہوں۔ شمارہ پسند آیا آپ کو میری محنت وصول ہو گئی اصل میں مجھے اپنے دونوں رسالوں دوشیزہ اور سچی کہانیاں سے عشق ہے اور میں ان کی ترقی کے لیے شب و روز محنت کرتی ہوں آپ جیسے اہل علم لوگوں کا ساتھ رہا تو یہ دونوں رسالے خوب پھلیں گے اور پھولیں گے۔

☆ فریدہ فری لاہور سے لکھتی ہیں۔ السلام علیکم! پُراسرار نمبر سچی کہانیاں ملا مجھے جن بھوتوں کی کہانیاں پسند نہیں مگر جن کہانیوں نے متاثر کیا نفیسہ فضل کی کہانیاں متاثر کرتی ہیں انہیں بے حد سلام دعا ان کی کہانی اور پھرتی نے متاثر کیا نیک جنات فوزیہ فرید اسرار غیب حنا بشریف لاجونتی جاوید راہی سرد رات فرح انیس ایم حسن نظامی بھائی کو بے حد سلام دعا اور تمام رائٹر کو سلام دعا پرنس بھائی کو بے حد سلام و دعا آج کل کیوں غیر حاضر ہیں میرا تعارف کے لیے انتظار تھا مگر تبصرہ نہیں کیا۔ بھائی ڈاکٹر محمود آپ کو تعارف مختصر لگا میری شاعری جو شائع نہیں ہوئی تھی میں نے ایک غزل اور نظم بھی بھیجی تھی وہ لگی ہی نہیں۔

☆ فریدہ جی ہم نے اتنی محنت سے پُراسرار نمبر دیا اور آپ نے یہ کہہ کر دل ہی توڑ دیا کہ آپ کو جن اور بھوتوں کی کہانیاں پسند نہیں آپ کی غزل اور نظم دونوں شائع ہو جائیں گی۔

☆ ورده ڈسکہ سے لکھتی ہیں۔ السلام علیکم آپی منزہ صاحبہ مجھے شروع سے ہی پُراسرار خوفناک ڈراؤنی کہانیاں پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ بہت دفعہ کوشش کی کہ خود بھی کوئی ڈراؤنی کہانی لکھوں۔ مگر آج تک اس میں کامیاب نہیں ہو سکی میں جب چھوٹی سی تھی۔ تو اپنے دادا دادی سے اکثر اسی طرح کی کہانیوں کی فرمائش کیا کرتی تھی۔ مگر اب گھریلو زندگی میں اتنی زیادہ مصروفیات بڑھ گئی ہیں کہ اب تو کافی عرصہ ہوا بھی کوئی کہانی پڑھی ہی نہیں۔ کچھ دن پہلے بچوں کے لیے کتابیں لینے بک اسٹال پر گئی تو سچی کہانیاں کے پُراسرار نمبر پر نظر پڑی تو فوراً خرید لیا۔ جب تک گھر نہیں پہنچی عجیب سی بے چینی لگی رہی۔ آپ یقین کیجیے میں ماضی کے بند دریچوں میں پہنچ چکی تھی گھر واپس آئی تو بچوں کے اسکول آنے سے پہلے پہلے دو کہانیاں پڑھ بھی چکی تھی۔ سب سے پہلے میں نے ڈائجسٹ میں موجود پہلی کہانی تیسری چابی پڑھنا چاہی مگر اُس پر لکھا تعارات میں مت پڑھیے گا۔ تو میں نے سوچا لگتا ہے یہ کہانی واقعی بہت خوفناک ہوگی۔ پھر میں نے سوچا اس کو میں رات کو ہی پڑھوں گی۔ تو میں نے ڈائجسٹ میں شامل آخری کہانی نیک جنات سب سے پہلے پڑھی۔ اُس کے بعد ڈاکٹر طارق کی کہانی وبال جان بانسری پڑھی۔ بلاشبہ ڈاکٹر

طارق کی کہانی سب سے زبردست لگی۔ اس کے علاوہ مجھے حمیرا وحید اور ارم ناز کی کہانیاں بھی پسند آئیں احوال میں شامل خطوط کی تعداد دیکھ کر لگتا ہے منزہ باجی واقعی ہی تمام خطوط کو پڑھتی ہیں اور اُن کو شامل کرتی ہیں تو میں نے سوچا مجھے بھی اس محفل میں شامل ہونا چاہیے۔ قلم پکڑا اور فوراً خط لکھ دیا۔ اگر حوصلہ افزائی ہوئی تو آئندہ بھی خط کے ساتھ ساتھ کہانی میں لکھنا شروع کروں گی۔ مجھے سچی کہانیاں کے اگلے شمارے کا شدت سے انتظار رہے گا۔

ورده! سب سے پہلے تو ویلکم! تم نے اتنی محبت سے خط لکھا کیسے ممکن تھا کہ شائع نہ ہوتا۔ میں امید کرتی ہوں کہ تم اب پابندی سے احوال میں شرکت کیا کرو گی۔

☆ پرنس افضل شاہین بہاولنگر سے لکھتے ہیں۔ اس بار نومبر کا سچی کہانیاں پُر اسرار نمبر وقت پر ہی یعنی پانچ نومبر کو مل گیا اور سات نومبر کو تبصرہ ارسال کر رہا ہوں سرورق دیکھ کر یہ قطعہ ہونٹوں پر مچلنے لگا۔

ڈھونڈتے کیا ہو ان آنکھوں میں کہانی میری
خود میں گم رہنا تو عادت ہے پرانی میری
بھیڑ میں بھی تمہیں مل جاؤں گا آسانی سے
کھویا کھویا ہوا رہنا ہے نشانی میری

آپ کا اداریہ اس میں درست کہا گیا ہے کہ ریلوے پھاٹکوں کو ضرور لگایئے کیونکہ اپنے پیاروں کی لاشوں کو دور تک پٹریوں سے سمیٹنا بہت ہی زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے پاکستان بھر کے ریلوے کراسنگ پر یہ پھاٹک ضرور لگنے چاہیے کیونکہ انسانی زندگی بہت ہی زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عالیہ شمیم کی ساس صاحبہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے آمین اب بڑھتے ہیں احوال کی طرف' ایم یعقوب آپ نے منزہ سہام کو بہت ہی خوبصورت انداز میں خراج تحسین پیش کیا ہے ناز یہ بتول آپ کی تو کیا کسی کی بھی کہانی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے ارشد اقبال آپ نے کہانیوں پر خوبصورت انداز میں تبصرہ کیا ہے ویلڈن بھیا' ایم حسن نظامی آپ نے مجھے کرسی صدارت پر براجمان پا کر خوشی محسوس کی بہت شکریہ غلام مرتضیٰ علوی اللہ تعالیٰ آپ کے دونوں ماموں جانوں کو صحت عطا فرمائے آمین میرے بہت ہی پیارے بھائی ڈاکٹر طارق محمود آ کاش میری آواز پر سچی کہانیاں دوبارہ جوائن کرنے کا شکریہ میں بھی ہم دونوں کی آپی فریدہ جاوید فری کی صحت یابی کی دعا کرتا ہوں۔ آپ کی بھابی بھی اپنی نند فری کی صحت کے لیے دعا ضرور کرتی ہیں۔ ہمیں بھی فری آپی کا تعارف مختصر ہونے کی وجہ سے زیادہ پسند نہیں آیا۔ فری آپی' جلد از جلد اپنے طویل تعارف کے ساتھ سچی کہانیاں کی طرف آئیں ہم منتظر ہیں۔ راکی ولسن' آپ کا سلام مجھ تک پہنچ گیا آپ کو بھی میری طرف سے السلام علیکم' منزہ آپی آپ سے گزارش ہے کہ مستقل سلسلے ضرور شائع فرمایا کریں اس بار ڈائری غائب تھی ایم اے خالق بھٹی دیکھ لیں سچی کہانیاں سے ہمارا عشق ملازم حسین شیرازی میرا خط پسند فرمانے کا شکریہ آپی کی قینچی آرام کر رہی ہے وہ بھی عابد بھائی کی مصروفیت کی وجہ سے' حاجرہ عمران یہ واقعی غلط بات ہے کہ ایک ہی کہانی وہ بھی صرف ایک مہینے کے وقفے سے دو الگ الگ رسالوں میں نہیں بھیجی چاہیے۔ ارو شمہ خان عروش' میرا خط پسند فرمانے کا شکریہ عابدہ مغل آپ نے درت کہا کہ احوال کو احوال ہی رہنے دو چوپال نہ بناؤ۔ میں بھی آپ کی بات کی تائید کرتا ہوں۔ محسن علی طاب' واقعی ریشم ایک خوبصورت رسالہ تھا اسے بند نہیں ہونا چاہیے تھا آپ کا اور مور شاہد حسین کا شکریہ کی میرا خط پسند فرمایا۔ فیصل ندیم بھٹی مجھے کرسی صدارت کی مبارکباد دینے کا شکریہ' آپی میرا اگست کا لکھا ہوا خط اکتوبر میں شائع ہوا جبکہ جو خط میں نے تیرہ ستمبر کو لکھا وہ نہ اکتوبر میں اور نہ ہی نومبر میں شائع ہوا اور نہ ہی آپ نے اس ماہ تاخیر سے ملنے والے خطوط میں اس کا ذکر فرمایا۔ ڈاکٹر طارق محمود آ کاش کی وبال جان بانسری' حمیرا وحید کی موت کا پنجہ' ارم ناز کی کالا جادو' بہترین کہانیاں تھیں۔

بھائی شاہین آپ کے جو خط مجھے ملے وہ میں نے شائع کیے جیسے یہ والا' میں وقت پر آنے والا کوئی خط احوال میں شامل کرنے سے نہیں چوکتی اطمینان رکھیں کچھ لکھاریوں کی اس حرکت سے میں بھی بہت نالاں ہوں کہ مختلف رسالوں میں ایک ہی تحریر ارسال کرتے ہیں۔ مشہور ہونے کی یہ ذہنی بیماری ہمارے معاشرے میں کافی طول پکڑ چکی ہے۔ بس ایک بار موقع دوں گی اس کے بعد ایسے تمام لکھاری مستقل بین کر دیے جائیں گے۔

☆مہر پرویز احمد دولتو میاں چنوں سے لکھتے ہیں۔ سلام مسنون' سرورق واقعی خوفناک تھا بے نور پتھر کی آنکھ لگ رہی تھی۔ ادارے پر انتہائی معذرت کے ساتھ کہ ریلوے پھاٹک بنانے پر افتتاح کی تختی نہیں لگائی جاتی اور ہم سملمان تو مکہ اور مدینہ عمرہ کے فرائض پر کم فیس بک پر تصاویر بھیجنے پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ ہم تو میلاد اس لیے مناتے ہیں کہ نعت خوانوں اور عالم صاحب پر نوٹ برسانے کی مووی بنتی ہے اور اشتہار پر سنہری حرف میں خصوصی تعاون والوں میں نام لکھواتے ہیں۔ جو پورا سال مشہوری کا باعث بنتا ہے امیروں نے پھاٹکوں سے گزرنا نہیں اور غریب تو اس ملک میں کیڑوں مکوڑوں کی مانند ہیں محترم ملازم حسین شیرازی کا ممنون ہوں جنہوں نے یاد فرمایا' حضرت اسلم حبشی لمحوں میں جنت کے مکین بن گئے۔ فضا کے بعد فواد اور فضل میں تیسری چابی کا شکار ہوگئے۔ نیل گری میں عظمیٰ کو کرنی کی بھرنی پڑی جبکہ صفدر ماں باپ اور بہن کو خوشیوں کے ہلکورے میں جھلانے لگا۔ جاوید راہی کمال تحریر لائے ظالم لاجونتی انتہا کی نمک پلید نکلی۔ حنا بشریٰ کی کتاب تو خانہ خراب کرنے پر تلی تھی اور پھر چارپائی تک محدود کر کے ہمیشہ کے لیے ناکارہ کر دیا جو یہ ندا قدرت کو بھی ماتحت سمجھنے والے متکبر نوجوانوں کی عبرت ناک موت پر سبق آموز تحریر لائیں۔ پیر شاہ محمد قادری کمال کی تحریر صفحات پر بکھیر رہے ہیں۔ گلنار کی ہوس بھری زندگی غلاظت کا ڈھیر ہے۔ جان بچی سو لاکھوں پائے آج کے دور میں وفا کہاں ملازم حسین شیرازی کسی کے اعتماد کی کرچیاں چن رہے تھے۔ اُف کالا جادو سچی کہانیاں کا مان ارم ناز مسز نزہت کی آپ بیتی بیٹی اور خاوند کی حرص پر روشنی ڈال رہی تھی۔ کوثر اسلام کا کیور یسٹورنٹ موت کا محل ثابت ہوا۔ بیٹے کی جدائی نے زیبا کو پاگل کر دیا۔ نیم کا درخت چھاؤں کم موت زیادہ بکھیر رہا تھا۔ اللہ دی قسمے مرید والا اور لنڈ دیل کے درمیان کسی قسم کا کوئی جنگل نہیں فرح انیس کی شازمہ اور اس کا خاوند بیتا روح سے دوستی کرتے رہے۔ فیصل مشتاق' ایم حسن نظامی' نفیسہ فضل' ماہ وش انگریز بچے کے انتقام پر مبنی تحریر لائیں۔ جناب حسن نظامی صاحب نے درست فرمایا ادب کی توہین نہیں کرنی چاہیے اب کچھ دیگر رسالوں کی شائع پُراسرار تحریریں سچی کہانیاں میں شائع کروا رہے ہیں ان کو تو انعام ملنا چاہیے اس ماہ چڑیلو کا مسکن ڈر کراچی میں شائع ہو چکی ہے لیکن جھوٹا میں ہوں کیونکہ نشاندہی کرتا ہوں۔

◆ پرویز بھائی امید کرتی ہوں کہ حنیف بھائی اس سلسلے میں وضاحت ضرور دیں گے۔ اور آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ آپ جھوٹے ہیں غلط عمل کی نشاندہی ہم سب کا فرض ہے آپ اپنا کام کرتے رہیے اچھے اور سچے لوگ معاشرے سے کم ہوتے جا رہے ہیں مگر یہ بھی سچ ہے کہ سچا انسان پورے طمطراق کے ساتھ گزارہ جاتا ہے۔

☆فیصل مشتاق قبولہ شریف سے لکھتے ہیں۔ السلام علیکم! سچی کہانیاں سے جڑے تمام قارئین کو محبتوں بھرا ٹائٹل لیے ہاتھوں میں آیا مجھے سچی کہانیاں بذریعہ ڈاک آج ہی موصول ہوا۔ مگر اس سے قبل میں دکاندار سے پرچہ خرید کر پڑھ چکا تھا۔ مجھے پُراسرار نمبر کا بہت انتظار تھا اس لیے میں نے دکاندار سے پرچہ خرید لیا۔ میں نے اپنا ایڈریس بھی ٹھیک کروا دیا تھا براہ کرم آپی جلدی بھیج دیا کریں تاکہ میں جلدی پڑھ کر تبصرہ میں شرکت کر سکوں۔ اس مرتبہ پُراسرار شمارے میں 20 پُراسرار کہانیاں شامل تھیں جس میں میری کہانی بھیانک روحیں بھی شامل اشاعت تھی۔ میرا نام تو درست لکھا گیا مگر تشہیر کے نام صحیح نہیں لکھا گیا۔ میں فیصل مشتاق قبولہ شریف سے تعلق رکھتا ہوں۔ جبکہ فیصل ندیم بھٹی سرگودھا سے تعلق رکھتے ہیں اور مجھ سے سینئر ہیں۔ براہ کرم ہمارے ناموں کو اور شہروں کے ناموں کو درست کر لیں تاکہ ٹائپ رائٹر سے آئندہ غلطی نہ ہو۔ پچھلی مرتبہ بھی یہی غلطی ہوگئی تھی۔ پیاری آپی! یہ سب کچھ میں تبصرے میں اس لیے لکھ رہا ہوں کیونکہ آپ نے کہا آپ کو احوالیوں کی کھٹی میٹھی شکایتیں اچھی لگتی ہیں۔ ہاہاہا...... خیر اب تبصرے کی جانب بڑھتے ہیں۔ پُراسرار نمبر کا انتظار مجھے بہت دنوں سے تھا دراصل مجھے ذاتی طور پر بچپن سے خوفناک اور پُراسرار کہانیاں پڑھنے کا شوق ہے۔ سب سے پہلے تیسری چابی شامل اشاعت تھی اس لیے وہ ہی پڑھی میرے خیال سے ثمینہ آپی کی یہ کہانی پورے پُراسرار نمبر کی بہترین کہانی تھی جو مجھے بے حد پسند آئی بہترین خوفناک پلاٹ' زبردست سسپنس اور ڈائیلاگ خاص کر موت کبھی نہیں مرتی۔ وہ سب کو یہاں لے کر آتی ہے۔ اس ڈائیلاگ اور کہانی نے میرا دل جیت لیا۔ ثمینہ مشتاق آپی آپ کی یہ کہانی ہمیشہ میرے ذہن میں رہے گی' کمال کر دیا۔ اس کے بعد دوسری سپرہٹ کہانی کوئی تھا جنگل میں رہی۔ محمد قاسم خان بہت اچھے لکھاری ہیں میں عرصہ دراز سے ان کا فین ہوں اس مرتبہ بھی ان کی کہانی نے میرا دل جیت لیا بہت خوب' اس کے بعد حسن نظامی کی کہانی جنات کی معافی' بھی زبردست تحریر اور ایک سچا واقعہ تھی۔ تیسری سپرہٹ کہانی میں عثمان غنی کی آسیبی درخت

رہی یہ تین کہانیاں ایسی سپرہٹ کہانیاں ہیں جو مجھے کبھی نہیں بھولیں گی اور یہی کچی کہانیاں کے پُراسرار نمبر میں پُراسراریت پیدا کرنے میں کامیاب رہیں۔ دیگر کہانیاں بھی اپنی نوعیت کی زبردست اور خوفناک کہانیاں رہیں۔ جن میں حنا بشریٰ کی اسرارِ غیب حنا آپی' ویل ڈن خوفناک منظر نگاری بہت پسند آئی۔ اس کے بعد ارم ناز کالا جادو بہترین رہی۔ کوثر اسلام کی کیور یسٹورنٹ بھی عمدہ رہی۔ باقی تمام کہانیوں نے بھی خوب خوف پیدا کیا جن میں موت کا پنجہ سردرات اور انسانی ڈھانچے فرح انیس' نیل گری' لاجونتی جاوید راہی' وہ سردرات اور ڈاکٹر طارق کی وبال جان بانسری شامل ہیں۔ چونکہ مجھے پُراسرار نمبر بے حد پسند ہے تو میں نے کوئی کہانی نہیں چھوڑی ایک ایک کہانی کو گہرائی سے پڑھا ہے۔ فریدہ فری آپی کی غزلیں عمدہ اور لاجواب ہوتی ہیں اس کے علاوہ خضر حیات' ایم حسن نظامی' مور شاہد حسین کی غزلیں بہت عمدہ رہیں۔ پچھلے ماہ کے تبصروں میں بہت سارے لوگوں نے میری کہانی خواب زادی کو سراہا جن میں ایم حسن نظامی' ڈاکٹر طارق محمود آکاش' محسن طاب' راکی ولسن' فیصل ندیم بھٹی' ثمینہ مشتاق' یعقوب ہمدانی' ملازم حسین شیرازی' اردشہ خان' مور شاہد حسین شامل ہیں۔ میں ان سب کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں اس مرتبہ ڈاکٹر طارق محمود آکاش نے اپنی زبردست اور دھماکے دار انٹری دے کر سب کو حیران کر دیا۔ جس پر مجھے بے انتہا خوشی ہوئی۔ ڈاکٹر طارق محمود آکاش میرے لیے میرے بڑے بھائی ہیں۔ میں ان کی کہانیوں کا تو فین رہا ہی ہوں مگر ان کی ذاتی شخصیت مجھے بہت پسند ہے اس بار ان کی انٹری دیکھ کر پرانے دن یاد آگئے۔ جب میرے استاد محترم ایم حسن نظامی' ڈاکٹر طارق محمود آکاش' محمد قاسم خان بلوچ' مقصود احمد بلوچ' محسن طاب' ہم سب ریشم ڈائجسٹ میں ایک فیملی کی طرح ہوتے تھے۔ یہ تمام لوگ میرے لیے بہت قابل احترام ہیں۔ میں ان کی بہت عزت کرتا ہوں' میرے استاد حسن نظامی جنہوں نے مجھے قدم قدم پر سپورٹ کیا۔ میرے بھائی محسن طاب اور ڈاکٹر طارق آکاش جنہوں نے ہمیشہ بڑا بھائی بن کر میرا ساتھ دیا۔ پیارے دوستو میں دعا کرتا ہوں ہمیشہ میرے ساتھ رہو اور خوش رہو آمین لکھتے لکھتے میری آنکھوں میں پانی آگیا ہے۔ اس ماہ میں نے تو بھرپور تبصرہ دیا دیکھتے ہیں مزید دوست کیسا تبصرہ کرتے ہیں۔

☆ فیصل بھائی کمپوزر صاحب کو پتہ نہیں کیا محبت ہے سرگودھا سے کہ وہ آپ کے نام کے ساتھ سرگودھا ٹائپ کر دیتے ہیں چلیں آئندہ میں خصوصی توجہ دوں گی شمارہ پسند کرنے کا شکریہ۔

☆ حافظہ مون شاہ سرگودھا سے لکھتی ہیں۔ پیاری آپی منزہ سہام السلام علیکم! تمام حمد و ثنا اللہ کے لیے جس کی عظمت کے سامنے بادشاہوں کے سر خم ہیں اور مخلوقات سجدہ ریز ہیں۔ کروڑوں درود حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر جو محسن انسانیت ہیں سلام اُن کی آل و اصحابؓ پر جن سے مودت کا حکم اللہ پاک نے دیا ہے۔ شکریے کی بھاری بھرکم ٹوکری اٹھائے رونق احوال بننے کے لیے حاضر ہوں۔ شکریہ نوازش' مہربانی' کرم پیاری آپی آپ جس طرح محبت سے میرے بے ربط جملوں کو قابل توجہ گردانتی ہیں۔ آپ کی اس توجہ سے یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ سیدہ مون شاہ بھی کوئی اہمیت رکھتی ہے۔ اُس کا لکھا مستند ہے تحاریر شائع کرنے کا بے حد شکریہ شب یلدا کا بے چینی سے انتظار ہے۔ قابل قدر راحوالیوں کا بھی فرداً فرداً شکریہ ادا کرتی ہوں جنہوں نے انٹرویو اور میرے خط کو پسندیدگی کی سند بخشی' حالانکہ میرے خط میں شب یلدا کے تعارف کے علاوہ کوئی قابل ذکر بات نہیں تھی۔ ایم اے خالق بھٹی صاحب منفی رویوں کے خلاف جنگ میں آپ سب قدم بہ قدم میرے ساتھ ہیں جان کر اچھا لگا جزاک اللہ' فیصل ندیم بھٹی' بھائی خدا آپ کی دعا قبول کرے اب آتے ہیں تبصرے کی طرف بس ایک پھاٹک پیاری آپی کا اداریہ زبردست غلام جو بنے سردار بہت خوب اللہ کرے زور قلم اور زیادہ' تیسری چابی نے متجسس کر دیا۔ پسند آئی نیل گری میں افتخار چوہدری نے بھائی کی بہن سے محبت کا ثبوت دیا بہت اچھے' لاجونتی نمبر ون رہی۔ ہماری جبیں پہ محبت لکھی ہے ساحل قادری صاحب کی شاعری جاندار ہے۔ حنا بشریٰ کی تحریر میں بہترین وظیفہ استغفار اور درود پاک ہے۔ یہ پیام حقیقت سے قریب تر ہے بے شک' وہ سردرات واقعتاً پُراسرار تھی۔ بلائے جان اور موت کا پنجہ میں جنات کے وجود کے متعلق قرآنی استدلال موجود ہے بالکل سچ کالا جادو نے ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ محمد حنیف شاکر اور کوثر اسلام صوابی نے بھی اچھا لکھا۔ محترم عثمان غنی برادر نیم کا درخت تو ہمارے صحن میں بھی ہے خیر یہ تو لطافت طبع کے طور پر کہا ہے ورنہ آسیبی نیم کا درخت خوب رہی۔ پُراسرار نمبر میں کچھ کہانیوں کے جملے ایسے تھے کہ جنہیں پڑھ کر بے ساختہ ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ جیسے کہ کوئی تھا جنگل میں کا جملہ مظلوم

اسماعیل جن کی ساری دکھ بھری داستان سن کر میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کو گلے لگایا وہ میرے گلے لگ کر بہت رویا۔ اور فیصل مشتاق نے بھیانک روحیں میں لکھا میرا اگلا نا سنو گے؟ ایک بھاری خوفناک آواز نے اُن کی سماعتوں پر بم پھوڑا۔ کہانیاں اچھی تھیں۔ وہ لوٹ آیا وبال جان بانسری' سرد رات اور انسانی ڈھانچے' جنات کی معافی' نیک جنات بھی اچھی رہیں۔ اور پھر تقی مر گیا بہت مختصر مگر مناسب لگی۔ سلسلہ وار کہانیاں بھی بہتر ہیں عامل کامل زیادہ اچھی ہے الغرض منزہ آپی کی محنت پُر اسرار نمبر میں نمایاں طور پر نظر آرہی ہے مبارکباد وصول کیجیے آپی میں نے ہر کہانی پر تبصرہ کرنا اس لیے ضروری سمجھا کہ رائٹرز بہت محنت سے کہانیاں تخلیق کرتے ہیں اور یقیناً تبصرے کے منتظر ہوتے ہیں لہٰذا کسی تحریر کو بھی نظر انداز کرنا اچھی بات نہیں ہے۔ آخر میں سب کو سلام و دعا اپنا خیال رکھیے گا۔

اچھی لڑکی! تم نے بہت اچھا کیا جو ہر کہانی پر تبصرہ کیا یہ تو رائٹر کا حق ہوتا ہے تمہاری تحریر کمپوزنگ کے مراحل میں ہے طویل ہے اس لیے کچھ وقت درکار ہوگا۔ میں تنہا کچھ بھی نہیں تم سب کا ساتھ ہمیشہ چاہیے ہوگا۔ اور مجھ سے بات کرنے کا سب سے آسان طریقہ ہے کہ مجھے میسج کر دیا کرو میں میسج کا فوری جواب دیتی ہوں اکثر اوقات کال ریسیو کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

☆ مریم شاہ بخاری سرگودھا سے لکھتی ہیں۔ پیاری آپی منزہ السلام علیکم! خدا تعالیٰ آپ کی زندگی کو خوشیوں' محبتوں اور مسرتوں سے بھر دے اور آپ کو ہر تکلیف سے محفوظ فرمائے آمین ثم آمین۔ ڈیئر آپی جی اکتوبر کا شمارہ ملا۔ ٹائٹل نہایت شاندار تھا اداریہ تو بے حد لاجواب' احوال کی محفل ہمیشہ کی طرح پُر رونق' اور جاندار رہی۔ اشتہارات کا بھی اپنا ہی جمال ہے' حافظہ مون شاہ کا تعارف بھی کمال ہے۔ ساحل قادری کی شاعری خوبصورت غلام جو بنے سردار بلاشبہ ایمان کی تازگی ہے اور باعث قرار' سچی کہانیاں پراسرار نمبر کی ہر تحریر یقیناً ہے خوف و دہشت کی وہ زنجیر جو جکڑ لیتی ہے ہر پڑھنے والے کے دل و روح کو' اور کر دیتی ہے ہر شے سے بے نیاز' ویسے آپی جی ہمیں ڈرانے کے لیے اچھا ہے یہ انداز' ہو ہا ہا' اُف' سردیوں کی لمبی رات' سچی کہانیاں کے پراسرار نمبر کا ساتھ' واہ واہ واہ' جاوید راہی سلامت رہے آپ کے قلم کی سیاہی لاتے ہیں آپ ہر بار ایک نیا موضوع اور نئی بات' بلائے جان ملازم حسین شیرازی' آپ نے تو ہماری روح ہی ہلا دی' ثمینہ مشتاق تیسری چابی سچ سچ رات کے پہر دل دھڑکا گئی' (رات کے گیارہ بجے پڑھی تھی ناں) جنات کی معافی ہمارے ضمیر کے دروازے کی کنڈی کھڑکا گئی ایم حسن نظامی صاحب' نائس اینڈ نائس ویری نائس اتنی باتیں وہ بھی جنات کی زبانی کر گئی شرم سے پانی پانی' باقی کہانیاں بھی ٹھیک تھیں قابل تعریف تھیں چند ایک کو چھوڑ کر...... ڈاکٹر طارق آکاش صاحب آپ کی آمد بھلی لگی۔ یقیناً آپ کا قلم سچی کہانیاں کے اوراق پر اپنا رنگ جمانے میں کامیاب ہو ہی جائے گا بیسٹ آف لک' باقی سلسلے بھی زبردست تھے شعر و سخن میں بس مور شاہد حسین کی دسمبر پسند آئی اور آپی جی یہ کیا؟ میری غزل نامعلوم کے نام کر دیا۔ آپی جی میری اپنی ذاتی غزل ہے یہ

پہلے اپنی محبت کا اسیر کیا تو نے
پھر اپنے ہجر میں دلگیر کیا تو نے

جی ہاں نامعلوم نہیں مریم شاہ بخاری۔ یہ تو ہو گیا تبصرہ اب آپ مجھے دیجیے اجازت لیکن جانے سے پہلے سید محمد حر حسین کی آمد پر مبارکباد دینے کا بے حد شکریہ کیسا لگا آپ کو میرا محمد حر......؟ تصویر مل گئی تھی ناں؟ آپی جی میرے لیے دعا کرنا کہ میں اپنے بیٹے کو ایک اچھا انسان بنانے میں کامیاب ہو جاؤں۔ اپنی غزل بھی بھیج رہی ہوں شائع کر دیجیے گا۔

مریم! تمہاری آمد اچھی لگی سچی کہانیاں پسند کرنے کا شکریہ' تمہارا شہزادہ ہمارا بھی لاڈلہ ہے اور میری دعا ہے کہ اللہ اُس کو تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک بنائے ماشاء اللہ بہت پیارا ہے لگتا ہے اماں پر گیا ہے۔

☆ ڈاکٹر طارق محمود آکاش' ڈسکہ سے لکھتے ہیں۔ سچی کہانیاں کے تمام لکھنے اور پڑھنے والوں آپی منزہ سہام اور تمام ٹیم کو ڈاکٹر طارق کی طرف سے محبتوں بھرا آداب' خداوند کریم سے دعا اور امید یہی ہے کہ آپ سب باخیریت ہوں گے۔ خدا میرے وطن میں بسنے والے ہر ذرے کی خیر کرے ایک آنکھ والی خطرناک نیلی حسینہ کے ٹائٹل سے سجا اور منزہ سہام کے محنت سے ترتیب دیا۔ دلچسپ کہانیوں کی کہکشاں سے سجا نومبر کا سچی کہانیاں چار تاریخ کو ملا۔ اسے پہلے دو دن سے بہت سے دوستوں کے فون اور میسجز آرہے تھے کہ آپ کی کہانی وبال جان بانسری پڑھی ہے ڈائجسٹ میں کافی دیر بعد آپ کی انٹری پسند

آئی تو پتہ چلا کہ منزہ آپی نے ہماری کہانی پُراسرار نمبر کے لیے سلیکٹ کی ہے۔ مگر جب ڈائجسٹ ملا تو اس میں سب سے بڑی غلطی یہ نکلی کہ ہماری تحریر کے ساتھ سرگودھا لکھ دیا گیا ہے اگر ہو سکے تو پلیز یہ واضح کر دیا جائے کہ ہم ڈسکہ سیالکوٹ سے ہیں۔ ماشاء اللہ سے پرچہ دن بدن نکھرتا جا رہا ہے۔ میں سب سے پہلے اپنے دوست محترم جناب حاجی مجید احمد جائی کو ونر لسٹ میں آنے کی مبارکباد پیش کرتا ہوں' منزہ سہام کا بس ایک پھاٹک' اداریہ قابل غور ہے' ارباب اختیار کو اس معاملے کی طرف فوراً توجہ دینا ہوگی۔ غلام جو بنے سردار بہت ہی عمدہ اور ایمان افروز سلسلہ ہے اس میں معلومات ملتی ہیں۔ یہ سچی کہانیاں کی بہترین کاوش ہے اسے بند نہیں ہونا چاہیے' ایم یعقوب احمد' نازیہ بتول' ارشد اقبال' رفعت خان' ایم اے خالق' ملازم حسین شیرازی' ریحانہ اعجاز' اروشمہ خان' عابدہ مغل' محسن علی طاب' حمیرا وحید' مومنہ بتول' فیصل ندیم کے تبصرے اچھے لگے آنٹی نفیسہ آپ کو بہت بہت سلام اور دعائیں' راکن ولسن ساگر کو سچی کہانیاں کی محفل میں خوش آمدید' چھوٹے بھائی فیصل مشتاق اور بڑے بھائی حسن نظامی صاحب کو بہت بہت سلام جناب آپ کے تبصرے اور کہانی ماشاء اللہ سے بہت پسند آتی ہے جگ جگ جیو' پاکستانی شوبز کی معلومات بھی لازمی ہر ماہ ڈائجسٹ کا حصہ ہونی چاہیں۔ آپی فریدہ جاوید فری کا لیٹر شامل نہیں ہے۔ مگر اُن کی غزل نے اُن کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ حسن نظامی اور فیصل مشتاق آپ کی غزل بھی پسند آئی۔ کاش ہم پڑھے لکھے ہوتے رفعت خان بہت پسند آئی۔ ثناء اللہ ظہیر بھائی کی لکھی نعت شریف بہت اچھی لگی۔ جزاک اللہ تیسری چابی ثمینہ مشتاق ادارہ کی طرف سے درخواست کی کہ یہ کہانی رات کو مت پڑھیں کے باوجود رات کو پڑھی اُس رات شدید طوفان اور بارش بھی تھی اور یقین کیجیے اپنے اس فیصلے کو اپنی غلطی تسلیم کرنا پڑی۔ لاجونتی جاوید راہی ہمیشہ کی طرح بہت بہت زبردست تحریر لے کر آئے اسرار غیب' حنا بشریٰ کی کہانی بھی بہت پسند آئی میری بہن ارم ناز کالا جادو کے ساتھ حاضر تھیں خوش رہو بہنا آپ کا لیٹر نہیں پڑھنے کو ملا احوال میں' اور ہماری کتاب آپ کو کیسی لگی ضرور بتایئے گا پڑھ کر' چڑیلوں کا مسکن محمد حنیف شاکر بہت اچھا لگا۔ آسیبی نیم کا درخت' عثمان بھائی کا خوفناک تحریر کے ساتھ آنا پسند آیا۔ قاسم خان بلوچ بھیا کیسے ہیں آپ' اور کہاں رہتے ہیں آج کل ہمیں بھی کبھی یاد کر لیا کریں۔ کوئی تھا جنگل میں جی واقعی کوئی تو ضرور تھا۔ فیصل مشتاق بھیا تک روحیں ارے چھوٹے بھائی آپ ان روحوں کے چنگل میں کیوں پڑ جاتے ہو دور رہو ان باتوں سے' بابا جی ایم حسن نظامی' تو پھر جنات نے واقعی معافی مانگ ہی لی۔ بہت خوب جناب اچھی معیاری تحریر پائی۔ اور پھر تتلی مر گیا آنٹی نفیسہ بہت اچھی تحریر کے ساتھ تشریف لائیں موت کا پنجہ میری بہن حمیرا وحید کی کہانی اچھی لگی۔ ماہ وش طالب وہ لوٹ آیا اچھی تحریر تھی آپ کی آئندہ کہانی اور تبصرے کا انتظار رہے گا۔ فوزیہ فرید واقعی بہنا بہت سے جنات نیک بھی ہوتے ہیں بہت کم ایسا ہوا ہے کہ ایک ڈائجسٹ میں اتنی زیادہ کہانیاں پسند آئی ہوں۔ مگر اس ماہ کا پراسرار نمبر بہت بہت اعلیٰ تھا۔ آپی منزہ کو ڈھیر ساری مبارکباد اتنا اچھا نمبر شائع کرنے پر' آخر میں اتنا ہی کہوں گا کہ خوش رہیے خوش رکھیے کسی بھی بات کا برا مت منایئے' نماز اور قرآن میں باقاعدگی ہر مسئلے کا حل ہے۔ قرآن روزانہ پڑھیے اور چاہے ایک آیت پڑھیے مگر ترجمہ کے ساتھ پڑھیے' خدا میرے وطن میں امن قائم کر دے اور ہم سب کو مل کر رہنے کی توفیق دے آمین میری تمام قارئین سے درخواست ہے کہ ان لوگوں کے لیے دعا ضرور کیا کریں جو اولاد کی نعمت سے محروم ہیں۔

◄ طارق بھائی اب تو یہ معلوم ہی کرنا پڑے گا کہ آخر کمپوزر صاحب ہر رائٹر کے ساتھ شہر سرگودھا کیوں کمپوز کر دیتے ہیں حالانکہ خود تو وہ کراچی کے ہیں۔ بہرحال نشاندہی کا شکریہ امید کرتی ہوں کہ آپ کا قلمی تعاون ہمارے ساتھ رہے گا۔

☆ چوہدری یاسر وکی دیپالپور سے لکھتے ہیں۔ تمام قارئین کو محبت بھرا اسلام قبول ہو۔ آج بڑی مدت بعد سچی کہانیاں میں لکھنے کی سعادت حاصل ہوئی جس کی وجہ میرے تمام قاری بہن بھائی ہیں۔ دوستوں کی کالز اور ایس ایم ایس مجھے واپس سچی کہانیاں میں کھینچ لائے ہیں۔ یہ سب قاری بہن بھائیوں کی دعائیں ہیں کہ آج میں ایوارڈ یافتہ رائٹر ہوں اور ہاں چاہے آج میں ناول نگار' نامہ نگار اور رائٹر اور جو کچھ بھی ہوں دوسوں کی دعائیں اور سچی کہانیاں کی بدولت ہوں مجھے آج وہ دن یاد ہے کہ جب میں کچھ بھی نہیں تھا تو سچی کہانیاں کے ادارے نے مجھے رائٹروں کی لسٹ میں شامل کیا اور آج خدا کا شکر ہے کہ میرے اپنے تین ناول شائع ہو چکے ہیں جن میں لاہور شہر کی گلیاں' اب پیار نہیں کرنا' اور کیا عالی شان لکھا ہے شامل ہیں اور ماشاء اللہ میری نیوز ایجنسی پر اول نمبر پر جو ڈائجسٹ جا رہا ہے وہ ماہنامہ سچی کہانیاں ہے آخر میں ادارے سے ریکویسٹ ہے ایک

اسٹوری بھیجی تھی جو آپ نے ابھی تک شائع نہیں کی جس اسٹوری کی کاپی دوبارہ ارسال کر رہا ہوں مہربانی کر کے قریبی شمارے میں جگہ دیں آپ کی عین نوازش ہوگی۔ بہت سے ڈائجسٹوں میں کام کر چکا ہوں اور کر رہا ہوں لیکن جو مزہ سچی کہانیاں میں لکھنے کا آیا وہ کسی اور ڈائجسٹ میں کہاں ملتا ہے میرے پیارے کزن لوگ جن میں سرفراز' طیب جمیل' وسیم' آمنہ' صائمہ' ماریہ لوگوں نے ٹھیک موڈ سے اسپیشل ریکویسٹ سینڈ کی ہے کہ پلیز سچی کہانیاں میں بھی اپنی انٹری دوبارہ کرواؤ۔ میں نے جواب میں کہا کہ یہ ڈائجسٹ ہمارا اپنا ہے تو ادارہ سے ریکویسٹ ہے کہ میری تحریر جس کا نام طوفانی شادی ہے جلد شائع کریں آپ کی عین نوازش ہوگی۔

چوہدری صاحب! آپ کی کہانی تو کب کی شائع ہو بھی چکی اور لوگوں نے کافی پسند بھی کی پھر آپ کو کیوں کر پتہ نہیں چلا...... خیر اب آپ پابندی سے احوال میں شرکت کریں اور ایک زبردست سی تحریر فنافٹ ارسال کر دیں۔

☆ایم حسن نظامی قبولہ شریف سے لکھتے ہیں۔ قابل قدر چیف ایڈیٹر صاحبہ آداب عرض' سلام مسنون امید ہے آپ اور قلم قبیلے کے سبھی احباب خیریت سے ہوں گے۔ سچی کہانیاں کا پراسرار نمبر اپنی تمام تر رعنائیوں سے جلوہ گر ہوا۔ اور بلاشبہ آپ کی بیکراں محنتیں نمایاں ہوئیں۔ آپ اور سچی کہانیاں کی پوری ٹیم جس قدر محنت لگن اور یکسوئی سے پرچے میں نکھار لا رہے ہیں سراہنے کے قابل ہے۔ ٹائٹل سے قریشی کے اشتہار تک سبھی تحریریں بولتی اور باتیں کرتی ظاہر ہوئیں سچ تو یہ ہے کہ اس پرچے نے پراسراریت کے سبھی ریکارڈ توڑ دیے اور یوں نمبر ون قرار پایا۔ آپ کے ادارے میں آپ نے حکومتی عہدیداروں کو جھنجھوڑا اگر اصلاح اور کام کی طرف کسی کا بھی دھیان ہرگز نہیں شاید...... احوال و گفتگو کی محفل میں سبھی احباب عمدہ اور خوبصورت باتیں بیان فرما رہے تھے تو کچھ گلے شکورے بھی سننے میں آئے اور کچھ احباب اپنی تحریروں کی اشاعت پر زور دیتے نظر آئے۔ ایم یعقوب احمدانی' ارشد اقبال چوہان' ڈاکٹر طارق محمود آکاش' غلام مرتضیٰ علوی' رفعت خان' ایم اے خالق بھٹی' ملازم حسین سیرازی' ریحانہ اعجاز' نظر علی برمانی' عابدہ مغل' حمیرا وحید' محسن علی طاب' مور شاہد حسین قمر' نفیسہ فضل' فیصل ندیم بھٹی' سبھی نے عمدہ معیاری اور خوبصورت گفتگو کی جس سے دل خوش ہو گیا۔ سبھی احباب کو میری نگارشات پسند فرمانے کا ڈھیروں شکریہ' اور نئے آنے والے احباب کو محفل میں ویلکم نئی تحریر حاضر ہے امید ہے پرچے میں جگہ بنا لے گی۔ پرچے کی پہلی ایمان افروز تحریر غزالہ عزیز نے حضرت اسلم حبشیؓ کے بارے میں لکھی سبھی ایمانی جذبے معطر اور شادمان ہو گئے۔ سوال نامہ کے بارے میں نا جان سکے کہ سبھی لکھاریوں کے لیے تھے یا پھر صرف بیبیوں کے لیے......؟ ثمینہ مشتاق تیسری چابی کے ساتھ نمایاں رہیں انہوں نے الفاظ و واقعات خوبصورتی سے رقم کیے مگر ایسے زنگ آلود تالے اور چابیاں تباہی و بربادی کا باعث ہوا کرتے ہیں جیسا کہ فواد اور فضاء کے ساتھ ہوا۔ نیل گری کی تلاش میں افتخار چوہدری نے بہت ریسرچ کی اور صفدر نے اپنی بہن کو بچا لیا۔ جاوید راہی بھی لکھاریوں کی صرف میں بہت بڑا نام رکھتے ہیں انہوں نے اسٹیشن ماسٹر کی محبت پر خوبصورت لفاظی کی مگر انسانیت کی وہی پُراسرار موت ثابت ہوئی ویلڈن جی' مذہبی اور اسلامی ذہن سے منور حافظہ سیدہ مون شاہ بخاری کا تعارف اچھا لگا اور ساحل قادری اور اُن کی شاعری بھی معیاری اور منفرد رہی۔ حنا بشریٰ اسرار غیب کے رموز و واقعات پر محو گفتگو پائیں بلاشبہ خداوند کریم نے کچھ باتیں علم غیب میں پنہاں رکھی ہیں وہ صرف اور صرف وہی جانتے ہیں جو خداوند کریم کے نزدیک ہوا کرتے ہیں اور استاد کی اجازت کے بغیر عملیات کرنا محض بے وقوفی ہی نہیں موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ وہ سردرات بھی اچھوتی تحریر پائی۔ پیر شاہ قادری کی پانچویں سیڑھی بھی پراسراریت سے بھرپور پائی۔ ملازم حسین شیرازی بلائے جان لیے رونما ہوئے ان کے قلم کی کرید بھی خونی واقعات پر مبنی پائی ارم ناز کالے جادو کی حقانیت بیان فرما رہی تھی سنا ہے کہ یہ عمل غیر مذاہب کے لوگ ہی کرتے ہیں ہمارا دین اسلام اس کی قطعی اجازت نہیں دیتا۔ مگر معاشرے کا بہت سا حصہ اس طرف راغب ہے جو بہت بڑا خسارہ اور گناہ ہے۔ محمد حنیف شاکر عرصہ بعد اپنوں کی محفل میں رونما ہوئے مگر تحریر عمدہ اور معیاری لائے۔ کیو ریسٹورنٹ' ہوس پرستی اور لالچ پر مبنی عمدہ تحریر پائی۔ عثمان غنی صاحب ہمارے آنگن میں بھی نیم کا پیڑ ہے اچھا کیا آپ نے ہمیں خبردار کر دیا آئندہ ہم خیال رکھیں گے۔ قاسم خان بلوچ بھی لکھنے میں اپنا ثانی نہیں رکھے مظلوم جن نے اپنا انتقام لیا عمدہ لکھا۔ فرح انیس بھی روحوں پر قلم چلا رہی تھیں تو فیصل مشتاق بھی خواب کی کیفیت میں روحوں کا ماجرا بیان کر رہے تھے۔ میری حقیقت پر مبنی تحریر کیسی لگی ضرور بتایئے گا۔ نفیسہ فضل محمود چھوٹی سی

نصیحت کے ساتھ حاضری لگوا رہی تھیں تو حمیرا وحید بھی اچھے عمدہ اور معیاری واقعات سے پردہ اٹھا رہی تھیں۔ ماہ وش طالب نے بھی زیادتی کے شکار بچے کی روح پر طبع آزمائی منفرد انداز تحریر سے کی۔ شازلی سعید مغل کی تیرویں قسط اچھے اسباق پر مبنی پائی۔ ڈاکٹر طارق محمود آ کاش بھی عمدگی کا تاثر دے گئے۔ بانسری کی تانیں نجانے کتنے نغمات سنا جاتی ہیں جن پر جن وانس کان کھڑے کرتے ہوئے ہمہ تن گوش سننے لگتے ہیں بقیہ سلسلے بھی اچھے اور معیاری تھے مگر آپ کی ڈائری کی کمی شدت سے محسوس کی۔ شعروسخن میں اچھی شاعری پڑھنے کو ملی آخر میں پاکستانی شوبز سے آگاہی ہوئی۔ اس قدر معیاری پرچے کی ترتیب وسلیکشن پر مبارکباد قبول فرمائیں اب اجازت۔

◄ بھائی حسن! سچی کہانیاں آپ کو اچھا لگا یقین جانیں بہت خوشی ہوئی آپ کی تحریر موصول ہوگئی ہے انشاء اللہ جلد شائع ہوگی۔

☆ خضر حیات روڈہ تھل سے لکھتے ہیں۔ السلام علیکم! محترمہ پیاری آپی آپ کیسی ہیں۔ امید کرتا ہوں آپ خیر خیریت سے اور ٹھیک ٹھاک ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کی پوری ٹیم کو سدا خوش رکھے سلامت رکھے اور لمبی عمر دے آمین‘ سچی کہانیاں کے رائٹرز قارئین سچی کہانیاں کو پڑھنے اور چاہنے والوں کو میرا پیار بھرا اسلام قبول ہو۔ نومبر کا شمارہ ایک پراسرار اور خوفناک ٹائٹل کے ساتھ چھ نومبر کو مل گیا۔ پیاری آپی واقعی شمارہ بھی بہت پراسرار اور خوفناک تھا۔ ساتھ ساتھ ٹائٹل بھی انتہائی پراسرار اور خوفناک تھا جس دن شمارہ ملا دو رات تو نیند بھی نہ آئی رات کو سونے میں خواب بھی ایسے نظر آئے لیکن پھر بھی ہمت نہ ہاری‘ جب شمارے کے اندر گیا تو دل خوشی سے باغ باغ ہوگیا واہ پراسرار کا مزہ ہی دوبالا ہوگیا۔ کہانیاں تو سب کی سب اچھی تھیں سپرہٹ تھیں لیکن ان دوستوں کی کہانیاں سپرہٹ لاجواب تھیں ان میں شامل ہیں ثمینہ مشتاق کی تیسری چابی‘ افتخار چوہدری کی نیل گری حنا بشریٰ کی اسرار غیب ڈاکٹر جویریہ ندا کی وہ سرد رات‘ ملازم حسین شیرازی کی بلائے جان‘ ارم ناز کی کالا جادو‘ عثمان غنی کی آسیبی درخت‘ فرح انیس کی سرد رات اور فیصل مشتاق کی بھیانک روحیں حمیرا وحید کی موت کا پنجہ اور مہوش طالب کی وہ لوٹ آیا شامل ہیں۔ ان دوستوں کی کہانیوں نے پراسرار کا مزہ ہی دوبالا کر دیا مجھے ان دوستوں کی کہانیاں بہت اچھی لگیں شعروسخن میں سمیہ تسیم انڈیا‘ نفیسہ فضل محمود‘ فیصل مشتاق قبولہ شریف‘ ایم حسن نظامی قبولہ شریف‘ محمد حنیف شاکر بھاگو والی‘ کی غزلیں بہت بہت زبردست اور عمدہ تھیں شمارے میں باقی غزلیں بھی عمدہ اور اچھی تھیں۔ پیاری آپی اس بار آپ کی ڈائری کو کہاں غائب کر دیا۔ اب تک کے لیے اتنا ہی زندگی نے وفا کی تو پھر انہی صفحات کے ساتھ پھر ملاقات ہوگی۔

◄ بھائی خضر! شمارہ پسند کرنے کا شکریہ ہمارا تو مقصد ہی آپ کو ڈرانا تھا‘ لیجیے اس ماہ ڈائری حاضر ہے۔

☆ عردشمہ خان بہاولپور سے لکھتی ہیں۔ السلام علیکم! پیاری منزہ سہام اور سچی کہانیاں ریڈرز اینڈ رائٹرز‘ سچی کہانیاں رسالہ انتہائی معلوماتی اور معیاری ہے‘ بہت کچھ سیکھنے اور پڑھنے کو ملتا ہے آج کے دور میں یہ واحد رسالہ ہے جس نے اپنا معیار برقرار رکھا ہوا ہے اللہ پاک مزید ترقی دے آمین۔ ریحانہ اعجاز پیاری دوست آپ کو بہت محبت اور پیار آپ کی نظم بہت عمدہ تھی اور بات تو خیر ہوتی رہتی ہے آپ سے ریحانہ آپ میری بہت اچھی دوست ہیں اور اللہ ہمیشہ ہماری دوستی قائم رکھے آمین۔ سب کہانیاں بہترین ہیں۔ فرح انیس کی سرد رات‘ انسانی ڈھانچے‘ اور فیصل مشتاق کی بھیانک روحیں بہت دلچسپ اور اچھی کہانیاں تھیں۔ اسرار غیب حنا بشریٰ کی‘ وہ سرد رات ڈاکٹر جویریہ ندا اور کالا جادو ارم ناز کی بھی کہانیاں اچھی لگی مجھے‘ باقی سارے سیگمنٹ بھی اچھے تھے۔ منزہ سہام جی مجھے بہت انتظار ہے خطوط لکھنے والوں کے نام محمد حسن نظامی‘ ریحانہ اعجاز‘ ڈاکٹر طارق‘ ملازم حسین شیرازی‘ ہاجرہ عمران لاہور‘ عابدہ مغل‘ محسن علی طاب‘ سور شاہد‘ فیصل ندیم بھٹی‘ ان سب کے خط بھی اچھے تھے بائی ایم اے خالق بھٹی نے پوچھا آپ کا تعلق پہلے کس علاقے سے تھا بھائی ایم اے خالق میرا تعلق شروع سے ہی بہاولپور سے ہے اور میں اِدھر ہی رہتی ہوں آخر میں بھائی محسن طاب کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جن کی وجہ سے میں اس بزم میں شرکت کر سکتی ہوں اگلے ماہ پھر حاضر ہوں گی دعاؤں کے ساتھ اجازت۔

◄ اچھی عردشمہ! سچی کہانیاں پسند کرنے کا شکریہ‘ میری کوشش ہوتی ہے کہ صاف ستھرا اور معیاری رسالہ شائع کروں۔ جو سب اپنی بہن بیٹیوں کو خود خرید کر پڑھنے کے لیے دیں۔ تم ہر ماہ احوال میں شرکت کرو مجھے اچھا لگے گا۔

دعائے مغفرت

معروف صحافی نذیر لغاری کے چھوٹے بھائی فدا حسین لغاری قضائے الٰہی سے انتقال کر گئے۔ اللہ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے (آمین)۔ سچی کہانیاں کے قارئین سے التماس ہے کہ ایک بار سورۃ فاتحہ پڑھ کر مرحوم کے ایصال ثواب کے لیے دعا کریں۔

☆حمیرا وحید واہ کینٹ سے لکھتی ہیں۔ السلام علیکم آپی اللہ پاک آپ کو کامیابیوں کے ساتھ صحت مند زندگی عطا فرمائے آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں کہ آپ نے میری تحریر کو یہ اعزاز بخشا کہ سچی کہانیوں کے صفحات کا اسے حصہ بنایا۔ آپ کی انتھک محنت قابل تعریف ہے سارے رسالے کو دیکھنا اور اتنے سارے احوالیوں کو محبت بھرے جواب دینا اور تمام رائٹرز کے افسانوں کو مطالعہ کر کے باری باری رسالے میں جگہ دینا بہت محنت طلب کام ہے۔ بھائی ایم اے خالق واہ کینٹ کافی بڑا اور گنجان آباد ہے۔ ایسے میں بغیر ایڈریس کے میں آپ کو آپ کی باجی کی خیریت سے کیسے آگاہ کر سکتی ہوں۔ آپی آپ کا بے حد شکریہ آپ نے شگفتہ شفیق صاحبہ کو شاعری کی اصلاح کے لیے مقرر کر کے میری بڑی اُلجھن ختم کر دی۔ آپ جیسے اساتذہ کی اللہ پاک عمر دراز کرے جو بغیر معاوضے کے اتنی محنت اور توجہ سے اپنے لکھاریوں کو کامیابی دلانے کے لیے کوشاں ہے۔ آپی میں بہت شوق سے احوال پڑھتی ہوں اور اس میں شرکت میری خوشی کا باعث ہے اس ماہ کے ونرز کو بہت بہت مبارکباد غلام جو بنے سردار پڑھ کر روح کو تازگی ملتی ہے یہ ایک بہترین سلسلہ ہے جو میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں صحابہ کرامؓ کے بارے میں جاننے کا موقع ملتا ہے۔ اس بار حضرت اسلم حبشیؓ کے بارے میں جاننے کا موقع ملا اور یہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کتنے خوش نصیب ہیں آپؓ اسلام قبول کرنے کے مختصر عرصے میں ہی اللہ پاک نے جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمایا۔ اس بار شگفتہ شفیق نے ساحل قادری کے بارے میں تعارف کروایا جو اچھا لگا۔ کالا جادو ایک اچھی تحریر تھی جو موجودہ زمانے کی عکاسی کر رہی تھی۔ یہ حقیقت ہے جادو کے ذریعے کئی گھرانوں کا سکون برباد کیا جا چکا ہے۔ اتنا محبت کرنے والا شوہر اور بیٹی کیسے اپنی ماں کے ساتھ ایسا کر سکتی ہے۔ کئی ایسے واقعات ہمارے معاشرے میں سامنے آ رہے ہیں۔ ہمارے پیارے نبی ﷺ پر بھی جادو ہوا تھا۔ مگر اس کا توڑ بھی اسلام میں موجود ہے۔ بھیانک روحیں' فیصل مشتاق بھائی نے بھی اچھی تحریر قلم بند کی ایک تعویذ نے اس کی حفاظت کی۔ قرآن پاک میں ہر بیماری کا علاج موجود ہے پھرتی مرگیا مختصر سی مگر سبق آموز تحریر تھی۔ ویسے بھی جانوروں کو مارنا نہیں چاہیے۔ جن جانوروں کی صورت میں ہو سکتے ہیں یہ جان کر اور بھی احتیاط برتنی چاہیے۔ نیک جنات تحریر بھی اچھی تحریر تھی۔ جس طرح انسانوں میں اچھے برے انسان ہوتے ہیں' اسی طرح جنات میں بھی اچھے جنات ہوتے ہیں جو کسی کو دکھ تکلیف میں مبتلا نہیں کر سکتے۔ باقی افسانے زیر مطالعہ ہے۔ مسئلہ یہ ہے میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں شعر و سخن شوبز سلسلے بہت اچھے ہیں۔ معلومات کے ساتھ تفریح بھی ملتی ہے۔ اس بار میں ایک افسانہ مستقبل اور شاعری بھیج رہی ہوں امید کرتی ہوں آپ سچی کہانیوں کے صفحات میں اس کو جگہ دیں گی۔ جبکہ پہلے سے بھی شاعری آپ کے پاس موجود ہے میرے ساتھ ایک اچھا استاد موجود ہے تو مجھے کسی قسم کی ٹینشن نہیں میری طرف سے سچی کہانیاں کے تمام پڑھنے والے افراد کو سلام۔

پیاری حمیرا! تم نے اتنی محبت اور محنت سے کہانی ارسال کی تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ شائع نہ ہوتی' بالکل مطمئن رہو میں بہت ایمانداری سے اپنا فرض نبھانے کی کوشش کرتی ہوں اور چاہتی ہوں کہ ہمارے بعد بھی لکھنے اور پڑھنے والوں کی فصل تیار ہو جو پورے خلوص کے ساتھ اپنا علم نئے لکھنے والوں میں بانٹ سکیں۔ علم اور قابلیت کو پیسے کے ترازو میں صرف بنیا ہی تول سکتا ہے ہم نہیں۔

تاخیر سے ملنے والے خطوط

(نعمان آرائیں، جام شورو۔ فریدہ فری، لاہور۔ ذیشان شیخ، فیصل آباد۔ فیصل مشتاق، قبولہ شریف۔ نفیسہ فضل، کراچی)

☆ فیصل ندیم بھٹی سرگودھا سے لکھتے ہیں۔ السلام علیکم! محترمہ ایڈیٹر صاحبہ منزہ سہام نومبر کا شمارہ پُراسرار نمبر یکم نومبر کو ہی مل گیا۔ ٹائٹل میں خوفناک آنکھ کے منظر نے ڈرا ہی دیا۔ جیسے کوئی چڑیل کی آنکھ ہو، اشتہارات کو پلٹتے دیکھتے ہوئے آخر کار منزہ سہام مرزا کے اداریے 'بس ایک پھاٹک' پر جا کر نظر ٹھہری۔ آپ نے بہت اہم مسئلے کی طرف حکومت پاکستان کی توجہ مبذول کرائی ہے میرا بھی مشاہدہ ہے کہ زیادہ تر ریلوے کراسنگ جہاں پر ہیں وہاں پھاٹک نہیں ہیں۔ نجانے کتنے معصوم بچے ریلوے پھاٹک نہ ہونے کی وجہ سے لقمہ اجل ہو گئے۔ کئی مرتبہ ایک ہی خاندان کے کئی افراد ریلوے پھاٹک نہ ہونے کی وجہ سے واپس اپنے گھروں کو خود نہ پہنچ سکے' نجانے کتنی ماؤں کی گودیں اجڑ گئی ہیں کتنی ہی عورتوں کے سہاگ اجڑ گئے امید ہے کہ حکومت پاکستان اس اہم مسئلے کی طرف توجہ دے کر تبدیلی کے نعرے کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ہوگی۔ احوال میں سب سے پہلے یعقوب احمدانی کرسی صدارت پر بہترین تبصرے کے ساتھ براجمان تھے۔ نازیہ بتول رضا' السلام علیکم! آپ کی شاعری کی کتاب کیسے ملے گی اگر بھیج دیں تو شکر گزار ہوں گا' ارشد اقبال چوہان' حسن نظامی' طارق محمود' خالق بھٹی' ملازم حسین شیرازی' ریحانہ اعجاز' نظر برمانی' عابدہ مغل' محسن علی طاب' بہترین تبصرے کے ساتھ موجود تھے۔ فیصل مشتاق آپ کا خط نہ پا کر احوال میں آپ کی کمی محسوس ہوئی غلام جو بنے سردار حضرت اسلم حبشیؓ کی زندگی کے حالات اور ایمان لانے کا واقعہ ایک چرواہے کو اتنی بڑی سعادت پڑھ کر ایمان کو تقویت نصیب ہوئی۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف' تیسری چابی ثمینہ مشتاق خوف سے جڑی کہانی جس نے کئی جانوں کو نگل لیا' تیسری چابی آپ کے گھر کی چابیوں میں تو نہیں آخری فقرہ سوچ کر بھی دہشت سے جسم میں جھٹکا سا لگ جاتا ہے۔ نیل گری افتخار چوہدری سبق آموز کہانی ہے جو دوسروں کے لیے برا سوچتے ہیں اور برا کرتے ہیں ان کے ساتھ بھی برا ہی ہوتا ہے جیسا کہ عظمٰی کے ساتھ ہوا۔ لاجونتی جاوید راہی غیر مرئی مخلوق سے محبت حیران کن ہے۔ تعارف' حافظ سیدہ موَن شاہ بخاری تعارف پڑھ کر سیدہ موَن شاہ کی عاجزی اور انکساری قابل رشک ہے۔ سید خاندان سے منسوب ہونا اور پھر حافظ قرآن ہونا اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت ہے کاشی چوہان کے دور میں جب وہ مدیر تھے ان کے بارے میں ان کا عجیب و غریب رویہ آپ کو مطمئن نہ کر سکا پڑھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی ناصر رضا کے دور میں بھی آپ کی کہانیاں شائع ہوئی ہیں ان کے بارے میں آپ کے کیا الفاظ ہیں محترمہ ہمیشہ اچھا گمان رکھنا چاہیے ہر ایک ایڈیٹر کا انداز مختلف ضرور ہوتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ سچی کہانیاں ایسا ادارہ ہے جو خاص طور پر نئے لکھاریوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور اُن کو لکھنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اسرار غیب حنا بشریٰ کسی بھی کام میں استاد رہنما کا ہونا ضروری ہوتا ہے آخر میں یہ سبق ہے کہ بہترین وظیفہ استغفار اور درود پاک کثرت سے پڑھنا چاہیے ہی اولیا کا فیضان ہے۔ عامل کامل پیر شاہ محمد قادری دین اور دنیا کی کشمکش کی داستان دلچسپ قسط رہی اور حقائق سے پردہ اٹھ رہا ہے۔ فیصل مشتاق ویلڈن اسراریت سے بھرپور کہانی لائے بھیانک روحیں فیصل مشتاق آپ کی غزل دل کو چھو گئی۔ بابا جی کے فیض سے سینکڑوں افراد کو مسائل اور مشکلات سے نجات پاتے دیکھ کر دل بہت خوش ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بابا جی کو عمر خضر عطا فرمائے اور تادیر ان کا سایہ ہم پر قائم رکھے آمین۔ انہی الفاظ کے ساتھ اجازت۔

فیصل بھائی! یہ تو بڑی زبردست خبر ہے کہ ایک آنکھ نے آپ کو ڈرا دیا پُراسرار نمبر 2 کا ٹائٹل اور خطرناک ہوگا تیار ہو جائیں اور ایک عدد خطرناک سے تحریر بھی بھیج دیں۔

اس آخری خط کے ساتھ اپنی مدیرہ کو اجازت دیجیے اور سچی کہانیاں سے متعلق کوئی بھی بات ہو بلا جھجک مجھ سے کہیے۔ میں منتظر رہوں گی۔

دعاؤں کی طالب

منزہ سہام

غلام جو سردار بنے

حضرت عامر فہیرہؓ

غزالہ عزیز (اُمِ ایمان)

آپ کی کنیت ابو عمرو اور نام عامر تھا۔ آپ ام المومنین حضرت عائشہؓ کے اخیافی بھائی طفیل بن عبداللہ کے غلام تھے۔ سیاہ فام حبشی النسل تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے دعوت الی اللہ کی طرف بلانے کا آغاز کیا تو حضرت عامرؓ ابتدائی زمانے میں اسلام لے آئے۔ غلام تھے لہٰذا مشرکین کے بتوں سے روگردانی کی سزا میں ہر قسم کے مظالم کا سامنا کیا۔ کانٹوں پر گھسیٹے گئے۔ گرم ریت اور پتھروں پر لٹائے گئے لیکن یہ ساری اذیتیں ان کو اللہ کے راستے سے نہ ہٹا سکیں۔ وہ چٹان کی طرح مشرکین عرب کے مظالم کے سامنے کھڑے رہے اور ایک لمحہ کے لیے بھی ان کے قدم نہ ڈگمگائے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ایک دن ان کو اس حال میں دیکھا کہ کافر لونڈے ان کو کانٹے چبھو رہے ہیں اور ان کی داڑھی پکڑ پکڑ کر طمانچے مار رہے ہیں۔ صدیق اکبرؓ نے اسی وقت ان کو خرید کر آزاد کر دیا۔ عامر نے آزادی کے بعد آستانہ نبوی ﷺ کی غلامی اختیار کر لی اور دن رات اللہ کے رسول ﷺ کی خوشنودی کی لگن دل میں لیے حاضر رہتے۔

جب رسول اللہ ﷺ کو ہجرت کا حکم ہوا تو ابوبکرؓ اُن کے ساتھ تھے۔ آپ نے تین دن غار ثور میں گزارے۔ صدیق اکبر کے اہل خانہ کے علاوہ صرف حضرت عامر بن فہیرہ اس راز سے آگاہ تھے یعنی وہ اللہ کے رسول ﷺ کے لیے ایک ایسی شخصیت بن چکے تھے جن پر ہر طرح کے حالات میں اعتماد کیا جا سکتا تھا۔

صحیح بخاری میں ہے کہ عامر بن فہیرہؓ حضرت ابوبکرؓ کی بکریاں چراتے تھے۔ چنانچہ ان دنوں جب رسول اللہ ﷺ اور صدیق اکبرؓ غار ثور میں موجود تھے عامرؓ دن بھر بکریاں چراتے اور شام کو انہیں غار کے منہ پر لے جاتے تا کہ بکریوں کا تازہ دودھ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کر سکیں اور واپسی پر جھاڑیوں کو ہاتھ میں لے کر الٹے پاؤں واپس آ جاتے تا کہ اپنے قدموں کے

نشانات مٹا دیں اور مشرکین عرب غار تک نہ پہنچ پائیں۔

تین دن تک اسی طرح غار میں گزارنے کے بعد جب رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر صدیقؓ مدینہ کی طرف روانہ ہونے لگے تو حضرت عامر بن فہیرہ بھی ساتھ ہو لیے اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے انہیں اپنے پیچھے اونٹ پر بٹھالیا اور یوں ان کو سفر ہجرت میں رسول اللہ ﷺ کا ساتھ نصیب ہوا۔

قبا میں جب رسول اللہ ﷺ نے قیام کیا تو حضرت عامر بن فہیرہ کو حضرت سعد بن خثیمہ انصاری نے اپنا مہمان بنالیا اور جب مدینہ پہنچنے کے چند ماہ بعد رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین اور انصار میں مواخات کا رشتہ قائم کیا تو حضرت عامر بن فہیرہؓ کو حضرت حارثؓ بن اوس کا اسلامی بھائی بنایا۔

مہاجرین کی مدینہ آمد کے بعد مہاجرین کی ایک اچھی خاصی تعداد بیمار ہوگئی تھی کیونکہ مکہ اور مدینہ کی آب و ہوا میں خاصا فرق تھا لہٰذا کچھ لوگوں کو یہ راس نہیں آئی تھی۔ ان ہی میں عامرؓ بن فہیرہ بھی شامل تھے۔ ان کی علالت بڑھتی گئی یہاں تک کہ اتنی شدت اختیار کرلی کہ زندگی سے مایوس ہوگئے۔

حضور اکرم ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے دعا فرمائی ”الٰہی تو مکہ کی طرح بلکہ اس سے بھی خوشگوار اس سرزمین کو ہمارے لیے بنادے اور اس کو بیماریوں سے پاک صاف کردے۔“

سرور کائنات، حکیم امت کی دعا قبول ہوئی اور مہاجرین صحت یاب ہونے لگے اور یوں عامر بن فہیرہؓ بھی صحت یاب ہوگئے۔

صحت یاب ہونے کے بعد آپؓ نور رسالت سے فیض یاب ہونے کے لیے اصحابؓ صفہ میں شامل ہوگئے۔ زہد و تقویٰ، قرآن کا گہرا علم اور محبت رسول ﷺ آپ کا کل سرمایہ تھی۔

جہاد کے میدان میں بھی آپؓ نے بہادری و شجاعت کے خوب جوہر دکھائے اور احد اور بدر دونوں جنگوں میں رحمت اللعالمین ﷺ کے شانہ بہ شانہ ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔

صفر 4 ہجری میں نبی کریم ﷺ نے ابو براء عامر بن مالک کی درخواست پر ستر حفاظ و قراً حضرات کی جماعت اس کے ساتھ روانہ کی تاکہ وہ اہل نجد کو دین حق کی دعوت دیں۔ یہ مقدس اور جلیل القدر صحابیوںؓ کی جماعت جس میں عامر بن فہیرہ بھی شامل تھے جب بیئر معونہ کے مقام پر پہنچی تو بنی کلاب کے سردار عامر بن طفیل نے غداری کی اور قبائل رعل و ذکوان کے مشرکین کو ساتھ ملالیا اور صحابہؓ کی اس جماعت پر حملہ کردیا۔

یوں مبلغوں کی یہ مقدس جماعت ساری کی ساری شہید کردی گئی۔ سوائے عمرو بن امیہ الضمری کے اور ان کو صرف اس لیے چھوڑ دیا کہ عذرا، عامر بن طفیل کی ماں نے ایک غلام آزاد کرنے کی نذر مانی تھی۔ چنانچہ عمرو بن امیہ الضمری کے پیشانی کے بال کاٹ کر ان کو آزاد کردیا گیا۔

حضرت عامر بن فہیرہ کو ایک شخص جبار بن سلمی کلابی نے شہید کیا۔ جب اس نے پوری قوت سے اپنا نیزہ حضرت عامرؓ کی پشت پر مارا تو انہوں نے گرتے ہوئے بے ساختہ پکارا۔

”فزت واللہ...... خدا کی قسم میں کامیاب ہوگیا۔“

جبار بن سلمی یہ کلمہ سن کر حیران تھا کہ اس نے دیکھا کہ عامر بن فہیرہ کی لاش تڑپ کر آسمان ک

سورج اور چاند

اللہ تعالیٰ نے سورۃ یٰسین میں انسان کی توجہ مبذول کرائی ہے کہ وہ غور کرے اور اس بھید کو جانے کہ کس طرح دن اور رات کی گردش اپنی رفتار سے ازل سے قائم ہے اور کس طرح سورج اپنے مقررہ وقت پر طلوع اور غروب ہوتا ہے اور چاند کس طرح اپنی چاندنی بکھیر کر رات آنے کا اعلان کرتا ہے۔ اس کی وضاحت اس آیت سے ہوتی ہے۔

''اور سورج اپنے مقرر رستے پر چلتا رہتا ہے۔ یہ خدائے غالب اور دانا کا مقرر کیا ہوا انداز ہے اور چاند کی ہم نے منزلیں مقرر کردیں۔ یہاں تک کہ گھٹتے گھٹتے کھجور کی پرانی شاخ کی طرح ہو جاتا ہے۔ نہ تو سورج سے ہی ہوسکتا ہے کہ چاند کو پکڑ لے اور نہ رات ہی دن سے پہلے آسکتی ہے سب اپنے اپنے دائرے میں تیر رہے ہیں۔'' (یٰسین:40-39)

قولِ حضرت علیؓ

حضرت علیؓ سے جب پوچھا گیا کہ ''دنیا کا سب سے امیر آدمی کون ہے؟'' آپؓ نے فرمایا: ''وہ شخص دنیا کا امیر ترین شخص ہے جس کے دوست مخلص ہوں۔'' ایک اور جگہ آپؓ نے ارشاد فرمایا کہ ''انسان کو انسان دھوکہ نہیں دیتا۔ انسان کو اس کی وہ توقعات دھوکہ دیتی جاتی ہیں جو وہ دوسروں سے وابستہ کرلیتا ہے۔''

مرسلہ: نورین جبران۔ کراچی

طرف بلند ہوئی اور نظروں سے غائب ہوگئی۔ کچھ دیر بعد دیکھا کہ وہ آسمان و زمین کے درمیان معلق ہیں اور پھر آہستہ سے زمین پر آگئے۔

جبار بن سلمی کلابی قاتل، عامرؓ بن فہیرہ نے بتایا کہ میں ان کے اس جملے کو نہ سمجھ پایا چنانچہ میں نے بعد میں اپنے ہی قبیلے کے ایک آدمی ضحاک بن سفیان کلابی جو رسول اللہ ﷺ کی طرف سے بنو کلاب کے عامل تھے۔

ان سے اس جملے کا مطلب پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ اس سے یہ مراد تھی کہ اس طرح شہادت پانے سے مجھے جنت مل گئی (اور میں اپنے مقصد زندگی میں کامیاب ہوگیا)

پھر ضحاک بن سفیان نے مجھے دین حق کی طرف دعوت دی تو میں نے اسلام قبول کرلیا اور یوں حضرت عامر بن فہیرہ کا آخری جملہ اور وہ ماجرا جوان کی شہادت کے بعد میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا مجھے اسلام میں داخل کرنے کا باعث بن گئے۔ شہادت کے وقت حضرت عامر بن فہیرہؓ کی عمر 34 یا 40 برس تھی اور انہوں نے اپنے پیچھے کوئی اولاد نہیں چھوڑی تھی۔ جلیل القدر صحابہؓ کی اتنی بڑی تعداد کی اس طرح غداری کے باعث شہادت کی وجہ سے حضور اکرم ﷺ کو شدید رنج پہنچا اور اب اس قدر غمگین اور دلفگار ہوئے کہ ایک ماہ تک ان لوگوں کے لیے جو اس قتل عام میں شریک تھے بددعا کی۔

بعد میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگں کے بارے میں رسول اللہ ﷺ پر وحی نازل کی جو بعد میں منسوخ کردی گئی وحی یہ تھی کہ

''ہماری قوم کو یہ بتادو کہ ہم اپنے رب سے ملے تو وہ ہم سے راضی ہے اور ہم اس سے راضی ہیں۔''

☆☆......☆☆



ہمیں فخر ہے

سچی کہانیاں کے قاری نعمان احمد آرائیں جن کا تعلق کوٹری ضلع جامشورو سے ہے کہ چھوٹے بھائی شیراز احمد آرائیں نے دوران ڈیوٹی شہادت نوش کی۔ پاک آرمی کی انجینئرنگ کور کے اس سپوت پر ہمیں فخر ہے اور ہماری دعا ہے کہ ہر گھر میں شیراز احمد آرائیں شہید جیسے جانباز سپاہی پیدا ہوں۔

فرانس سے ارسال کردہ طویل سچی تحریر

مائی نی میں کینوں آکھاں

ہم ہمیشہ اپنی بیٹیوں کو صبر کی تلقین کرتے رہتے ہیں
اور بعض اوقات وہ صبر کرتے کرتے قبر میں جا سوتی ہیں......

انیلہ حمید راٹھور

زندگی میں بعض تحریروں کو صفحہ قرطاس پر لکھنا جتنا آسان ہوتا ہے۔ عملی زندگی میں اتنا ہی کٹھن...... جس کرب اور دکھ سے گزر کر وہ معاشرے کے سامنے ایک کہانی کی صورت اختیار کرتی ہیں۔ اسے دیکھ کے دل بے اختیار چلا اٹھتا ہے کہ آخر...... انسانیت کی حد زندگی ہے کہاں تک......؟'' چوہدری سکندر نے مکاری سے ایک آنکھ مارتے ہوئے بالے کی طرف دیکھا۔

مال ٹھیک نہیں فرسٹ کلاس ہے بالے' تمہیں تمہارا حصہ ملتا رہے گا بس کبھی کبھار ہمارا بھی منہ میٹھا کروا دیا کرو۔ چوہدری سکندر کے چہرے پر دنیا بھر کی خباثت اور لہجے میں چھپی کمینگی بالے سے چھپی نہ تھی۔

مگر اس کے لیے یہی کافی تھا کہ برسوں سے چوہدری کے پاس رہن رکھی چند بیگھہ زمین اب وہ بالے کو نہ صرف دینے کو تیار تھا بلکہ اس بار اس کی فصلوں کی کٹائی کا نصف حصہ بھی چوہدری نے معاف کر دیا تھا۔

جو کام برسوں سے اس کا باپ اور دادا نہ کروا سکے۔ وہ بالے نے اپنی خدمات پیش کرتے چٹکیوں میں کروالیا۔

''چوہدری جی......اس نے ہاتھ باندھے۔ آپ بالکل بے فکر رہیں جی۔ جب بھی گھر کے مرغ مسلم سے دل اوب جائے تو باہر کی دال سے ہاتھ صاف کرنے کے لیے ایک بار بالے کو ضرور یاد کرلیا کریں جی...... بالا تن من سے حاضر ہوگا۔

بالے نے بے غیرتی کے تمام ریکارڈ توڑتے ہاتھ باندھ کے اسے یقین دلایا' غیرت گئی تیل لینے......

''اچھا اچھا' چل جا اب......زیادہ مسکے نہ لگا۔ چوہدری نے ٹھٹھہ لگایا۔ ناں جی ناں' آپ جانتے ہو چوہدری جی۔ بالا زبان کا بڑا پکا ہے جی۔ آپ خود بتاؤ جو کبھی آپ کی بات ٹالی ہو۔ بالا منمنایا۔

''اوئے ٹھیک اے' ٹھیک اے' نہ مر جاناں ہوں تو کتنا زبان کا پکا اور غیرت والا ہے۔'' چوہدری ہنسا۔ جس میں بالے کی کھسیانی ہنسی شامل تھی۔

"اور سن بالے......!" چوہدری نے فوراً پینترا بدلتے ہوئے شہادت کی انگلی اس کی طرف کی۔

"اس بات کا کسی کو پتہ نہ چلے۔ جانتے ہو ناں پھر اس کا انجام کیا ہو گا۔" چوہدری سکندر نے مونچھوں کو نئے سرے سے بل دیتے موٹی لال انگارہ آنکھوں سے اسے گھورا۔

"نہ جی نہ چوہدری جی، کیسی دل جلانے کی بات کی ہے۔ بالا آپ کی عزت کو جب بٹہ لگائے۔ اللہ کرے بالا اسی دن مرجائے۔" بالے نے فراخ دلی سے اپنی قربانی پیش کی۔

"اوئے ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے بالے، چل جا اب...... دفعہ ہو، بہت دنوں بعد سکون ملا ہے۔ اب آرام کرنے دے گا کہ یونہی بک بک کرتا جائے گا۔" اس نے بالے کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ اور بالا گھبراہٹ میں درباری سلام کرتا الٹے قدموں باہر نکلتا چلا گیا۔ مبادا چوہدری کی ناراضگی وہ کیسے مول لیتا۔

صبح کی سپیدی نمودار ہونے میں ابھی کچھ وقت درکار تھا۔ باہر گٹھری کی صورت میں بیٹھی پائل اپنی عزت کا ماتم کررہی تھی۔

"چل! اب اٹھ بھی جا کہ یہیں بیٹھی پچھلوں کا سوگ مناتی رہے گی۔" اس نے پائل کو ٹھوکر لگاتے زہریلی نظروں سے دیکھا۔

پائل نے سہم کر دوپٹے کے پلو سے اپنے آنسو رگڑ کے صاف کیے اور سرد آنکھوں سے اسے دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے چہرے پر دکھ، درد،



تکلیف کے آثار کم بے حسی کے زیادہ تھے۔اس نے بالے کی طرف نفرت وحقارت سے دیکھا۔

دل چاہا اس کا منہ نوچ لے۔اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے کتوں کو کھلا دے۔ پھر خود کو ختم کر لے۔مگر وہ صرف سوچ سکتی تھی' کر نہیں سکتی تھی۔

وہ جان چکی تھی بالے کی مردانگی پر کسی قسم کا کوئی اثر نہ ہوگا۔جو کمینگی اس کے اندر رچ بس گئی ہے وہ اسے کبھی نہ نکال پائے گی۔

وہ روتی سسکتی اپنے نام نہاد شوہر بالے کے پیچھے سر جھکائے اپنی عزت کا ماتم کیے چل دی۔اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اس کی بات مانے۔

گھر میں داخل ہوتے ہی پر لی نظر چھ مہینے کے بیٹے پر پڑی۔ جو اس کے دکھ درد سے انجان گہری میٹھی نیند سو رہا تھا۔دردزیدہ نظروں سے ایک ماں اپنے بیٹے کو دیکھتی شرمندگی کے بوجھ تلے دبی ماؤف دماغ سے زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔اپنی قسمت کو کوستی یا بالے کی بے غیرتی کو......وہ سمجھ کے بھی سمجھ نہ پا رہی تھی اور بالا اس کا کاغذی شوہر پرسکون ومطمئن انداز میں ساتھ پڑی رنگین پایوں والی چارپائی پر لاپرواہی سے لیٹ گیا۔

آج اس کی آنکھوں میں برسوں سے کھوئی من چاہی مراد مل جانے کی خوشی چھلک رہی تھی۔ چند پل وہ چھت کی طرف دیکھتا رہا پھر ٹھنڈی اور مطمئن سانس لیتا دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔جبکہ دوسرے کمرے میں بے چینی سے ہاتھ ملتی پائل کی بڑی بہن صورت صبح

ہونے کا انتظار کرنے لگی۔روزمرہ کی طرح وہ چھت پر بیٹھی نظر آئی تو اٹھتے قدم خود بخود بالکونی پر ٹھہر سے گئے۔

وہ اپنے مخصوص انداز میں بیٹھی کسی گہری سوچ میں منہمک تھی۔قریب ہی اس کی عمر کی تین چار لڑکیاں خوش گپیاں کرتیں قصے کہانیوں میں مگن زندگی کی رعنائیوں سے خوشبو چرا رہی تھیں۔مگر وہ سب سے بے نیاز اپنی الگ دنیا بسائے ہوئے تھی۔

عجب لڑکی تھی۔سرشام ہی چھت پر بچھی چارپائی پر بیٹھ جاتی اور اپنے مخصوص وقت پر اٹھ کر نیچے چلی جاتی۔اس کی طرف بار بار دیکھنے کی وجہ شاید اس کی طویل خاموشی اور وہ اداسی تھی جو دور سے ہی محسوس کی جا سکتی تھی۔

میں خود سمجھ نہ پا رہا تھا کہ کیوں میرا دل اس کی طرف لپکتا ہے۔

اس محلے میں شفٹ ہوئے ابھی ہمیں زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا۔دو ماہ قبل ہی ابو جی نے یہ گھر خریدا تھا۔محکمہ زراعت میں وہ اچھے عہدے پر فائز تھے۔لیکن ریٹائرمنٹ کے بعد جتنی رقم ملی اسے غنیمت جانتے ہوئے انہوں نے اس سفید پوش علاقے میں گھر لے لیا یوں کہہ لیں رزق حلال کی کمائی سے لیا گیا یہ گھر ہماری کل کائنات تھا۔

چھ مہینے سے زیادہ عرصہ ہو چکا تھا میں ایم اے کی ڈگری لیے نوکری کی تلاش میں سرگرداں تھا۔مگر ابھی تک اس تگ و دو کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکل سکا۔بہنیں دونوں ابھی کالج میں تھیں۔اب میری باری تھی کہ ابو کا ہاتھ بٹاؤں اور ان کا بوجھ ہلکا کروں۔

''اس محلے میں سوائے دو تین گھروں کے ابھی ہماری زیادہ سلام دعا بھی نہ ہوئی تھی۔امی سے ہی دو تین گھروں کے بارے میں معلومات مل سکیں۔جس میں سرفہرست سامنے والا گھر تھا۔جو دو بھائیوں فہیم اور ندیم کی ملکیت تھا۔

ندیم چھوٹا تھا جبکہ فہیم بڑا بھائی' دونوں اپنی اپنی فیملیوں کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔فہیم کی بیوی عرصہ دراز سے دنیا سے منہ موڑ چکی تھی۔اس کے

بچوں کی دیکھ بھال انکی چاچی ثمینہ کے ذمے تھی۔ یوں سمجھ لیں ثمینہ آنٹی نے خود انسانی ہمدردی کے تحت ان بچوں کی ذمہ داری اپنے سر لے لی کیونکہ ان بچوں سے ان کا دوہرا رشتہ تھا خالہ بھی اور چاچی بھی' وہ انھیں اپنے بچوں کی طرح چاہتیں۔

قاسم! امی کی آواز پر میں چونکا۔ منتشر خیالات کو سمیٹتا پیچھے مڑا اور اسے دیکھتا نیچے کی طرف لپکا۔ وہ ہنوز ویسے ہی بیٹھی تھی۔

''قاسم بیٹا دیکھو ذرا! شام ہونے کو ہے۔ یہ دودھ والا ابھی تک نہیں آیا' گاجروں کی کھیر بنانی ہے' اب تو آدھی گاجریں بھی کدوکش ہو گئیں۔ امی فکر مندی سے بولیں۔ آجائے گا امی جان! فکر کیوں کرتی ہیں' میں نے ایک گاجر اٹھا کے منہ میں ڈالی۔

کچھ دیر اور دیکھ لیتے ہیں۔ نہ آیا تو میں بازار سے لے آوں گا میں نے انھیں تسلی دیکر مطمئین کرنا چاہا۔

نہیں بیٹا! ایک گھنٹہ اوپر ہو گیا ہے۔ وہ پانچ بجے آتا ہے اب دیکھو سوا چھ بج رہے ہیں۔ مجھے ایسے لگتا ہے وہ نہیں آئے گا۔

باقی گاجریں پانی میں بھگوتے انہوں نے میری طرف دیکھا اور مسکرا کے بولیں۔ کیا تم نہیں جانتے۔ شام کی چائے تمہارے ابو کو نہ ملے تو طوفان بھرپا کر دیتے ہیں۔ اب کیا چاہتے ہو کہ ابھی وہ ہڑبونگ مچا دیں۔ امی کی بات پر مجھے ہنسی آگئی۔

اچھا اب ہنسنے کی کوئی ضرورت نہیں' تم جاؤ اور چائے کے لیے ابھی دودھ لے کر آؤ'' چہرے پر مصنوعی خفگی سجائے وہ گویا ہوئیں۔

''ٹھیک ہے' لے آتا ہوں امی! ناراض کیوں ہوتی ہیں۔'' میں نے سعادت مند بیٹے کی طرح ان سے پیسے لیے اور گاجر کھاتا ہوا باہر نکل آیا۔

''سامنے والے فہیم صاحب نے دوسری شادی کر لی ہے بیگم......!'' رات کو کھانا کھاتے ہوئے اچانک ابو بولے۔

''اور آپ نے مجھے بتایا بھی نہیں۔''

''اچھا! امی کھانا چھوڑ کے انھیں حیرت سے دیکھنے لگیں۔

''ہاں......وہ مغرب پڑھنے مسجد گیا تو ساتھ والے کامران صاحب نے بتایا۔ میں نے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے پھر بھی انھیں مبارک باد دے دی۔

ویسے تو اچھا کیا آپ نے......امی نے ابو کی طرف دیکھتے کہا۔

''لیکن میرے ناقص علم میں ایسی کوئی بات نہیں اور ثمینہ بھی تو تین چار روز سے نہیں آئی۔ ورنہ وہ بتا دیتی۔ امی نے ندیم انکل کی بیوی کی بات کی۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے اسے علم نہ ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اب کے امی حیرت کے ملے جلے تاثرات سے بولیں۔

مگر ایک بات کی سمجھ نہیں آئی یہ فہیم صاحب کو کیا سوجھی۔ جوان بیٹیوں کے ہوتے ہوئے بیاہ رچا بیٹھے۔ کچھ بچیوں کا خیال ہی کر لیتے۔ امی نے خفگی سے کہا۔

''خاص کر نازش کا' جو بیماری کے بوجھ تلے دبی ہے۔''

''کون بیمار بیٹی امی......!'' زارا کی رگ حسیات پھڑکی۔ میرے بھی کان کھڑے ہوئے۔ مبادا ماجرا کیا ہے۔

''کچھ نہیں زارا......! امی نے ٹھنڈی آہ بھری۔ کتنی بے بس ہوتی ہیں وہ بیٹیاں جن کی مائیں نہیں ہوتیں اور کتنے معذور ہوتے ہیں وہ احساس کہ سب رشتے ہوتے ہوئے بھی بیٹیاں اپنے غم اندر اتار کر

بوجھ ہلکا نہیں کر پاتیں۔اب کے وہ افسوس سے بولیں۔

"بس بیگم! قدرت کے آگے کس کی چلتی ہے۔ اسی ذات کے بنائے ہوئے ہم انسان ہیں۔جیسے رکھے۔جس حال میں رکھے۔ہمیں صبر کا دامن ہر حال میں تھام کے تو رکھنا پڑتا ہے۔"ابو نے امی کو پریشان ہوتے دیکھا تو ان کو تسلی دی۔

"وہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔بس ان بچیوں کا خیال آگیا۔" ثمینہ بتا رہی تھی۔ماں کے چلے جانے کے بعد بڑی نے اتنا غم لیا کہ ٹی بی کی مریضہ ہوگئی۔باپ کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ ٹھیک طریقے سے علاج کروا سکتا۔

نتیجہ...... بیماری آخری اسٹیج پر پہنچ گئی اور دوسری بدقسمتی سے پیدائشی بولنے اور سننے کی نعمت سے محروم ہے۔

"آہ بیچاری! امی دکھ سے بولیں۔مجھے تو ہول آتا ہے جب ان کے بارے سوچتی ہوں۔اللہ کسی کو بھی آزمائش میں نہ ڈالے۔"

"لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے بیگم...... !"ابو بولے۔

"فہیم صاحب نے اسی لیے دوسری شادی کا فیصلہ کیا ہو کہ بیماری کی وجہ سے بیٹی ابھی گھرداری نہیں سنبھال سکتی' دوسری سمجھ نہیں سکتی' بول نہیں سکتی اور تیسری شاید بارہ سال کی ہے جو گھر کے کاموں کیلیے ابھی بہت چھوٹی ہے۔کامران صاحب بتا رہے تھے کہ گھر کے دگرگوں حالات کی وجہ سے 'بیٹا کسی ورکشاپ پر کام کرتا ہے۔صبح گیا رات تلک واپس آتا ہے۔اور کبھی کبھار گھر کا رخ بھی نہیں کرتا'اب آپ خود سوچیں'ایسی پریشانی میں گھر میں ایک عورت کا ہونا کتنا لازم ہے۔"ابو نے امی کو سمجھایا۔

"خیر......! ثمینہ تھی ناں بچیوں کو سنبھالنے کیلیے۔"امی نے ان کی چچی کا نام لیا۔

وہی تو ان کا سارا کام بڑی ذمہ داری سے کرتی آئی ہے' اور آگے بھی کر لیتی۔"امی دور کی کوڑی لائیں۔

ان کی بات پر ابو مسکرائے بنا نہ رہ سکے۔

"بیگم......!وہ چچی ہے ماں نہیں۔اس کے غالباً اپنے سات بچے ہیں۔کس کس کا کام سرانجام دے گی' اور ابھی ہم ان لوگوں کو زیادہ جانتے بھی نہیں۔اس لیے پرائے معاملات سے آپ دور ہی رہیں تو بہتر ہے۔"

امی کی منطق ابو کے ساتھ ہماری سمجھ سے بھی باہر تھی۔

"اب یہ تو خدا جانتا ہے کہ فہیم صاحب نے کیا سوچ کے فیصلہ کیا'ہمیں دعا کرنی چاہیے کہ ان کا اٹھایا یہ قدم مثبت ثابت ہو اور گھریلو معاملات بہتری کی طرف جائیں۔آمین۔"

امی نے بھی اب دعا میں ابو کا ساتھ دیا۔

"سچ پوچھیں تو مجھے بھی دھچکا لگا۔شادی کا سن کے نہیں' بلکہ ٹی بی کا سن کے......اب مجھے اس لڑکی کی سمجھ آئی کہ کیوں وہ دنیا سے کٹی ایک طرف بیٹھی رہتی ہے۔کزنز کے ساتھ بیٹھی ہوئی وہ ان کی طرح کیوں نہیں دکھتی۔مجھے دلی طور پر اس سے ہمدردی پیدا ہوئی۔

"جاب کے سلسلے میں دو تین جگہ سے لیٹر آچکے تھے۔سوچا کہ بائیک ٹھیک کروالوں تو کل نکل جاؤں گا۔مگر وقت کی کمی کے باعث نہ کروا سکا۔نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے دیرینہ دوست جمشید سے ایک دن کے لیے موٹر سائیکل مانگی کہ آنے جانے میں کوئی دقت نہ ہو۔اس نے بھی فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سارے دن کے لیے عنایت کر دی۔

یہ بھی شکر ہوا کہ سارے دن کی بھاگ دوڑ ضائع نہ ہوئی۔ جوس بنانے والی فیکٹری میں منیجر کی سیٹ خالی تھی۔

جو انھوں نے مجھے مرحمت فرما دی۔ میں خوشی خوشی مٹھائی کا ڈبہ لیے گھر پہنچا کہ انھیں خوشخبری سناؤں۔ گھر میں داخل ہوتے ہی سامنے نگاہ ثمینہ آنٹی پر پڑی اور ان سے پھسلتی ہوئی ساتھ بیٹھی نازش پر اسے دیکھ کے میرا دل زور سے دھڑکا۔ آج پہلی بار اسے اتنے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا وہ حقیقت میں بہت خوبصورت تھی۔

پیلے کڑھائی کے کرتے کیساتھ چوڑی دار پاجامہ پہنے سر پر ڈوپٹہ جمائے اپنے سفید دودھیا رنگت اور بڑی بڑی خواب ناک آنکھوں کیساتھ وہ غضب ڈھا رہی تھی۔ چہرے پر ملاحت کیساتھ عجب سوز تھا لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ ٹی بی کی مریضہ ہے۔ ایک پل کو تو میں بھونچکا گیا۔

دل چاہا ان کے پاس ہی بیٹھ جاؤں۔ لیکن ہم متوسط گھرانوں میں یہ بات ابھی بھی معیوب سمجھی جاتی ہے۔ سو دل کو سمجھاتا انھیں سلام کرتا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ دن بھر کا تھکا تھا۔ بیڈ پر لیٹتے ہی [illegible] بے خبر ہو گیا۔ وہ تو زارا [illegible] رہتا۔ میں آنکھیں [illegible]

"آپ اٹھ بھی جائیں بھائی...... مغرب کو ایک گھنٹہ [illegible] ہے کب سے امی ابو کھانے پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" وہ باہر نکلتے ہوئے اچانک رکی۔

"یہ مٹھائی کہاں سے آئی۔" وہ ڈریسنگ ٹیبل پر پڑی مٹھائی دیکھ کے رک گئی۔

"اوہ......! میں بتانا بھول گیا۔ تم اسے [illegible]

اور پلیٹ میں ڈال کے ٹیبل پر رکھو۔ میں واش روم سے ہو کے ابھی آیا۔ میں جلدی سے اٹھا اور جوتا پہنتا واش روم میں گھس گیا۔

"کھانے کی میز پر امی نے سب کی پسند کی چیزیں بنا رکھی تھیں اور وہ تب بناتیں جب کوئی خاص وجہ ہوتی۔

"اوہو امی! آج خیر تو ہے۔" میں نے خوشدلی سے پوچھا۔ امی کے چہرے پر مسکراہٹ در آئی۔

"میں تمہاری ماں ہوں تم میرے باپ نہیں۔" انھوں نے روایتی ماؤں کی طرح جتایا۔

"جب گھر داخل ہوئے مجھے تبھی اندازہ ہو چکا تھا تمہیں نوکری مل گئی۔ تم نے نہیں بتایا لیکن تمہارے ہاتھ میں پکڑی مٹھائی نے سارا راز اگل دیا۔" وہ خوش ہوتے بولیں۔

"واہ امی...... !زندہ باد......" میں نے نعرہ مارا اور ان کے گلے میں اپنے بازو حائل کیے۔ انھوں نے پیار سے میرے سر پر چپت لگائی۔

"[illegible] نہیں گیا تمہارا۔" ابو بھی بہت خوش [illegible]۔ زارا اور امینہ نے باقاعدہ ٹریٹ کا وعدہ لیا۔ جو میں نے خوشدلی کے ریکارڈ توڑتے ہوئے کر لیا۔

اسی طرح خوش گپیوں میں کھانا کھاتے نوک جھونک جاری تھی کہ اچانک ثمینہ آنٹی کا ذکر چھڑ گیا۔

"سنیے! قاسم کی نوکری کی خوشی میں بھول ہی گئی کہ ثمینہ کیساتھ نازش بھی آئی تھی وہ چاہتی ہے آپ کہیں اس کے لیے کوئی چھوٹی موٹی نوکری ڈھونڈ دیں۔ بچاری گھریلو حالات سے بہت پریشان تھی۔"

"ہوں ں ں......!" ابو نے ہنکارا بھرا۔

"بیگم......! ہاتھ پر سرسوں جمانے کو نوکری نہیں کہتے کہ ادھر بات کرو اور ساتھ ہی پوری ہو جائے۔

اس کے لئے وقت درکار ہے۔" انھوں نے پلیٹ میں سالن ڈالتے میری طرف دیکھا۔اب دیکھیں۔
"اپنے برخودار کو پورے چھ مہینے مختلف جگہوں پر طبع آزمائی کی تب جا کے کہیں نوکری کا منہ دیکھنا نصیب ہوا۔ وہ بھی ایم اے کی ڈگری کیساتھ اور جہاں تک میرا خیال ہے یہ بچیاں پڑھی لکھی بھی نہیں اور آپ جانتی ہیں پڑھائی کے بغیر نوکری ڈھونڈنا جوئے شیر لانے کے برابر ہے۔"
"جانتی ہوں قاسم کے ابو! امی کی جب بات کو اہمیت نہ دی جاتی تو وہ ابو کو ہمیشہ قاسم کے ابو جیسے القابات سے نوازتیں۔
اور آگے پیچھے آپ اب بھی انھیں ابو کا واضح انکار برالگا۔
ٹھیک ہے ان کا تعلیمی معیار بہتر نہیں۔مگر کہیں نہ کہیں چھوٹی موٹی جاب تو مل ہی سکتی ہے وہ اپنی بات پرڈٹی رہیں۔
کیسی باتیں کرتی ہیں بیگم۔ابو ناراض ہوئے۔ باہر کیا ہو رہا ہے یہ گھر کی عورتوں کو کیسے سمجھایا جائے۔ اچھے بھلے
پڑھے لکھے لوگ نوکریوں کی تلاش میں دفتروں کے دھکے کھانے پر مجبور ہیں۔اور پھر یہ لڑکی ذات ہے۔کل کلاں کو
کچھ ہو گیا تو ساری زمہ داری ہمارے سر آجانی ہے۔ابو نے امی کو سمجھایا۔ابو ٹھیک کہہ رہے تھے۔ہم ان لوگوں کو
جانتے تک نہیں تھے۔صرف انسانی ہمدردی میں کسی سے نوکری کی بات کر بھی لیتے۔تو گارنٹی دینی پڑتی۔اور ابو ان
باتوں سے گھبراتے تھے۔آپ یوں کہیں ناں۔کہ کرنا نہیں چاہتے۔اس سے پہلے کہ امی کی بات پر ابو اشتعال میں آتے میں نے

انٹری دینا مناسب سمجھا۔امی! میں کوشش کرتا ہوں۔کسی دوست سے بات کر کے دیکھتا ہوں شاید کوئی نہ کوئی راستہ نکل
ہی آئے آپ بیفکر رہیں۔
سچ بیٹا! وہ بچوں کیطرح خوش ہوئیں۔نجانے ان بچیوں میں ایسا کیا ہے کہ دل انکی طرف کھنچتا ہے ماں کے بغیر پلنے
والی بیٹیاں کیسے کیسے ستم سہتی ہیں۔ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔امی کی ازلی رحم دلی عود آئی۔آپ جانتے ہیں۔اب وہ ابو
سے مخاطب ہوئیں۔ابو مسکرا پڑے اور ان کے ساتھ ہم بھی۔چلو! محترمہ کا موڈ تو ٹھیک ہوا۔ابو کی بات سنکے امی
مسکرائیں۔ اچھا اب سنیں تو۔ثمینہ بتا رہی تھی۔فہیم صاحب کی نئی نویلی دلہن نے یوں سارے گھر کو مٹھی میں لیا ہے کہ
کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں۔اور تو اور گھر کا سارا بوجھ نازش کے ناتواں کندھوں پر ڈال دیا ہے۔اس کی بیماری کا
بھی خیال نہیں کیا۔ایک ماہ کی آئی ہوئی نے ایسے رویہ رکھا ہے کہ بچیاں سہم سی گئی ہیں۔اب وہ ابو سے مخاطب ان کے
بارے تفصیلا" بتانے لگیں۔ انھیں کے توسط سے ہم جان پائے۔کہ فہیم انکل کے گھریلو حالات نہ گفتہ بہ ہونے سے نازش کا
علاج نہیں ہو پا رہا۔اور بیماری بڑھتی جا رہی ہے۔ بھائی کی تنخواہ اتنی نہیں کہ گھر کا خرچ چلا سکے۔باپ کا ہوائی
رزق۔کبھی چلتا ہے کبھی نہیں۔گھر کو چلانا ان کے لیے انتہائی کٹھن ہے۔اوپر سے فائزہ سے شادی کر کے فہیم نے رہی

سہی کسر بھی پوری کر دی۔ جو کچھ بیٹیوں کے لیے بچا رکھا تھا۔ بیوی کی نظر کر دیا۔ اب حالات کی تنگی کیساتھ سوتیلی ماں کے طعنے برداشت کرتے نازش نے نوکری کا فیصلہ کیا ہے اسی سلسلے میں وہ ثمینہ کیساتھ آئی تھی۔

ابو کیساتھ ہم بھی حیرت سے سب سن رہے تھے۔ دکھ بھی ہوا۔ یہ غریبی اور مجبوری واقعی بہت بری چیز ہوتی ہے انسان سے زندگی کی رمق تک چھین لیتی ہے۔ اسی غربت سے چھوٹی چھوٹی نامکمل خواہشات بڑھتے بڑھتے ایسی محرومیاں اور کمپلیکس بن جاتی ہیں جو کسی آسیب کی طرح انسان کے وجود کیساتھ چمٹ کر اسے تباہی کے دہانے پر کھڑا کر دیتی ہیں انسان ہزار کوشش کے باوجود بھی اس سے چھٹکارا حاصل نہیں کر پاتا۔ اس فیملی کا بھی شاید یہی مقدر تھا۔

''اب میں نے نوکری کی حامی تو بھر لی۔ مگر اب بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کس دوست سے بات کروں۔ دو تین جگہ ٹرائی کیا۔

سب کا یہی جواب کہ پتہ کرتے ہیں۔ خیر اسی ادھیڑ بن میں دو ہفتے گزر گئے۔

میری خود کی نئی نئی جاب تھی۔ ساری معاملات پس پشت ڈال کے اپنی ساری توجہ کام پر مرکوز کر دی۔" انھی دنوں کراچی سے بڑی خالہ کا فون موصول ہوا کہ بڑی بیٹی نیہاں کے لیے شادی کی ڈیٹ فکس کرنی ہے تو ایسے خوشی کے موقعے پر امی کا ہونا ضروری ہے۔

امی اور خالہ دو ہی بہنیں تھیں بھائی کوئی تھا نہیں۔ تو اس موقع پر خالہ کے لیے امی ہی لازم و ملزوم تھیں۔ امی بھی سن کے جانے کو بیتاب ہو گئیں۔ ابو نے ایک ہفتے کیلئے ان کے ٹکٹ بک کروا لیے۔

اس دن میں نے کام سے چھٹی کر لی۔ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کے میں امینہ اور امی کو اسٹیشن چھوڑنے کیلئے روانہ ہوا۔ ان دونوں کو کمپارٹمنٹ میں بٹھا کے اچھی طرح تسلی کر کے نیچے اتر آیا۔

ٹرین کے چلنے تک دس منٹ تک وہی کھڑا رہا۔ جونہی اس نے سگنل دیا۔ امی اور امینہ کو الوداعی خدا حافظ کہا۔ جونہی ٹرین چلنا شروع ہوئی۔ اس کے اوجھل ہونے تک کھڑا انھیں دیکھتا رہا پھر واپسی کے لیے قدم بڑھا دیے۔ ابھی گیٹ تک ہی پہنچ پایا تھا کہ سامنے نظر ٹھہر گئی۔

وہ نازش ہی تھی۔ جو آنٹی ثمینہ کیساتھ میڈیکل اسٹور سے نکل رہی تھی۔ نجانے دل میں کیا سمایا کہ ان کے پاس جا کھڑا ہوا۔ دونوں مجھے دیکھ کے بھونچکا ہو گئیں۔

''اوہ قاسم بیٹا! تم یہاں۔ کسی کام کے سلسلے میں آئے ہو۔ وہ کچھ پریشان سی لگیں۔ جی آنٹی۔ میں مودب ہوا۔ دراصل امی خالہ کی طرف کراچی گئی ہیں۔ انھیں چھوڑنے آیا تھا۔ اوہ! اچھا' اچھا۔'' انھوں نے سر ہلایا۔

''ہم بھی یہاں دوائی لینے آئی تھیں' دوائی تو ملی نہیں۔ اسٹور والے نے پرسوں کا کہا ہے کہ تب تک آجائے گی' آنٹی کسی دوسرے میڈیکل اسٹور سے لے لیں۔ میں نے ان کی مشکل حل کرنے کی کوشش کی۔

''نہیں بیٹا! ہم اسی اسٹور سے لیتے ہیں۔ اب پرسوں تک آ ہی جائے گی۔'' انھوں نے بات بدلی۔ تمہارا کام کیسے چل رہا ہے۔ سوال داغا گیا۔ ٹھیک ہے آنٹی! ابھی نیا نیا ہے۔ سمجھنے میں کچھ وقت تو لگے گا۔

''ہوں ں......'' انھوں نے سر ہلایا۔

''اب چلتا ہوں آنٹی۔'' مجھے اور تو کچھ نہ سوجھا خدا حافظ کہتا واپسی کے لیے مڑا تو وہ پکار اٹھی۔

"سنیے۔" اٹھتے قدم وہیں رک گئے۔ دل یکبارگی دھڑکا۔

"جی ......" میں پلٹا۔ وہ میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ وہ خالہ سے کام کے سلسلے بابت ہوئی تھی۔ شاید انھوں نے آپ سے کچھ کہا ہو۔ وہ جھجکتے ہوئے گویا ہوئی۔

"اوہ ہاں ......" میں بوکھلایا۔

"اتنا فسوں خیز حسن...... شاید ہی میں نے دیکھا ہو۔"

جی امی نے کہا تو تھا۔ میں نے ایک دو جگہ پر بات بھی کی ہے۔ شاید کہیں سے کوئی جواب آجائے۔

میں نے اس کی طرف دیکھتے احتراماً نظریں جھکائیں۔ وہ حقیقت میں چاہے جانے کے قابل تھی۔

جی ٹھیک ہے۔ ہلکا سا تبسم اس کے چہرے پر تھا۔

جونہی کچھ پتا چلے ضرور بتائیے گا۔ اب اس نے خدا حافظ کہا اور آنٹی کے ساتھ جانے کے لیے قدم بڑھا دیے۔ میں کچھ پل دونوں کو دور تلک جاتے دیکھتا رہا۔ پھر لمبی ٹھنڈی سانس لیتا گھر واپسی کے لیے قدم بڑھا دیے۔

"چوہدھری جی ! بڑی چوہدرائن رمیضہ چوہدری کے پاؤں دابتی کن انکھیوں سے اپنے خاوند کا بھرپور جائزہ بھی لے رہی تھی۔

"اس بار میں نے پورے دس تولے کے کنگن لینے ہیں جیسے شاکرہ بی بی کے تھے۔" اس نے نند کا نام لیا۔

چوہدری سکندر مسکرایا اور حقے کا لمبا کش لگاتے ہوئے اسے محبت سے دیکھا۔

"لے لینا چوہدرائن...... یہ کونسا مشکل کام ہے۔ بھئی یہ جو زمینیں جائیدادیں دیکھ رہی ہو تم...... جانتی تو ہو۔ ہمارے پرکھوں کی نشانیاں ہیں۔ ہماری سات نسلیں بھی کام نہ کریں تو پھر بھی آرام سے بیٹھ کر کھا سکتی ہیں۔ اب تم خود سوچو۔ آخر کس لیے ہم نے سب کچھ بنایا ہے۔ تمہارے اور بچوں کے لیے ہی تو ہے۔ جب جو دل چاہے لے لیا کرو، پیسے کی پرواہ مت کیا کرو۔" رمیضہ خوشی سے اٹھلاتے ہوئے۔

"بس چوہدری جی...... جو دل چاہا آپ سے کہہ دیا، مجھے کیا چاہیے کیا نہیں آپ تو بخوبی جانتے ہیں۔" چوہدری گھاگ شکاری تھا جانتا تھا۔ رمیضہ کی کمزوری سونا ہے۔ اسی کمزوری کو اس نے محبت اور بھروسے کی چادر سے ڈھانپ کر اپنی ہوس اور بدمعاشی کو پروان چڑھایا۔ اپنی دکھاوے کی محبت کو چاپلوسی کی آبیاری سے اتنا تناور درخت بنا ڈالا کہ رمیضہ چوہدری سکندر پر اندھا اعتماد کرنے لگی۔ دونوں چچازاد تھے۔ بچپن سے جس شخص کے بارے سنتی رہی کہ وہ اس کا ہونے والا شوہر ہے۔ سہیلیاں جب چھیڑتیں تو کانوں کو بھلا بھی محسوس ہوتا۔ اماں جی اور ابا کے اس فیصلے نے کہ رمیضہ سکندر کی ووہٹی ہے اور اس کی ڈولی چاچے کے گھر جانی ہے۔ تب تک رمیضہ سکندر کو اپنے دل کے سنگھاسن پر بٹھا چکی تھی۔

والدین کی یہ سوچ کہ گھر کی دولت گھر رہے۔ کبھی ان بچوں نے بڑوں کے فیصلوں سے انحراف نہ کیا۔

شادی کے بعد سکندر نے اسے رانی بنا کے رکھا۔ وہ خود باہر کیا کرتا ہے، کدھر جاتا ہے، کیا معاملات ہیں۔ رمیضہ نے کبھی ٹوہ لینے کی کوشش نہیں کی۔ اسے صرف سونے اور کپڑے سے غرض تھی اور سکندر اس کی یہ خواہش پوری کرتا ہر روز گناہ کی دلدل میں

دھنستا چلا جا رہا تھا۔

"پائل...... او پائل۔" چچی ثمینہ کی آواز پر تیرہ سالہ پائل دوڑتی چھت کی طرف لپکی۔ ثمینہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔

"پائل یوں کرو، نازش اور صورت سے کہو اوپر آجائیں۔ میں نے آج تم تینوں کی پسند کی بریانی بنائی ہے ہری مرچیں ڈال کر...... دونوں کو بلا لاؤ جلدی سے۔" ثمینہ نے محبت سے اسے کہا۔

"نازش سے کہو، بھائی کی فکر نہ کرے۔ وہ رات کو آتا ہے اس کے لیے رکھ لوں گی۔"

"اوہ چاچی! آپ کتنی اچھی ہیں۔" پائل نے ان کے گلے میں بازو حائل کیے۔ ثمینہ نے فرطِ محبت میں اس کا ماتھا چوما۔ زبیدہ کے دنیا سے منہ موڑنے کے بعد ثمینہ نے بہن کی نشانیوں کو سینے سے لگا کے رکھا۔ حتی المقدور کوشش کی کہ بچیوں کو ماں کی کمی محسوس نہ ہونے پائے۔

اپنی حیثیت کے مطابق ان کی خواہشوں کو پورا تو نہ کر سکتی تھی مگر خیال ضرور رکھتی۔ حالانکہ اس کے اپنے سات بچے تھے۔ غربت کی چکی میں پسنے کے باوجود وہ ان کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کا خیال رکھتی۔ وہ جانتی تھی کہ فہیم کی غیر ذمہ دارانہ روش سے یہ باپ کی شفقت کو ترس رہی ہیں۔ زندگی میں جہاں رشتے ناطے اور روابط بہت اہم ہوا کرتے ہیں۔ وہیں ایک دوسرے کے مثبت رویئے بھی کسی خاندان کے لیے مضبوط ستون کا درجہ رکھتے ہیں۔

باپ کی صورت میں جو ستون انھیں میسر تھا اس کی لاپرواہی سے بچوں کے اندر عدم اعتمادی کا بیج اگ چکا تھا۔ یہ سب جاننے کے باوجود دونوں میاں بیوی فہیم کی خرمستیاں ختم نہ کر سکے تھے۔ دوسرا فائزہ کی صورت میں جو عذاب وہ گھر لایا تھا۔ اس سے بچیاں سہم سی گئی تھیں۔ ناصر سارا دن باہر رہتا جس کی

باپ نے رتی بھر پرواہ نہ کی، نتیجہ...... وہ اکثر باہر رہنے لگا۔ تب بھی فہیم اپنا فرض نہ نبھا سکا۔ لیکن ثمینہ کی محبت نے کسی حد تک بچیوں کو سنبھالے رکھا۔

"ثمرہ...... رافی...... ہما نے مل کر دستر خوان بچھایا۔ چھوٹے سے کمرے میں بچوں کو ترتیب وار بٹھاتی ثمینہ نے سب کو بریانی ڈال کے دی۔ سب مزے سے کھانے لگے۔ تینوں بہنوں کے ساتھ بیٹھی ثمینہ بریانی کھاتی نجانے کیا سوچ رہی تھی کہ فائزہ کی کرخت آواز اسے خیالات سے واپس کھینچ لائی۔

"بہت خوب! ماں نیچے بھوکی بیٹھی ہے اور تم تینوں یہاں بیٹھی پیٹ کا دوزخ بھر رہی ہو۔" فائزہ نے جاہلوں کی طرح کمر پر ہاتھ رکھے انھیں گھورا۔ سب یکدم آفت پر کھانا چھوڑ کے بیٹھ گئیں۔

"بھابھی آئیں بیٹھیں ناں آپ بھی۔" ثمینہ نے جلدی سے پیڑھی آگے کی۔ فائزہ نے اس کی پرواہ نہ کی، ہان کے چلی گئی۔

"ہائے...... ہائے...... یہ میں نے کیا کر دیا۔ وہ کیسا دن تھا۔ جب ان کے نکھٹو باپ سے شادی رچا بیٹھی۔ دیکھو...... ! دیکھو زرا...... ! تین تین جھونکیں میرا خون چوسنے کو مجھ پر مسلط کر دی گئیں، ہائے...... ! میری قسمت پھوٹ گئی۔ کسی کو میرا احساس نہیں۔ چاہے نیچے بیٹھی بھوک سے مر جاؤں اور انھیں دیکھو کیسے مزے لے لے کر کھا رہی ہیں۔" وہ نان اسٹاپ بولتی چلی گئی۔

"امی...... ! وہ چاچی...... ی...... ی۔" نازش کے الفاظ اس کے گلے میں اٹک کے رہ گئے جب فائزہ کا زناٹے دار تھپڑ اس کے گال پر انگلیوں کے نشان چھوڑتا چلا گیا۔

"ٹھونس لو...... اور ٹھونس لو۔" فائزہ لڑاکا عورتوں کی طرح چلائی۔ نازش ہکا بکا چہرے پر ہاتھ رکھے فائزہ کا نیا روپ دیکھتی رہ گئی۔ صورت فق

چہرے سے نازش کا چہرہ دیکھتی اٹھ کھڑی ہوئی اور پائل سہم کے ثمرہ کیساتھ چپک گئی۔

"بھابھی......! کیا کر رہی ہیں آپ۔" نازش کو تھپڑ پڑتے اور دوسریوں کو خوف زدہ ہوتے دیکھ کر ثمینہ صدمے سے گنگ بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ لیکن دوبارہ اسے آگے بڑھتے دیکھ کر چپ نہ رہ سکی۔ تڑپ کے بولی۔

"بس بہن......!" فائزہ نے ہاتھ سے اسے بولنے سے روک دیا۔

"یہ اب میری بیٹیاں ہیں۔ ان کا اچھا برا سب میں نے سوچنا ہے۔ کل کلاں کو کچھ ہو جائے تو فہیم تو مجھ سے پوچھیں گے ناں۔ تو کیا جواب دے پاؤں گی، تو بہن...... اپنی مہربانیاں خود تک رکھو، میری بیٹیوں کے لیے نہیں۔" وہ تفاخر سے کہتی تینوں کو کھینچتی سیڑھیاں اترنے لگی۔ ثمینہ اس کا انداز تخاطب دیکھتے سن ہوتے دماغ کیساتھ ادھ کھائی بریانی کی پلیٹوں کو حسرت و یاس سے دیکھتی رہ گئی۔

"خیر تو ہے۔ آج صبح تڑکے ہی آ گئی ماسی۔" بالے کی ماں گائے کو کھڑلی سے باندھ کے پیچھے مڑی تو رشیدہ کو صحن میں داخل ہوتے دیکھا۔ ماسی رشیدہ سارے گاؤں میں پھپھے کٹنی کے نام سے جانی جاتی۔ مجال ہے گاؤں میں کبھی بھی پر مار جائے اور ماسی کو پتہ نہ چلے۔ اب اس کی اچانک آمد پر بالے کی ماں کا ماتھا ٹھنکا۔

"ہاں ماسی! کیا حال احوال ہے۔" اس نے چارپائی کو گھسیٹ کے چھاؤں میں کیا اور خود موڑھے پر بیٹھ گئی۔

"ٹھیک ہوں نذیراں۔" چادر اتارتی ماسی نے ادھر ادھر دیکھا۔

"اچھا لے پکڑ، پر لے لسی پی لے، اتنی دور سے چل کے آئی ہو۔" نذیراں نے اتنا لمبا چوڑا گلاس اسے پکڑاتے دوسرا اپنے منہ کو لگا لیا۔ ماسی نے لسی پیتے ہوئے گلاس کو زمین پر رکھا اور نذیراں بی بی کے قریب ہوئی۔ جسے دیکھ کر نذیراں کے حواس جاگے۔

"خدا جھوٹ نہ بلوائے نذیراں! منہ چھوٹا پر بات بڑی کرنے لگی ہوں ذرا دھیان سے سنیو......" ماسی کے تیور دیکھتے خود نذیراں کے کان کھڑے ہو گئے۔

"اچھا ماسی بات تو کر وا تنا انتظار کیوں کروا رہی ہو۔" اس کے لہجے میں تجسس تھا۔ رشیدہ کچھ اور آگے کھسکی۔

"صبح مجید ارفائے حاجت کے لیے کھیتوں میں گیا تو اس نے بالے اور تمہاری نکی بہو کو چوہدری سکندر کی بیٹھک سے نکلتے دیکھا۔" ماسی نے اپنے شوہر کا نام لیا۔

"مجیدے نے اپنی آنکھوں سے تمہاری بہو کو روتے دیکھا اور تم جانتی ہو نذیراں! چوہدری کی بیٹھک سے کون نکلتا ہے۔" ماسی رشیدہ ٹٹولتی نظر سے اسے دیکھتی دوبارہ لسی پینے لگی۔ نذیراں حیرت سے بولی۔

"بالے اور بہو کو دیکھا۔ وہ تو رات کو باہر ہی نہیں نکلا اندر پڑا ابھی تک سو رہا ہے اور بہو کو کیسے دیکھ لیا وہ گھر پر ہی تھی۔"

"تو کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں یا مجیدے نے جھوٹ بولا۔" ماسی کو برا لگا۔

"جانتی ہو ناں ماسی! کتنا بڑا بہتان لگا رہی ہو تم میرے بیٹے پر۔" نذیراں برا مان گئی۔

"دیکھو نذیراں! مجھے مجیدے نے جو دیکھا بتا دیا اور وہ میں نے حرف بہ حرف تمہیں کہہ دیا وہ بھی اس لیے کہ تم پنڈ کی بہو ہو اور تمہاری بہوئیں ہماری بیٹیاں...... چوہدری سکندر کو کون نہیں جانتا نذیراں، ایک نمبر کا لفنگا اور عورتوں کا رسیا...... بالا ابھی بچہ

ہے۔ اچھے برے کی ابھی اسے پرچان نہیں اب وہ وہاں صبح تڑکے کیا لینے گیا تھا۔ اسی سے پوچھو۔" ابھی ماسی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ نذیراں کی بڑی بہو ہراساں چہرہ لیے کمرے سے نکلی اور بھاگتی ہوئی ماسی رشیدہ کے پاس آئی اور اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ ماسی کے ساتھ ساتھ نذیراں بھی ہکا بکا صورت کو دیکھنے لگیں۔

"آ...... آ......" صورت جو سننے اور بولنے سے معذور تھی اڑی رنگت۔ پریشان حال چہرہ لیے بے چینی سے ماسی کا کرتا پکڑے پائل کے کمرے کی طرف اشارے کرنے لگی۔ ہاتھ سے کبھی اپنے سر کو پیٹتی۔ کبھی چارپائی پر ہتھڑ مارتی آنکھوں میں خوف دہراس لیے روتی بلکتی صورت ماسی کے ساتھ نذیراں کو بھی بہت کچھ باور کروا گئی۔ ماسی نے گھبرا کے تولتی نظر سے نذیراں کو دیکھا۔

"نہ رو میری دھی...... مجھے بتا تو سہی ہوا کیا ہے۔" ماسی نے اسے بازو سے کھینچ کے پاس بٹھایا۔ ماسی کی اتنی دلجوئی سے صورت جو کئی دنوں سے پریشان تھی اس کے گلے لگ کے پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔

"آخر دھی رانی کو ہوا کیا نذیراں؟" ماسی نے پریشان ہو کے اسے پوچھا۔

"میں کیا کہوں۔ ہو سکتا ہے شیرے نے کچھ کہا ہو اب شام کو آئے تو پوچھتی ہوں۔" نذیراں نے موڑا اس کے پاس رکھا اور صورت کے کندھے پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ ماسی اور ساس کی طرف سے ملنے والی ممتا بھری چاہت سے اسے کچھ ڈھارس ہوئی۔ تو وہ روتے روتے خاموش ہو گئی۔ اس کی طرف سے تسلی ہو جانے پر ماسی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلتی ہوں اب نذیراں گھر میں کام چھوڑ کے آئی ہوں۔ تم بالے سے بات کر لینا اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو بتا دینا۔ ہم عزت دار لوگ ہیں۔ عزت کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔" چادر پکڑتی ماسی نے صورت کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور نذیراں کو دیکھتے باہر قدم بڑھا دیے۔ صورت کے واویلے سے پائل جو کمرے میں گم صم بیٹھی خود پر بیتی بپتا پر توجہ کناں تھی۔ آہستہ روی سے چلتی باہر آ گئی۔ اور خاموشی سے کسی مجرم کی طرح چارپائی پر بیٹھ گئی۔ نذیراں نے لاپرواہی سے اسے دیکھا اور کمرے کی طرف منہ کر کے بیٹے کو آواز دی۔

"بالے...... او بالیا۔" نذیراں نے صحن سے اسے پکارا۔ ماں کی کرخت آواز پر بالا آنکھیں ملتا اٹھ بیٹھا۔

باہر صورت کو بری طرح روتے دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا۔ پاس ہی بیٹھی پائل کا اترا چہرہ اسے بہت کچھ باور کروا گیا۔

"ہاں اماں...... کیوں صبح صبح شور کر رہی ہو۔" نذیراں کچھ دیر بالے کو دیکھتی رہی۔

"جانتے ہو ماسی آئی تھی ابھی۔" وہ گھوری۔

"کیوں......" بالے نے پورا منہ کھول کے جماہی لی۔

"اس نے صبح صبح تمہیں اور تمہاری ووہٹی کو بیٹھک سے نکلتے دیکھا۔ تو وہی پوچھنے آئی تھی۔" جماہی لیتا بالا وہی رک گیا۔

"پھر......؟ تم نے کیا کہا اماں۔" وہ بے چینی سے بولا۔

"اسے چھوڑ پرے یہ بتا۔ کل والے کام کا کیا بنا۔" ماں کی بات پر بالا مسکرایا اور سر کھجاتے ہوئے ماں کو آنکھ ماری۔

"کمینہ بڑی مشکل سے مانا ہے اماں! جو کام ابا اتنے سالوں سے نہ کروا سکا۔ میں نے دو گھنٹوں میں کروا لیا۔ مگر وہ اتنا ڈھیٹ ہے کہ دوبارہ آنے کا

بول رہا تھا۔"

"چل کام تو ہو گیا ناں۔" نذیراں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔" اس نے ہاتھ نچا کے منہ بنایا۔

"سن......اب کب کا کہا ہے اس نے۔" اس نے آنکھیں مٹکائیں۔

"اب صرف سائن کروانا باقی ہیں اماں۔ بس وہ ایکبار ہو جائیں۔" اس نے ہاتھ ملے۔

"چل فکر نہ کر۔" وہ چہکی۔

"وہ بھی جلد ہو جائیں گے۔ یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے۔ چوہدری دس بارہ دن میں سائن کر دے گا۔ وہ مطمئن انداز میں بالے کی طرف دیکھتی بولی۔

نذیراں کو پائل پتھرائی آنکھوں سے ایسے دیکھ رہی تھی جیسے کوئی خواب ہو۔ دل نے کہا۔

کیا یہ الہام ہے؟ دماغ نے کہا۔

"نہیں......یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا۔ یہ بالکل ناممکن ہے۔ اندر کہیں ہلچل سی مچی۔ یہ کیسی سماعتوں کو دھوکہ دیتی خبر سنی۔ اسے یقین نہ ہو پا رہا تھا۔ یقین آتا بھی تو کیسے۔ اس کے سامنے کا ماجرا اب تو عام تھا۔ وہ دو ماہ سے یہی سمجھتی رہی کہ بالا کمینہ و گھٹیا ہے۔ مگر یہاں معاملہ الٹ تھا۔ ایک عورت ایک ماں کیسے دوسری عورت کی عزت کی بولی لگا رہی تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی۔ وہ دیکھ سکتی تھی۔ کیسے عزت تار تار کی جاتی ہے۔ صرف چند بیگھہ زمین کی خاطر کیسے گھر کی عزت نیلام کروائی جاتی ہے۔

کیسے ایک نام نہاد شوہر بیوی کو دوسرے شخص کے بستر کی زینت بنا کر اپنی ہی غیرت کا جنازہ نکالتا ہے اور ماتھے پر غیرت کا پسینہ تک نہیں۔ جس سہاگن کا مرد اس کی زندگی میں رنگ نہ بھرے اس کا دل چھالے کی طرح ہوتا ہے۔ عورت کی زندگی کا یہی موڑ ہوتا ہے جب یا تو وہ سیراب ہو جاتی ہے۔ یا ہمیشہ کے لیے تہی داماں......اور پائل تہی داماں رہ گئی تھی۔

"اگر تم دونوں نے ایک لفظ بھی منہ سے نکالا یا گھر سے باہر کسی سے بات کی تو سارے خاندان کی بوٹیاں کروا کے دریا میں ڈلوا دونگی......سمجھی۔ نذیراں کے بدلتے تیور اس کی گھناونی سوچ سے پائل سہم سی گئی۔

"ارے تم لوگ کونسے عزت دار ہو۔ ہم جیسے لوگوں کا کھا کر انہی کی شکایت کرو گے۔ تو وہ حال کرونگی کہ زمانہ دیکھے گا۔ اور سن......!" وہ تحکم سے بولی۔

"اس گونگی کو اپنی زبان سے سمجھا دے۔ اگر کسی کے سامنے آکر دوبارہ ڈرامہ کیا تو انجام بہت برا ہو گا۔ اگر اتنی ہی عزت اور غیرت والے ہو تو باپ سے کہو کہ تم دونوں کی جتنی رقم دی ہے وہ واپس کر دے اور لے جائے اپنے پاس، ہمارے گھر میں تم جیسی طوائفوں کی کوئی جگہ نہیں۔" اس نے جیسے دھماکہ کیا۔ زہر اگلا تھا یا پگھلا سیسہ کانوں میں انڈیلا گیا تھا۔ پائل پتھرا سی گئی تھی۔ جو سنا......کیا وہ سچ تھا یا خواب......

"اففف......! اتنا بڑا انکشاف......کاش! زمین پھٹتی اور وہ دونوں اس میں دفن ہو جاتیں۔ اسے یاد آیا کہ کیسے فائزہ نے ڈیڑھ دن میں فیصلہ کیا۔

کیوں کیا۔ اب وہ جان چکی تھی۔ مگر باپ؟؟ کیا باپ ایسے ہوتے ہیں۔؟ بیٹی کے لیے باپ ایک محافظ ہوتا ہے۔ جو ہر دکھ میں چٹان کیطرح سامنے ڈٹ جاتا ہے۔ بیٹی پر اٹھنے والی انگلی کو روک کر اس کا راہبر بنتا ہے۔ لیکن۔ یہاں۔ آنسو آنکھوں میں جم

سے گئے۔ کس سے پوچھتی۔ کس سے فریاد کرتی۔
جب اپنے ہی انسانیت کی حدیں پار کر لیتے ہیں تو کوئی سکیورٹی کام نہیں آتی۔ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ وہ دونوں تہی دامن تھیں۔ اب کوئی سایہ نہ تھا۔ میکہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔
سوچا اب بھی کچھ نہیں بگڑا تھا۔ وہ ساس کو سب کچھ بتا دے۔ آخر وہ بھی عورت ہے اور عورت کا دکھ وہ نہیں سمجھے گی تو کون سمجھے گا۔ اس نے ہمت باندھی۔ سوکھے گلے میں تھوک نگلی۔ اماں! وہ جھجکی۔
میرا کوئی قصور نہیں اماں! وہ منمنائی۔ وہ بالے نے مجھے زبردستی۔ بات ابھی منہ میں تھی کہ نذیراں چیل کی طرح اس پر جھپٹی۔
بس زبان کھینچ لونگی تیری۔ غضب ناک ہوتے اس نے تابڑ توڑ طمانچہ رسید کیا۔
نمک حرام۔ ذلیل۔ نیچ ذات۔ ہمارا کھایا اور ہمارے خلاف بولو گی۔ مردار! تیری ہمت کیسے ہوئی میرے بیٹے کا نام اپنی گندی زبان سے لیتے ہوئے۔ تیری تو کھال کھینچ لوں گی۔ سارے گاؤں میں منہ مار کے میرے معصوم بیٹے کو بدنام کرتی ہے۔
پاگل کو مار کھاتے دیکھ کر صورت اسے بچانے کو آگے بڑھی جسے بالے نے بالوں سے دبوچ کے بانہوں کا گھیرا تنگ کر لیا۔ نہ آسمان پھٹا نہ زمین ظلم و بربریت کا وحشیانہ کھیل شروع ہو گیا۔
تین چار دن ایسے ہی گزر گئے۔ منہ پر لگے نیل کے نشان سوجی آنکھوں کو دونوں بہنیں دیکھتیں تو تقدیر پر نوحاں کناں ہوتیں۔ بچپن سے ماں کے سائے سے محروم ماں کی محبت سے نا آشنا ماں کا لمس پانے کو سوتیلی ماں کے لالچ کی بھینٹ چڑھ گئیں۔
اب کس سے فریاد کرتیں۔ کس سے دکھڑے کہتیں کہ مائیں نی میں کینوں آکھاں۔
بات چھپنے والی نہ تھی۔ گاؤں میں چپکے چپکے سرگوشیاں سننے کو ملنے لگیں۔ نذیراں نے کسی حیلے بہانے سے لوگوں کو اپنے گھر سے دور رکھا۔ ادھر بالا متواتر چوہدری کو خوش کرتا رہا۔ اور ادھر نذیراں متواتر پلان بناتی رہی۔
ایک ہفتہ امی کے بغیر کاٹنا انتہائی کٹھن تھا۔ زارا ابھی گھر سنبھالنے کے قابل نہ تھی۔ میں خود صبح جاتا اور شام تلک واپس آتا' خدا خدا کر کے دس دن گزرے۔ امی اور امینہ کراچی سے گھر آ گئیں۔ سچ کہتے ہیں جس گھر میں ماں نہیں وہ گھر گھر نہیں۔ ایک دو دوستوں سے نازش کے سلسلے میں بات کر رکھی تھی۔ ایک طرف سے کچھ امید تھی۔ صبح اسی سے بات کرنے جانا تھا۔
" صبح سویرے اٹھنے کی عادت نے مجھے ہمیشہ چاک و چوبند رکھا تھا۔ آج بھی دو جگہ پر کام تھا۔ سوچا پہلے نازش کے کام کی بات کر لوں پھر اپنے کام کے لیے چلا جاؤں گا۔ دونوں بہنوں کے ایگزام شروع تھے۔ پہلے انھیں چھوڑنا تھا۔ امی نے جلدی سے میز پر ناشتہ لگایا۔ میں اور ابو بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے زارا اور امینہ کالج کے لیے تیار ہو رہی تھیں کہ گلی سے شور اٹھا۔ امی یکدم گھبرا گئیں۔
یا اللہ یہ کیا ماجرہ ہے۔ اتنی صبح صبح۔ خدا خیر کرے۔ ابو نے امی کو حوصلہ دیا اور مجھے اشارہ کیا کہ باہر جا کے دیکھوں۔ میں سرعت سے اٹھا اور باہر کا رخ کیا۔
نعیم انکل کے دروازے پر لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر میں ٹھٹکا۔ ادھر ادھر دیکھا کہ کسی سے پتہ کروں۔ ساتھ والے انکل کامران پر نظر پڑی تو انکی طرف بڑھا کہ پوچھ سکوں۔ مجھے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر انکل نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے ان کا ہاتھ تھاما۔
اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھتا۔ وہ خود ہی

بول اٹھے۔ آج صبح صبح فہیم صاحب کی بڑی بیٹی کا انتقال ہوگیا۔ بڑی پیاری اور سمجھدار بچی تھی۔ انھوں نے ٹھنڈی آہ بھری۔ مگر میں نے سنا کب؟؟؟۔ حیرت سے انھیں یوں دیکھا۔ جیسے وہ کسی اور موضوع پر بات کر رہے ہوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ابھی پندرہ دن پرلے ہی تو ملاقات ہوئی تھی۔ اور وہ دیکھنے میں بالکل ٹھیک لگ رہی تھی۔ ہاں۔ کچھ پریشان لگی۔
لیکن یوں اچانک مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ وہ انکل اور نجانے کیا کیا کہہ رہے تھے۔ میں پلٹا اور تھکے قدموں گھر والوں کو بتانے کے لیے چل پڑا۔ میرے کانوں میں اس کے الفاظ گونج رہے تھے۔
بیٹے۔ آنٹی نے شاید آپ سے بات کی ہو کام کے سلسلے میں۔ میں سر جھکائے گھر داخل ہوا اور ابو کو اس سانحے کے بارے بتایا۔ ابو کے ساتھ امی بھی یکدم شاکڈ ہوئیں۔
"اتنی پیاری اور صابر بچی تھی۔ دیکھو بھلا۔ یہ کوئی عمر تھی جانے کی۔ اس موئی بیماری نے جان لیکر چھوڑی۔ وہ بہت افسردہ ہوئیں۔ ماں کی طلب اسے ماں کے پاس ہی لے گئی۔ بس بیگم! اوپر والے کی یہی مرضی تھی۔
ابو نے امی کو تسلی دی۔ جو لوح قلم پر جتنی عمر لکھوا کے آیا ہے اس نے اتنا وقت گزار کے واپس لوٹ جانا ہے۔ یہی مشیت ایزدی ہے۔ جسے نہ تو کوئی روک پایا ہے اور نہ روک پائے گا۔ وہ بھی پریشان ہوئے۔
"قاسم بیٹا! تم ایسے کرو۔ بہنوں کو کالج چھوڑ دو ان کے امتحان ہیں۔ اور تم اپنے آفس فون کر کے بتا دو۔ کہ تم آج نہیں آسکتے۔ میرے خیال میں فہیم صاحب نے ظہر کیبعد تدفین کا انتظام کیا ہوگا۔ ہمیں ساتھ جانا ہوگا۔
ٹھیک ہے ابو! میں نے مدھم لہجے میں جواب دیا۔ سچ کہوں تو میرا خود کا دل جانے کو نہ چاہ رہا تھا۔ نجانے کیوں وہ چہرہ میری آنکھوں سے اوجھل نہ ہو پار ہا تھا۔ میرے اندر سے اک ٹھنڈی آہ نکلی۔
مجھ پر اسی وقت یہ تدارک ہوا۔ کہ مجھے اس سے محبت ہو چکی تھی۔ لیکن کب نہیں جانتا۔ نہ تو میں نے وعدے وعید کیے۔ نہ قسمیں کھائیں۔ نہ آج کل کے چھچھوڑوں کی طرح خط و کتابت کی۔ بغیر اظہار کے کسی کو پسند کرنا۔ چاہنا۔ انسان کے خود کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ میری محبت پاکیزہ تھی۔ جسے شاید وہ بھی نہ جانتی تھی۔ زارا کی آواز پر سوچوں کے گرداب سے باہر نکلا۔ دونوں بہنیں کالج کے لیے تیار تھیں۔ انھیں چھوڑنے کے بہانے جلدی سے باہر کا رخ کیا۔ مبادا میری آنکھوں میں تیرتا نمکین پانی کوئی دیکھ نہ لے۔
"ظہر اور عصر کے درمیان نازش کو آخری آرام گاہ تک پہنچا کے میں بھی دوسروں کی طرح غم سے نڈھال یہ سوچتا واپس آگیا۔

کوئی منظر سدا نہیں رہتا
ہر تعلق مسافرانہ ہے

تین چار دن اسی حادثے میں گزر گئے۔ ایک ہفتے تک ہمارے گھر سے کھانا انکی طرف جاتا رہا۔ ہمسایہ ہونے کے ناطے ہم ان کے غم میں برابر کے شریک تھے۔ وقت کی رفتار کے ساتھ آہستہ آہستہ زخموں پر کھرنڈ جمنے لگے۔
لیکن اکثر بھولی بسری یادیں وہ میرے حواسوں پر چھائی رہتی۔ سچ کہتے ہیں پہلی محبت کو بھلانا آسان نہیں ہوتا۔ لیکن یہ بھی سچ ہے۔ وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ جو ڈھیرے ڈھیرے بڑے سے بڑا غم بھلانے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ سو۔ اس حادثے کو ایک سال ہو گیا اور ہم تقریباً بھول ہی چکے تھے کہ اچانک آنٹی ثمینہ نے ٹھہرے پانی میں کنکر

پھینک دیا۔
"دروازہ کب سے کھٹکھٹانے کی آواز آ رہی تھی۔ زارا اور امینہ ٹی وی پر لگا ٹاک شو دیکھنے میں اتنی مگن تھیں کہ دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز کو کانوں تک رسائی نہ پہنچ رہی تھی۔ میں کمرے میں سویا ہڑ بڑا کے اٹھ بیٹھا۔ امی واش روم میں تھیں۔
میں جلدی سے اٹھا اور جا کے دروازہ کھولا۔ سامنے ثمینہ آنٹی پریشان چہرہ لیے کھڑی تھیں۔
السلام وعلیکم۔ وہ باجی گھر پر ہیں۔ وہ عجلت میں بولیں۔ ایک سال پرلے کا منظر نگاہوں میں گھوم گیا۔ خیالات کو سر سے جھٹکتا آنٹی کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ اندر داخل ہوتیں ادھر ادھر دیکھتیں صوفے پر بیٹھ گئیں۔ میں زارا کو چائے کا کہنے دوسرے کمرے میں چلا آیا۔
بس باجی! کیا بتاؤں۔ اس عورت نے تو ناک میں دم کر رکھا ہے۔ جب سے فہیم بھائی کی زندگی میں آئی ہے۔ گھر دوزخ بن گیا ہے۔
وہ بیحد پریشان تھیں۔ اتنے بڑے حادثے کے بعد بھی فہیم بھائی عقل سے پیدل ہیں۔ باجی۔ مجھے تو پکا یقین ہے اس عورت نے نازش کو کچھ کھلا دیا تھا۔ بیماری ایسی نہ تھی کہ راتوں رات وہ مر جاتی۔ پھر ڈاکٹر سے معائنہ بھی نہ کروانے دیا کہ یکدم اسے ہوا کیا۔ بس دفنانے کی پڑ گئی۔ فہیم بھائی کو لاکھ سمجھایا مگر وہ سمجھتے نہیں۔ اب بھی ویسا ظلم کر رہے ہیں۔ ندیم نے منع کیا تو لڑ پڑے۔ اب رات سے دونوں بھائیوں میں بول چال بند ہے۔ فہیم بھائی ایک انچ ہٹنے کو تیار نہیں۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کروں۔ آپ لوگ کچھ مدد کر سکتے ہیں تو کر دیں۔ یہ شادی رکوا دیں۔ آج مغرب کے بعد دونوں بہنوں کا نکاح ہے۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔
پانی پینے کچن کی طرف آتے ہوئے آنٹی کی بات پر میں رک گیا۔ ساتھ ہی رخصتی۔ وہ دوبارہ بولیں۔ ہمارے لاکھ منع کرنے کے باوجود دونوں اپنی ضد سے ہٹنے کو تیار ہی نہیں۔ بچیاں اتنی سمجھدار نہیں کہ انکار کر سکیں۔ اسی لیے آپ کے پاس آئی ہوں کہ آپ لوگ انھیں سمجھائیں۔ کہ اتنی چھوٹی عمر میں ان کے ساتھ یہ ظلم نہ کریں۔ صورت ابھی سولہ کی اور پائل چودہ کی ہے یہ عمر شادی کی نہیں ہے۔ ثمینہ آنٹی فکر مندی سے امی کو بتا رہی تھیں۔
مگر ثمینہ! امی یک لخت بولیں۔ ہمارا ان لوگوں سے ایسا کوئی رشتہ نہیں بنتا کہ انھیں سمجھا سکیں۔ ایک ہمسایہ ہونے کے ناطے انسانی ہمدردی میں بات کر بھی لیں تو وہ لوگ مانیں گے نہیں۔ جو سگے بھائی کی بات نہیں مان رہے تو ہمیں کیسے عزت دیں گے۔ امی نے سمجھایا۔
باجی آپ بھائی سے بات تو کر کے دیکھیں شاید وہ لوگ مان جائیں۔ ثمینہ آنٹی نے اب باقاعدہ رونا شروع کر دیا۔ ٹھیک ہے تم روو نہیں میں ابھی بات کرتی ہوں۔ سدا کی نرم دل امی کا فوراً دل پسیجا۔ انھوں نے آنٹی کو دلاسہ دیا۔ ابو کو فون پر ساری بات تفصیل سے بتانے پر امی چند منٹ خاموشی سے سنتی رہیں پھر خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔
دیکھو ثمینہ! امی گویا ہوئیں۔ میرے بھی کان کھڑے ہوئے۔ قاسم کے ابو کو یہ بات مناسب تو نہیں لگی۔ مگر پھر بھی وہ جانے کو تیار ہو گئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے ہمارے جانے پر کہیں تم لوگوں پر کوئی آفت نہ آ جائے۔ تو کل کو ہمیں شکایت نہ کرنا۔ امی نے دوٹوک بات کی۔
نہیں باجی! ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا۔ بس ایک بار فہیم بھائی مان جائیں۔ ثمینہ آنٹی کو اور کچھ نہ سوجھا خوشی سے بولی۔

زارا! امی نے زارا کو آواز دی۔ میں جلدی سے ایک طرف ہو گیا کہ کہیں کسی کی نظر نہ پڑے۔ جی امی! زارا نے کمرے میں جھانکا۔

زارا بیٹی! میرے کمرے میں نیلے رنگ کی کروشیاء کی چادر پڑی ہے۔ زرا وہ لے آو۔ سامنے آنٹی کے گھر جا رہی ہوں۔ کچھ دیر لگے گی۔ تم ایمنہ کیساتھ مل کر آٹا وغیرہ گوندھ لینا۔ انھوں نے ہدایت دی۔ ٹھیک ہے امی۔ زارا نے چادر لا کر امی کو دی۔

امی ثمینہ آنٹی کیساتھ ہی باہر نکل گئیں۔ عجیب صورت حال تھی۔ فہیم انکل دیکھنے میں اتنے بیوقوف نہیں لگتے تھے جتنے بیوی کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنے تھے۔ خیر۔ انسانی ہمدردی کے تحت دل سے یہی دعا نکلی کہ ان کے ساتھ اچھا ہی ہو۔ نازش سے جڑے رشتے کے ناطے خود بخود ان سے ہمدردی پیدا ہو چکی تھی۔

امی کو گئے ابھی ایک گھنٹہ بھی نہ ہوا تھا کہ وہ ابو کیساتھ واپس آتی نظر آئیں۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کے دروازہ کھولا۔ امی کیساتھ ابو کو بھی پریشان پایا۔ دونوں اندر خاموشی سے داخل ہوئے۔ زارا بیٹی! ابو کے لیے چائے کا کپ بنا دو۔

ڈرائینگ روم میں بیٹھتے ہی امی نے زارا کو آواز دے دی۔ میں بھی پیوں گا زارا۔ میں نے چھوٹتے ہی زارا کو کہا۔ اب والدین کے پاس بیٹھ کے ہی سن سکتا تھا۔ کہ ان لڑکیوں کے بارے کیا فیصلہ ہوا۔ میں نے تو پرلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ عورت مانے گی نہیں۔ وہ بہت پرلے کی لڑکے والوں سے ساز باز کر چکی ہے۔

مجھے تو فہیم پر حیرت ہوئی ہے بیگم کہ اپنی اولاد کیساتھ اتنا بڑا ظلم کیسے کر سکتا ہے۔ ابو نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ اسی بات کا تو دکھ ہے۔ کہ اسے کسی کی سمجھ ہی نہیں آ رہی۔ تو سمجھے گا خاک۔ اب امی غصے سے بولیں۔ مجھے تو قاسم کے ابو اس بات پر دکھ ہے کہ صورت سننے اور بولنے سے معذور ہے۔ پائل چودہ سال کی ہے۔ وہ جو کوئی بھی ہیں۔ صورت کے لیے مان کیسے گئے۔ آج کل کے دور میں اچھی بھلی لڑکی کو لوگ کیڑے ڈال دیتے ہیں۔

صورت کے پاس سوائے شکل کے کچھ بھی نہیں۔ کہیں وہ لوگ دھوکے باز نہ ہوں۔ امی فکرمندی سے بولیں۔ کیا کہہ سکتے ہیں بیگم! اب تو دعا ہی کر سکتے ہیں۔ بن ماں کی بچیاں ہیں اللہ ان کے نصیب اچھے کرے۔"

آپ پولیس میں شکایت کر دیں۔ امی اچانک بولیں۔ کیسی باتیں کرتی ہیں ہم بھلا کیا کہیں گے۔ باپ زندہ ہے۔ چاچی چاچا بقید حیات ہیں۔ جب وہ کچھ نہیں کر سکتے تو ہم کون ہوتے ہیں۔ اب آپ اپنی رحم دلی کو سلا دیں۔ ان لوگوں کے لیے ضائع مت کریں۔

جنھیں اپنے اچھے برے کا پتہ نہ ہو۔ اور بس اب یوں سمجھ لیں بیگم۔ کچھ لوگوں کو تقدیر دکھ سہنے کے لیے چن لیتی ہے۔ ابو نے ٹھنڈی آہ بھری۔ امی ابو کی باتیں سن کے مجھے بھی پریشانی لاحق ہوئی۔ مگر کچھ کر نہیں سکتے تھے۔

"محلے میں کسی کو مدعو کرنا تو درکنار، کسی کو پتہ تک نہ چلا۔ شام کو دونوں لڑکیوں کو نکاح کے بندھن میں باندھ کے رخصت کر دیا گیا۔ گنتی کے چھ لوگ تھے۔ صرف گواہوں کی شکل میں۔ "وقت کا کام ہے گزرنا۔ بس وہ گزرتا چلا جاتا ہے۔ میری نوکری بھی اب پکی ہو گئی تھی۔ اب امی کو میری شادی کی فکر ستانے لگی۔ تو ابو نے قرعہ اپنے بڑے بھائی کی بیٹی ایرج کے نام نکالا۔ جس نے حال ہی میں ایم اے میں فرسٹ ڈویژن لیکر نمایاں کامیابی حاصل کی تھی۔ ایرج کو گھر میں سبھی پسند کرتے تھے۔ وہ تھی بھی

ایسی۔خوش اخلاق وملنسار۔ عادت و اطوار کی بھی اچھی تھی۔ ماضی کی حسین یادوں کو دل کے نہاں خانے میں چھپا کے میں نے فرمانبردار لڑکوں کی طرح سر جھکا لیا۔ کہ ماضی کریدنے سے

سوائے راکھ کے کچھ حاصل نہ تھا۔اور میں پورے خلوص کیساتھ ایرج کو اپنانا چاہتا تھا۔ کیونکہ۔

"طویل انتظار چھوڑ جاتا تھا۔

یوں تیرا مختصر سا یاد آنا۔

"فروری کے اوآخر میں نذیراں کی بڑی بہن قریب کے گاوں سے آرہی تھی۔وہ گاؤں کے منشی کی بیوی تھی۔نذیراں نے اپنی ساکھ کو مضبوط کرنیکے لیے سارے گاوں میں مشہور کر رکھا تھا۔کہ اس کی بہن پڑھے لکھے منشی سے بیاہی گئی ہے۔ سارے گاوں کے کھاتے اسی کے مرہون منت ہیں۔ جیسے وہ علاقے کا منشی نہیں۔ ڈپٹی کلکٹر لگا ہو۔

اور سارے گاوں والے اپنی جاہلیت میں اسے سر آنکھوں پر بٹھاتے۔ نذیراں پرلے سے زیادہ زور وشور سے مہمانوں کی آو بھگت کا پروگرام بنا رہی تھی۔ شام تک مہمانوں کی آمد متوقع تھی۔ صورت اور پائل گھن چکر بنی سارے گھر میں پھرکی کی طرح گھوم رہی تھیں کہ مہمانوں کے لیے کوئی کمی نہ رہ جائے۔موسم رات کو سرد ہو جاتا۔جو کھیس پیٹیوں میں بند کر کے رکھ دیے تھے۔

انھیں دونوں بہنوں نے نکال کے دھوپ میں رکھ دیا۔پائل نی پائل! نذیراں کی آواز پر ہاتھ میں پکڑا آم اور لسوڑھوں کا اچار دھوپ میں رکھتی پائل جلدی سے اندر دوڑی۔ صبح جو بادام دیے تھے وہ توڑ لئے سارے کہ نہیں۔

کشمش اور کھوپرہ کوٹا ہے کہ وہیں پڑا ہے۔ جی وہ کر لیا ہے وہ پھولی سانس سے بولی۔دو گھنٹے تک میری بہن آرہی ہے اس کے آنے سے پرلے سوجی بھی بھوننی ہے۔اسے سوجی کا حلوہ بہت پسند ہے۔ جلدی جلدی کام نپٹاو۔اس نے حکم جاری کیا۔ اور دیکھنا۔

تندور کے لیے لکڑیاں کتنی رہ گئی ہیں کم ہیں تو شیرے سے کہہ کر اور منگوا لے۔اس نے بڑے بیٹے کا نام لیا۔جی اماں! ابھی دیکھتی ہوں وہ پلٹی۔اے سن! وہ گونگی کو زرا اندر بھیج۔ مجھے سر میں دیسی گھی لگا دے۔ سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔ وہ لیٹتے ہوئے بولی۔

چل جا اب کہ سر پر سوار رہے گی نکمیاں کہیں کی۔ نہ کام کی نہ کاج کی۔وہ پاوں پساڑتے سیدھی لیٹ گئی۔اور پائل سمجھ نہ آنے والے محاورے سنتی ہونقوں کی طرح گردن ہلاتی باہر نکل گئی۔

نذیراں کی بہن جب بھی گاوں آتی وہ افراتفری مچا دیتی۔ کبھی کچھ پک رہا ہے اور کبھی کچھ۔مگر بہوؤں کے حصے میں وہی بچا ہوا کھانا۔ سارا دن مشقت کر کے تھکے جسموں کو وہ چارپائی پر ایسے پٹختیں کہ جیسے پرلی بار بستر دیکھا ہو۔

لیکن اماں نذیراں پھر بھی ناخوش رہتی۔ اور اسے جس سے خوشی حاصل ہوتی۔ وہ سوچ کے انھیں کراہیت ہوتی۔

" رات نو کے قریب مختاراں چار جوان بیٹوں کیساتھ گھر کے صحن میں داخل ہوئی۔نذیراں نے بڑھ کے اس کا خیر مقدم کیا۔

جی آیا نوں خالہ! شیرے نے مونچھوں کو بل دیا۔خیر تے ہے پتر! وہ مسکرائی اور بہن کے گلے لگ گئی۔سب صحن میں بچھی چارپائیوں پر ہی بیٹھ گئے۔ پائل اور صورت جلدی سے باداموں والا دودھ اور گلاس لے آئیں۔

سلام خالہ! پائل نے جھک کے سلام کیا۔ وعلیکم السلام دھی رانی۔ کیسی ہو تم دونوں۔ وہ تفاخر سے مسکرا

کے بولی۔ٹھیک ہیں خالہ۔وہ منمنائی۔خالہ نے اس کے ساتھ صورت کے سر پر ہاتھ رکھتے غور سے اسے دیکھا۔یہ شکلوں پر بارہ کیوں بج رہے ہیں دونوں کے۔وہ تولتی نظروں سے انھیں دیکھنے لگی۔

ہونا کیا ہے وڈ کی۔نذیراں یکدم بولی۔باہر نکلنا چاہتیں ہیں۔اب گاوں کے چھوڑے انھیں عجیب اور میلی نظروں سے دیکھیں گے تو شیرے اور بالے کی غیرت تو جاگے گی ناں۔تو روز روز لڑائیاں ہی ہونگی۔میں نے باہر جانے سے منع کر رکھا ہے۔اس لیئے منہ بنالیا ہے دونوں نے۔اب دیکھوناں وڈ کی! اب یہ ہمارے گھر کی عزت ہیں۔

اب ان کی طرف کوئی میلی نظر سے دیکھے گا۔تو ہم کیسے برداشت کریں گئے۔نذیراں نے مسکین شکل بناتے بہن کو دیکھا۔

بات تو ٹھیک کہہ رہی ہو نذیراں! اسی وجہ سے بڑے بھاں نے شہر میں شادی سے منع کیا تھا۔گاوں میں بھی لڑکیاں تھیں۔لیکن پتہ نہیں تمہارے من میں کیا سمایا کہ شہر سے مصیبتیں اٹھالائے۔مختاراں نے دل میں آئے حسد سے اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔اس کے چاروں لڑکوں کو بھی آوارہ مزاجی کے چکر میں کوئی لڑکی نہ دے رہا تھا۔اب بھڑاس تو نکالنی تھی۔

کیا کہوں وڈ کی! اب ان کی وجہ سے گھر میں ہر وقت جھگڑا رہتا ہے۔ہائے میں کہاں پھنس گئی۔نذیراں نے باقاعدہ بہن کے سامنے سینہ کوبی کی۔پائل کیساتھ صورت بھی اس کی مکاری کو خوفزدہ وسہمی نظروں سے دیکھنے لگی۔

اب یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو۔دیکھ نہیں رہیں مہمان آئے ہیں۔روٹیاں بناو جاکے۔نذیراں کے حکم پر لبیک کہتیں دونوں تیزی سے تندور پر روٹیاں بنانے پر جت گئیں۔رات کھانے سے فراغت کے بعد دونوں بہنیں باتیں کرتی رہیں۔مختاراں باتیں کرتی کرتی سوگئی۔

"اماں! اب کیا ارادہ ہے۔اب تو خالہ بھی سوگئی ہے۔ان دو دنوں میں کام کرنا ہے۔نہ کیا تو گاوں میں تھوڑی بات پھیل گئی ہے۔زیادہ ہونیسے پر لے عزت بھی بچانی ہے اور کام بھی پایہ تکمیل تک پرنچانا ہے۔بالا خالہ کے سونے کے بعد ماں سے کھسر پھسر کرنے لگا۔

فکر نہ کر بالے۔کل شام تک ہو جائے گا۔تم بس ویسے کرنا جیسے کہا گیا ہے۔

فکر نہ کر اماں! سب انتظام برابر چیک کر رہا ہوں۔پر اماں! ایک بات سمجھ نہیں آئی۔وہ سر کھجاتے بولا۔جب چھوٹا تندور ہے تو بڑا تندور دہکانے کی کیا ضرورت ہے۔چپ آہستہ بات کر۔نذیراں نے اسے گھورا۔جب معاملہ نبٹ جائے گا تب خود ہی سمجھ جاوگے۔

بس وڈ کی کو خبر نہ ہو۔ہمارے پلان کی۔ایک وہی اور اس کے بیٹے ہماری بیگناہی کے گواہ ہونگے۔نذیراں نے کانا پھوسی کرتے اسے تنبیہ کی۔اور ویسے بھی جس مقصد کے لیے انھیں بیاہ کے لائے تھے وہ پورا ہو چکا ہے۔اب انکی ضرورت نہیں رہی۔وہ بھنوئیں سکیڑ کے بولی۔سمجھ تو گئے ناں۔ہاں اماں! اس نے سینہ پھلایا۔تیری بھی کوئی بات غلط ہوئی کبھی۔جواب ہوگی۔بس۔تو پھر ویسے کرتا جا۔جیسے کہہ رہی ہوں۔

تو فکر ہی نہ کر اماں۔میں ہوں ناں۔بالے نے پر غرور لہجے میں جواب دیا۔

چل جا! اب سوجا۔صبح تڑکے تڑکے اٹھنا ہے۔وہ صحن کے ایک کونے میں لیٹی بالے سے راز و نیاز کر رہی تھی۔

"ساری رات صورت اک انجانے خوف سے

جاگتی رہی۔ نجانے ساس کی آنکھوں میں کیا تھا وہ سمجھ نہ پا رہی تھی۔

"تجھے کیا ہوا۔ تو کیوں بت بنی بیٹھی ہے۔ صبح سویرے کمرے سے نکلتی مختاراں نے صحن میں بچھی چارپائی پر بیٹھی صورت کو دیکھتے ہوئے کہا۔ مگر نہ سننے کے سبب اس کے قریب جا کیا اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ صورت نے چونک کے اسے دیکھا مگر کوئی تاثر چہرے پر نہ ابھرا۔ مختاراں نے اشارے سے پائل کے بارے پوچھا۔

تو وہ باہر دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ سمجھ نہ آنے کے سبب مختاراں کندھے اچکاتی وہیں پاس پڑی چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"کچی گلیوں کی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو اپنے اندر جذب کرتے وہ حقے کو گڑگڑانے لگی۔ پرندوں کی چہچہاہٹ فضا میں نغموں کا کام دے رہی تھی۔ گھروں سے اٹھتے دھوئیں اور گندم کی روٹی کی اشتہا انگیز خوشبو چاروں طرف پھیلی تھی۔

"ناشتے میں نذیراں نے چاٹی کی لسی۔ اور پنیر کے تازہ تازہ پراٹھے بنانے شروع کیے۔

مختاراں اٹھ کے اس کے پاس ہی موڑھے پر بیٹھ گئی۔

اسے کیا ہوا ہے۔ صبح سے عجیب روکھے پھیکے انداز میں نظر آ رہی ہے۔

ہونا کیا ہے۔ بس ایسے ہی پچھلوں کا سوگ ڈال کے بیٹھی رہتی ہیں دونوں۔ کبھی یہ اور کبھی چھوٹی۔ اب میں اکیلی جان کیسے سارے گھر کا بوجھ سنبھالوں۔ اب دیکھ لو وڈی کی! تندور میں روٹیاں تک تو ان سے لگتی نہیں۔ مجھے ہی بتانا پڑتا ہے کہ ایسے کرو۔ ویسے کرو۔ آخر کب تک۔ جلی کٹی سنانے کے ساتھ نذیراں پلیٹیں بھر بھر پراٹھے وڈکی کے ہٹے کٹے بیٹوں کو مردانے میں بھجواتی جا رہی تھی۔ جو چند لمحوں میں چٹ کر جاتے۔

چھوڑ نذیراں! کیوں جان ہلکان کرتی ہے۔ مزے سے کھاتے اس نے لاپرواہی سے کہا۔

دونوں کے بچے نہ ہوتے تو کب کا فارغ کر چکی ہوتی۔ نذیراں نے دانت پیسے۔ جسے مختاراں نہ سن سکی۔

دوپہر تک دونوں بہنیں بیٹھی باتیں کرتی رہیں۔ کھانے کا انتظام ہوتے ہی مرد کھانا کھا کے باہر کھیتوں کی طرف نکل گئے عورتیں قیلولہ کی غرض سے کمروں میں آ گئیں۔

"مختاراں کو ابھی لیٹے آدھا گھنٹہ بھی نہ ہوا تھا۔ کہ باہر صحن میں چیخوں کی آواز نے دل دہلا دیا۔ وہ جلدی سے ہڑبڑا کے اٹھی اور ننگے سر اور ننگے پاؤں باہر کو دوڑی۔ باہر کا منظر دیکھ کے وہ پتھرا سی گئی۔ کتنے پل وہ ساکت کھڑی رہی۔

پھر یکدم پھرتی سے صحن میں رکھا پانی تندور میں ڈال دیا۔ لیکن تھوڑے سے پانی سے تندور کی پیاس کیسے بجھتی۔ اس کی پیاس تو خون سے بجھنی تھی۔ اب صورت کی چیخوں کیساتھ مختاراں کی چیخیں بھی شامل تھیں۔ جبکہ پائل کی چیخیں مدھم ہو گئی تھیں۔ "شور اسقدر ہوا کہ دور کھڑے چوہدری کے مزارے جو کھیتوں میں ہل چلا رہے تھے بھاگے آئے۔

لمحوں میں گاؤں کا گاؤں نذیراں کے گھر اکٹھا ہو گیا۔ غم سے نڈھال نذیراں پر غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ مختاراں ابھی تک سکتے کی سی کیفیت میں گم گم بیٹھی تھی۔ اور صورت۔ لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔ کیا بول رہے ہیں۔ کیا سننا چاہتے ہیں۔

اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اس بیچاری کے ہونٹوں پر بچپن سے لگا قفل بھی نہ ٹوٹ سکا۔ بس۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہر آتے جاتے کو دیکھتی رہی۔

دیوار سے ٹیک لگائے پائل کے بیٹے کو گود میں لیے خود سے بھینچے وہ اردگرد سے بے نیاز تھی۔اس کی نگاہوں میں وہ منظر جامد ہو چکا تھا۔جب وہ پانی بھرنے باہر نکلی۔تو بالے کو تندور کی طرف جاتے دیکھا۔اسوقت بالے کا تندور کی طرف جانا حیران کن تھا۔مگر وہ نظر انداز کرتی غسل خانے میں گھس گئی۔بالٹی اور ٹب بھرتے دس یا پندرہ منٹ کا وقفہ درکار ہوگا۔جونہی وہ بالٹی پکڑے باہر نکلی۔تندور کے اندر اٹھتے دھوئیں نے اس کے پاؤں جکڑ لیے۔

وہ حیرت سے بالٹی نیچے رکھتی آگے بڑھی۔مگر جونہی اس کی نظر تندور میں گری پائل پر پڑی۔وہ بیتابانہ آگے بڑھی۔مگر تندور کی چوڑائی اور گہرائی اتنی تھی کہ پائل تک اس کا ہاتھ نہ پہنچ سکا۔اس نے چیخنا شروع کر دیا۔اس کی چیخوں سے مختاراں اور نذیراں اٹھ کے باہر آگئیں۔مگر۔تب تک۔بہت دیر ہو چکی تھی۔پائل جل کے راکھ ہو چکی تھی۔

نہ کسی نے دیکھا۔کہ کیا ہوا۔کیسے ہوا۔کیوں ہوا۔اور نہ کوئی سمجھ سکا۔بس ہر ایک کی زباں پر توبہ۔افسوس جیسے لفظ دم توڑ رہے تھے۔چوہدری کے ساتھ مراسم مضبوط ہونے کی وجہ سے پولیس نے کیس آگے تک جانے نہیں دیا۔

موقع واردات پر جو دیکھا گیا۔وہی سچ مان کر عدالت میں ثابت کر دیا گیا کہ پائل کا پاؤں پھسلا اور وہ تندور میں گر گئی۔بس فائل بند۔اسطرح چوہدری کے ساتھ بالے کا چھپتا کھلنے کا جو امکان تھا۔وہ بھی ختم۔مجبور وبیکس سے فائدہ اٹھانے والے اپنی عیش پرستی میں بھول گئے کہ وہ انسانی جانوں سے کھیل رہے ہیں۔کتنا دوہرا معیار تھا ان طاقت ور لوگوں کا کہ کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔کوئی ان سے حساب لینے والا نہیں تھا۔یوں اس واقعے کو اک حادثے کا نام دیکر خارج کر دیا گیا۔

آگے پیچھے ان بچیوں کا کوئی تھا نہیں۔جو معاملے کی تہہ تک جاتا۔باپ اپنی دوسری بیوی کی زلفوں کا اتنا اسیر ہو چکا تھا کہ اسے پرواہ نہ تھی۔بیٹا سوتیلی ماں کے سلوک سے تنگ آ کر ایسا غائب ہوا کہ دوبارہ پلٹ کے نہ دیکھا۔کوئی زندہ بھی ہے کہ نہیں۔

"ہمسایہ ہونے کے ناطے کامران انکل نے ندیم انکل کیساتھ مل کر کاروائی میں حصہ ڈالنے کی کوشش کی لیکن فہیم انکل کی دخل اندازی نے ہمیں پیچھے ہونے پر مجبور کر دیا۔جب باپ ہی کیس کی پیروی نہیں چاہتا تھا تو چاچایا ہم کیا کر سکتے تھے۔

وہ دونوں ابھی ناسمجھ تھیں۔سولہ اور چودہ سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔جلد بازی اور لالچ میں کیئے گے فیصلے بعض اوقات بیٹیوں کو زندہ درگور کر دیتے ہیں۔اور کرنے والے خود کو مورد الزام بھی نہیں ٹھہراتے۔نصیب کا لکھا کہہ کے اسے بیچ منجدھار ہی میں بے یارومددگار چھوڑ دیتے ہیں۔کہ کہیں ہم پر بوجھ بن کے دوبارہ لاؤ نہ توڑی جائیں۔اور بچپن سے لڑکیوں کو گزارہ کرنے کی جو گھٹی ایسے پلا دی جاتی ہے۔کہ وہ ساری عمر اپنی کم بخت گزارے میں ہی گزار کر موت کو گلے لگا لیتی ہیں۔

صورت اور پائل شاید اسی طرح گزارہ کرنے کا نصیب لیکر آئیں تھیں۔نہ ماں کی محبت نصیب میں ہوئی۔نہ باپ کی شفقت۔سوتیلی ماں کیلالچ نے انھیں دکھ کی جس بھٹی میں جلنے کے لیے تن تنہا چھوڑا وہاں سے واپسی کا راستہ اگر وہ چاہتیں بھی۔تو ناممکن تھا۔

اسطرح ایک نہیں تین بےبس ولاچار پھول جیسی بیٹیاں ایک باپ کی بےتوجہی اور سوتیلی ماں کے لالچ و ناروا سلوک سے ظلم کی بھینٹ چڑھ گئیں۔

☆☆......☆☆

دنیا میں کس جگہ

سچی کہانیاں کے چرچے نہیں

اِس لیے کہ "سچی کہانیاں" کے مصنّفین پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں کو برتتے، دیکھتے، محسوس کرتے اور ہمیں لکھ بھیجتے ہیں۔ "سچی کہانیاں" کے قارئین وہ ہیں جو سچائیوں کے متلاشی اور انہیں قبول کرنے والے ہیں

یہی وجہ ہے کہ "سچی کہانیاں" پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا اپنی نوعیت کا واحد ڈائجسٹ ہے "سچی کہانیاں" میں آپ بیتیاں، جگ بیتیاں، اعترافات، جرم و سزا کی کہانیاں، ناقابلِ یقین کہانیاں، دلچسپ و سنسنی خیز سلسلے کے علاوہ مسئلہ یہ ہے اور قارئین و مُدیر کے درمیان دلچسپ نوک جھونک احوال۔ سب کچھ جو زندگی میں ہے وہ "سچی کہانیاں" میں ہے۔

پاکستان کا سب سے زیادہ پسند کیا جانے والا — اپنی نوعیت کا واحد جریدہ

ماہنامہ سچی کہانیاں پرل پبلی کیشنز : C-II-63 فرسٹ فلور، خیابان جامی کمرشل۔
ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز۔7، کراچی فون نمبر: 021-35893121-35893122
ای میل: pearlpublications@hotmail.com



تعارف

ملازم حسین شیرازی

ادارہ

میری پیدائش، صوبہ خیبر پختونخوا کے خوبصورت اور دریائے سندھ کے کنارے آباد شہر ڈیرہ اسماعیل خان میں ہوئی کبھی 'ڈیرہ پھلا دا سہرا' کہلاتا تھا۔

افغانستان اور وزیرستان سے داخل ہونے والے دہشت گردوں اور حالات خراب ہونے کی وجہ سے چند سال پہلے بھکر شفٹ ہو گئے تھے اب تو ماشاء اللہ پاک آرمی اور پیرا ملٹری کی وجہ سے حالات بہت بہتر ہیں دریائے سندھ کے Right Bank پر ڈیرہ اسماعیل خان اور Left Bank پر دریا خان، بھکر کے شہر آباد ہیں ڈیرہ اور ان شہروں کا درمیانی دریائی فاصلہ 22 کلومیٹر ہے کبھی اس کی چوڑائی بھی 22 کلومیٹر تھی اور اس میں دریا بہتا تھا لیکن ڈیمز اور پلوں کی تعمیر اور انڈیا کی طرف سے معاہدہ طاس کی خلاف ورزی پر دریا سکڑ گیا ہے۔

ڈگری کالج ڈیرہ اسماعیل خان سے گریجویشن کی پھر پشاور سے ایم اے پولیٹیکل سائنس کیا۔

خزانہ آفس ڈیرہ میں تعیناتی ہوئی دو سال سروس پوری نہ ہوئی کہ دو سال کی چھٹی لے کر LAW کرنے کراچی عازم سفر ہوا۔ اس وقت ڈیرہ میں گومل یونیورسٹی نہ بنی تھی۔ (اس کی پوری تفصیل کہانی 'دعا' میں پڑھیں گے)

ایس ایم لاء کالج سے ایل ایل بی کیا اور بعد میں وکالت کے دوران لاء کی ماسٹر ڈگری ایل ایل ایم لی۔ لکھنے پڑھنے کا بہت شوق تھا اس شوق کی چاہت اور تکمیل کے دوان مرحوم سہام مرزا صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ میری زندگی کے حسین ترین ایام تھے۔

اس وقت کراچی حقیقی معنوں میں روشنیوں کا شہر تھا۔ علم و ادب کا گہوارہ تھا۔ سکون، امن شانتی کا راج تھا اُن کی صحبت میں علم و ادب سے آگاہی ہوئی۔ آپ محب وطن انسان دوست اور ہر ایک کی خدمت میں ہر دم تیار رہتے تھے۔

وہ مجھ پر بہت مہربان تھے ان کی سر پرستی کا سایہ ہمیشہ قائم رہتا تھا۔ ان کی کامل مہربانیوں

کے طفیل اور ان کی معرفت اس وقت کراچی کی اعلیٰ ترین علمی و ادبی شخصیات سے ملاقاتوں کا شرف رہا' ان کے ذریعے سے اور ان سے پہلے جن شخصیات کی محفلوں میں سننے کہنے کا موقع ملا ان میں رئیس امروہی' جون ایلیا' سید ہاشم رضا' حکیم سعید' الیاس رشیدی' دکھی پریم نگری' منہاج برلاس' علامہ عقیل ترابی' علامہ نصیر اقبہادی' مولانا احتشام الحق تھانوی' مولانا شاہ احمد نورانی' محترم سہام مرزا صاحب کے ہمراہ سروسز کلب کے شیزان ریسٹورنٹ کی کافی وچ ریسٹورنٹ میٹروپول ہوٹل کی جائے کے دور' پریس کلب 'وائی ایم سی اے کی بیٹھکیں آج بھی ذہن پر نقش ہیں۔

ان کی وفات سے چند ماہ پہلے میں باہر چلا گیا۔ غم روزگار اور کروٹیں بدلتی زندگی میں سرگرداں رہا۔ چونکہ کافی عرصہ باہر رہا۔

طبیعت سیلانی تھی ایک جگہ ٹک کر رہنا پسند نہ تھا۔ زندگی کو بڑے قریب سے دیکھا۔ اکتوبر 2015ء سے اب تک سچی کہانیاں میں جو قصے داستانیں' کہانیاں شائع ہوتی رہیں وہ میری اپنی آپ بیتیاں' اور زندگی کا نچوڑ ہیں آج بھی وہی کہانی زیر قلم کرتا ہوں جو میری زندگی کا حاصل ہے۔

تفصیلی تعارف' طوالت کے پیش نظر بیان نہیں کرسکتا' مفصل تعارف عنقریب میری آپ بیتی میں پڑھ سکتے ہیں۔

ایک دو گزرے گئے واقعات کا ذکر کرنا چاہوں گا یہ میری خودستائشی یا خودنمائی نہیں بلکہ قارئین کے لیے ایک پیغام ہے۔

1971ء میں دو کشمیری نوجوان ہاشم اور اشرف نے انڈیا کا جہاز 'گنگا' دھلی سے اغواء کیا اور لاہور ایئرپورٹ پر اُسے آگ لگادی۔ اس میں کئی لوگ جل کر مر گئے۔

بعد ازاں انہیں گرفتار کیا گیا اور سزائے موت دی گئی۔ ان کے لیڈر کشمیر محاذ آزادی کے چیئرمین مقبول بٹ صاحب تراڑکھل آزاد کشمیر تھے جنہیں اس پاداش میں دہلی کی تہاڑ جیل میں پھانسی دی گئی میں اس وقت نوعمر تھا۔ لیکن ان کی جدوجہد آزادی میں شامل تھا۔

قانون نے مجھے دھرلیا۔ حالانکہ جہاز کے اغواء یا ایسی غیر قانونی' انسانیت سوز سرگرمیوں سے تعلق نہ تھا۔ میرے خلاف تفتیش شروع ہوئی' ساری کارروائی شاہی قلعہ کے تاریک زندانوں میں ہوئی جہاں زہریلے بچھوؤں اور سانپوں کی بہتات تھی 23 دن اذیتوں کے بعد میری بے گناہی طشت ازبام ہوئی اور مجھے آزاد کردیا گیا۔

1983ء میں ایران میں سونے کی اسمگلنگ کے شبے میں زاہدان کی کالی پہاڑیوں کے پہلو میں گرفتار کیا گیا اور فائرنگ اسکواڈ کے آگے کھڑا کردیا گیا۔

پاسداران ایران سے گزارش کی کہ مجھے یہاں شوٹ نہ کیا جائے بلکہ صوبہ سیستان کے گورنر کے سامنے پیش کیا جائے جہاں میں اپنا بیان ریکارڈ کرواؤں گا جو میرا قانونی حق ہے آپ لوگوں کو اردو انگریزی نہیں آتی اور میں فارسی زبان سے نابلد ہوں۔

گورنر سے وائرلیس کے ذریعے رابطہ ہوا اور مجھے دوسری صبح اُن کی عدالت میں پیش کیا گیا۔

گورنر صاحب نے انکوائری کرائی پتہ چلا کہ قانونی پیسہ تھا۔ شہربانی تہران نے ادائیگی کی تھی اسی سے سونا خریدا گیا۔ عدالت نے باعزت بری کردیا۔

وہاں سے پاکستان روانہ ہوا۔ 1983ء میں جنرل ضیاء مکران کا دورہ کر رہے تھے وہ نو اپریل 1983ء تھی۔

اس وقت سکیورٹی الرٹ تھی۔ الذوالفقار تنظیم کا بڑا نام تھا جنرل صاحب اس سے بڑے خائف تھے ہر آدمی کو چیک کیا جا رہا تھا۔ میرے بیگ سے بھٹو صاحب کی تحریر کردہ کتاب (اگر مجھے ہلاک کر دیا گیا) پکڑی گئی ان کو شک پڑ گیا کہ میں الذوالفقار سے متعلق ہوں اور جنرل صاحب کو قتل کرنے وارد تربت (مکران) ہوا ہوں میرا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا مجھے سب مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے سامنے پیش کیا گیا کہ میں ایک خطرناک دہشت گرد ہوں۔

میں نے انہیں صوبہ سیستان کے گورنر کے روبرو پیشی، تہران شہربانی (میونسپل کمیٹی) کے ٹھیکے کے دستاویزات ویزہ جات، زاہداریاں دکھائیں کئی دن کی تکالیف کے بعد رہائی ملی۔ (یہ تفصیلی واقعات آپ سچی کہانیاں کے شمارہ Oct-2018 میں بہ عنوان 'کفارہ' پڑھ چکے ہوں گے یا اب مطالعہ کر سکتے ہیں)

یہ واقعات بتانے کا مقصد یہ ہے کہ میں اپنے قارئین سے گزارش کرتا ہوں کہ دکھ، غم، آلام، تکالیف جیسے بھی حالات ہوں پریشان نہ ہوں اپنی قوت ارادی، مصمم ارادہ کو بروئے کار لائیں اور انہیں قائم رکھیں اپنی نیت کو صاف رکھیں اور خداوند کریم پر بھروسہ اور دل سے ایمان رکھیں کوئی تکلیف اذیت گزند نہ پہنچا سکے گی۔

پاک پروردگار اپنے پرخلوص اور اطاعت شعار بندوں کی ہر دم مدد فرماتا ہے قوت مدافعت نہ ہونے کی وجہ سے یا ڈر خوف میں مبتلا زکام کا مریض ایک ہفتہ میں مر جاتا ہے۔

دوسری طرف کینسر کی آخری اسٹیج پر ہونے کے باوجود اپنی ول پاور سے کینسر کو شکست دیتا ہے مشاغل کبھی کرکٹ بہت پسند تھی بکیوں کے وارد ہونے اور جوابازی کی لعنت سے اب شوق باقی نہ رہا۔

ہاکی بہت پسند ہے کبھی ہاکی کا بہترین کھلاڑی تھا کافی انعامات تھے فلموں سے شوق رہا ہے اس سلسلے میں فلمی دنیا سے تعلق بھی رہا ہے۔

اولادیں تین بیٹے دو بیٹیاں ہیں بڑا بیٹا آرمی آفیسر ہے اس سے چھوٹا ایران (قم) میں زیر تعلیم ہے اور سب سے چھوٹا بیٹا کراچی میں بینک ملازم ہے اور اچھے عہدے پر فائز ہے۔

زندگی کے اس موڑ پر اب سچی کہانیاں کی محبت میں گرفتار ہوں۔

اس سے خلوص و اپنائیت کا رشتہ استوار ہے اس کے لکھیت، قارئین کی تحریروں کو پڑھنا اُن کے دکھ سکھ سمجھنا، اُن کی خدمت میں اپنی معروضات پیش کرنا اپنی سعادت ہے۔

ملک کے کونے کونے میں آباد قارئین جن کی زبان، کلچر، تہذیب، مذہب، طور طریقے جدا اور الگ الگ ہیں لیکن سچی کہانیاں سے جڑے رہنے کی وجہ سے رشتہ محبت، خلوص چاہت میں موتیوں کی لڑی میں پروئے ہیں۔

ایک عظیم باپ کی وفا شعار اور عظیم بیٹی منزہ سہام اپنے والد کے نقش پا پر گامزن ہے اپنے قارئین اور لکھاریوں کو عزت، احترام، اپنائیت لکھنے پڑھنے کی گائیڈ لائن بہم پہنچا رہی ہے۔

اللہ پاک انہیں ان کے اہل وعیال پر اپنا کرم رکھے اپنی حفظ وامان میں جگہ دے اور سچی کہانیاں کے قارئین محبان پر فضل و عنایت کی بارش برسائے۔ آمین۔

☆☆......☆☆



بھکر سے ارسال کردہ ایک اچھے انسان کی سچی کہانی

انسانیت کا حق

یٰسین چوبیس گھنٹے کام کرتا تھا اور سونے کیلیے اُس کو صرف آدھا گھنٹہ دیا جاتا' انسانی حقوق کیلیے آواز بلند کرنیوالے غریبوں کو صرف اسمبلیوں تک پہنچنے کیلیے استعمال کرتے ہیں......

ملازم حسین شیرازی

میراں بخش اپر سندھ کے مشہور شہر سے تعلق رکھتا تھا۔ ایم پی اے تھا، بظاہر ایک نیک اور شریف انسان تھا' وہ ایک بہت بڑا وڈیرا اور زمیندار تھا مگر اس کے اخلاق اور خلوص میں کوئی شائبہ نہ تھا۔ چونکہ وہ ایک وڈیرا تھا اس لئے بعض خاندانی روایتیں اور رسم و رواج کے تحت کچھ خامیاں تھی۔ نوکر چاکر، سخت گیری اور رعب داب اسکی فطرت کا حصہ بن چکے تھے۔

اس نے ڈیفنس میں ایک کوٹھی خریدی جس میں اسکی رہائش تھی۔ وہ مہینے میں ہفتہ دس دن اسمبلی اجلاس یا دیگر امور کی انجام دہی کے لئے اپنے گاؤں سے آتا تھا۔ اسکی عدم موجودگی میں اسکے منشی و دیگر نوکر رہائش رکھتے تھے۔ وہ اکثر میرے آفس آنا پسند کرتا تھا۔ ان کے ساتھ میرے تعلقات خلوص اور اپنائیت پر مبنی تھے۔ کبھی کبھی میں بھی اسکے بنگلہ پر حاضری دیتا تھا۔ اچھی گپ شپ رہتی تھی۔

اسکا ایک نوکر یٰسین تھا۔ وہ اسے گاؤں سے لایا تھا۔ اور اسی بنگلے میں رہتا تھا۔ یٰسین کے والدین اور بزرگ صدیوں سے میراں بخش جاگیردار اور انکے آباؤ اجداد کی چاکری میں تھے۔ یٰسین دبلا پتلا بیمار سا لگتا تھا۔ زرد چہرہ، گال پچکے ہوئے، اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں۔ چوبیس گھنٹے کام کاج میں لگا رہتا تھا۔ کبھی چائے بنا رہا ہے، کبھی صفائی ستھرائی کررہا ہے، گاڑیوں کو دھو رہا ہے۔ اور کام ختم ہونے کے بعد جاگیردار صاحب اور اسکے بھائی بند وغیرہ کی ٹانگیں دبا رہا ہے۔ میں نے اسے کبھی بھی فارغ نہیں دیکھا۔ وہ ہر وقت پریشان اور کھویا کھویا رہتا تھا۔

ایک دن میں جاگیردار صاحب سے ملنے انکے بنگلے پہنچا۔ گھنٹی بجانے پر یٰسین نے دروازہ کھولا۔ وہ مجھے ایسی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے اسے میرا ہی انتظار تھا اور کچھ کہنا مطلوب تھا۔

میں نے جاگیردار صاحب کا پوچھا تو پتہ چلا کہ وہ اپنے گوٹھ گئے ہوئے ہیں۔ انکے بھائی وغیرہ باہر نکلے ہوئے تھے۔ میں نے واپس پلٹنا چاہا تو یٰسین منت سماجت کرنے لگا کہ میں تھوڑی دیر رک جاؤں۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ میری بھی خواہش تھی کہ اسکے بارے میں آگاہی حاصل کروں کہ وہ کیوں ہر

وقت چپ چاپ اور مصیبت زدہ دکھائی دیتا ہے۔
وہ مجھے اندر لے آیا، ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور بڑی بے تابی سے میرے قدموں میں گر گیا۔ دھاڑیں مار کر رونے لگا۔ میں نے اسے کندھوں سے پکڑا اور تسلی دی۔ اسے کہا کہ وہ میرے سامنے صوفے پر بیٹھ جائے اور جو کچھ کہنا چاہتا ہے بے دھڑک کہے۔ وہ زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ درخواست کی جو کچھ کہنا چاہتا ہے اسے میں اپنے تک ہی رکھوں۔ اسکا ذکر جاگیردار سے نہ کروں۔ میں نے اسے تسلی دی تو کہنے لگا۔
"صاحب جی میرے باپ دادا سات پشتوں سے جاگیرداروں کے نوکر چاکر ہیں۔ انکی خدمت میں ہر دم ہر وقت جُتے رہتے ہیں۔ ہماری شادی، خوشی، غم۔ انکی رضامندی اور حکم کے مطابق ہوتے ہیں۔ ہم اپنی بہن بیٹی کا رشتہ انکی اجازت کے بعد کرتے ہیں۔ شادی کے بعد ہماری بیویاں ہفتہ دس دن انکی خدمت پر مامور ہوتی ہیں۔ اس عرصے میں ہمیں ان سے ملنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ میری شادی تین سال پہلے میرے والدین نے اپنے رشتہ داروں میں بڑے ارمانوں اور چاہتوں سے یہ کی تھی کیونکہ میں والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ نکاح کے بعد میری بیوی کا کوئی پتہ نہ چلا، دس دن انہی کے پاس رہی۔ دسویں دن وہ ہمارے گھر آئی۔ ہم نے تین دن اکٹھے گزارے پھر جاگیردار صاحب مجھے اپنے ساتھ کراچی لے آئے۔ پونے تین سال سے میں اسی گھر میں انکی اور انکے رشتہ داروں، دوستوں کی خدمت کر رہا ہوں۔ میرا بیوی اور والدین سے کوئی رابطہ نہیں۔ نہ مجھے گھر جانے کی اجازت ہے۔ سارا دن مجھ سے کام کراتے ہیں۔ جب سودا سلف لینے بھیجتے ہیں تو مجھے لگتا ہے کہ کوئی ہر وقت مجھ پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ ساری رات سونے نہیں دیتے۔ سکون چین، آرام ختم ہوگیا ہے۔ چوبیس گھنٹوں میں آدھ ایک



گھنٹہ سوسکتا ہوں۔ بیماری میں بھی کوئی معافی نہیں ملتی۔ صاحب میں آپکی منت کرتا ہوں، مجھے اس ماحول سے نکالیں۔ مجھے اپنے ماں باپ یا بیوی کی بھی طلب نہیں ہے۔ بس مجھے کہیں بہت دور جانا ہے ۔میں اس کسمپرسی کی حالت میں مرجاؤں گا۔ میں اپنے گاؤں نہیں جانا چاہتا اور نہ جاسکتا ہوں ۔ میری ان سے جان چھڑادیں۔'' پھر وہ زاروقطار رونے لگا۔

میں نے اسے تسلی دی، اسکی روائیداد سن کر بہت دکھی ہوئی۔ آج کل کے اس دور میں جہاں انسانی حقوق کے فلک شگاف نعرے بلند کیے جاتے ہیں، تقریروں تحریروں میں حقوق کی پاسداری کے دعوے کیے جاتے ہیں۔ اسمبلیوں میں جھوٹ موٹ کے آنسو بہائے جاتے ہیں۔ حقیقتاً یہ خود ہی ان حقوق کی بجا آوری اور تحفظ کا استحصال کرتے ہیں ۔ایسی بربریت اور ظلم وستم کتنی عام ہے۔

میں نے یٰسین کا بتایا کہ ایک دودن صبر وتحمل سے کام لے، میں اسکے لئے کچھ کرنے کی کوشش کرتا ہوں ۔وہ میری آمد اور اپنے حالات کا ذکر کسی سے نہ کرے ۔یہ کہہ کر میں دل گرفتگی کے ساتھ وہاں سے آگیا۔

دودن اسی کشمکش و پیچ اور سوچ بچار میں مبتلا رہا کہ آخر کیا کیا جائے، تب میں نے فیصلہ کیا کہ یٰسین کو وہاں سے نکال کر کسی دوسری جگہ بھیج دیا جائے تا کہ اسکی زندگی بچ جائے ۔ میرے جاننے والے شمالی وزیرستان کے مرکزی شہر میران شاہ میں ہوٹل چلاتے تھے۔۔ان سے میرے اچھے تعلقات تھے۔ میں نے ان سے رابطہ کیا اور صورت حال سے آگاہ کیا۔ جہانگیر خان میران شاہ کے ہوٹل مالک تھے۔انہوں نے مجھے بتایا کہ فکر نہ کریں، اور اسے میرے پاس روانہ کریں۔ انہوں نے بتایا کہ میران شاہ سے کراچی اسکی بسیں چلتی ہیں۔ ناصر ڈرائیور سے رابطہ کریں اور اسکے حوالے کردیں۔ سہراب گوٹھ میں ناصر ڈرائیور سے ملا، جہانگیر خان اس سے اس سلسلے میں بات کر چکا تھا۔یٰسین کو اسکے حوالے کرنا تھا۔

میں یٰسین سے ملا اور اس رازداری سے سارے پلان کے متعلق بتایا۔ وہ تین بجے بازار سودا سلف لینے آتا تھا، میں نے اسے یہی ٹائم کہا تھا ملنے کیلیے میں بنگلے سے ہٹ کر اسکا انتظار کرنے لگا۔ وہ ہاتھوں میں تھیلا لیے آیا تھا اور ہم آگے پیچھے بازار پہنچے۔ وہاں شاید عام لباس میں کوئی اس پر نظر رکھنے کے لئے موجود تھا۔ وہاں سے میں نے اسے بھیس بدل کر کیسے نکالا، یہ ایک لمبی داستان ہے۔ میں اپنے قارئین کیلئے مختصر کر کے لکھ رہا ہوں۔ میں طے شدہ پروگرام کے مطابق اسے سہراب گوٹھ لے کر گیا اور گاڑی میں بٹھا کر آیا، وہاں سے اسے جہانگیر خان کے پاس پہنچنا تھا۔ اسکی شکر گزاری والی نظریں آج بھی مجھے یاد ہیں۔

بعد میں پتہ چلا کہ وہ بخریت پہنچ گیا، جہانگیر خان نے مجھے بتایا کہ چند دن آرام کے بعد وہ اسے اپنے ساتھ ہوٹل کو کام میں لگالے گا۔ میں نے یٰسین کے لئے جو بھی کیا تھا وہ نیک نیتی اور خلوص سے کیا تھا۔ مجھے نہ تو ڈر اسے کوئی رنجش تھی نہ شکایت۔ میں صرف ایک پریشان حال اور مایوس انسان کو زندگی کی صحیح ڈگر پر لانے کی کوشش کررہا تھا۔

بعد میں جہانگیر شاہ نے مجھے بتایا کہ یٰسین وہیں ہوٹل پر کام کررہا ہے اور ہوٹل میں ہی اسکی رہائش ہے۔

عرصہ پانچ سال بعد میں پشاور صدر میں جارہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے آواز دی۔

''صاحب جی۔۔صاحب جی۔سائیں!'' میں نے مڑ کر دیکھا تو ایک سفید پوش نوجوان جو بغیر داغ سفید کپڑوں میں ملبوس، میرون کلر کا کوٹ پہنے تھا۔ اسکے ساتھ ایک خاتون اور دو بچے تھے۔

''صاحب جی! آپ نے مجھے پہچانا؟ میں یٰسین لاکھانی ہوں۔ وہی جسے آپ نے کراچی سے میران

شاہ بھیجا تھا۔''

میں حیرت اور تجسس میں مبتلا اسے بغور دیکھ رہا تھا۔اس نے اب میرا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔میں نے اسکے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

''ہاں لیسین میں پہچان گیا ہوں۔تم تو بہت بدل چکے ہو۔کہاں ہو آج کل؟ جہانگیر خان کیسا ہے؟''میں سوال پہ سوال کیے جا رہا تھا۔

''صاحب جی!میں آپکو سب بتاتا ہوں۔آپ میرے ساتھ میری رہائش گاہ پر چلیں۔میں آپکو۔''

''مگر لیسین میں تو یہاں کسی سے ملنے آیا تھا۔''میں اسکی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

''نہیں صاحب ابھی آپ میرے ساتھ چلیں۔''

میں اپنا کام ادھورا چھوڑ کر اسکے ساتھ اسکی گاڑی میں روانہ ہو گیا۔اسکی رہائش ایک اچھے علاقے میں تھا۔وہ مجھے اندر لے آیا۔

''صاحب میری بیوی ہے۔وہی جس سے شادی میرے ماں باپ نے بہت ارمانوں اور چاہتوں سے کی تھی۔''اس نے اپنے ساتھ موجود خاتون کا تعارف کروایا۔

''آپ نے مجھے ناصر ڈرائیور کے ساتھ جہانگیر خان کے پاس میران شاہ بھیجا تھا، وہاں دو دن بعد میری اس سے ملاقات ہوئی۔وہ بہت خلوص اور شفقت سے مجھ سے ملا۔اس نے مجھے ہوٹل میں ملازم رکھ لیا تھا، انکا ہوٹل بہت اچھا چل رہا تھا انہوں نے مجھے ہوٹل میں رہنے کے لئے ایک کمرہ دے دیا۔میں نہایت محنت اور دیانتداری سے کام کرنے لگا۔دو سال بعد انکا انتقال ہو گیا، مرنے سے پہلے انہوں نے مجھے اپنی ٹرانسپوٹ کمپنی کا سپروائزر لگا دیا تھا، یہ بسیں میران شاہ سے کراچی چل رہی تھی۔میری محنت رنگ لائی اور میں خود ایک پھر دو پھر تین یہاں تک کہ پانچ بسوں کا مالک ہو گیا۔پھر ملکی حالات خراب ہو گئے۔میران شاہ میں آئے روز اغوا اور دھماکے ہونے لگے، اور پھر باہمی مشورے سے میں پشاور منتقل ہو گیا۔یہاں اب میرا ٹرانسپورٹ کا کاروبار ہے، میری بسیں پشاور سے کراچی، راولپنڈی چلتی ہیں۔اسی جگہ مکان بنا لیا۔میرے میران شاہ آنے کے چھ ماہ بعد میرے والدین فوت ہو گئے۔بیوی وڈیروں کے رحم وکرم پر کسمپرسی کی حالت میں زندگی گزار رہی تھی۔میں نے اپنے ایک ساتھی کو گاؤں بھیجا تھا اور وہ نہایت پردہ داری اور رازداری سے میری بیوی کو چوری چھپے وہاں سے لے آیا تھا۔''

''صاحب جی میں آپکو ہر لمحے یاد کیا، آپ نے کراچی میں اپنا دفتر چھوڑ دیا تھا اور باہر چلے گئے تھے۔میں ہر وقت دعا کرتا تھا کہ آپ سے ملاقات ہو جائے۔آپکی مہربانی اور حسن سلوک سے ایک مایوس، لاغر اور دائمی مریض موت کے قریب سسکتا اور بلکتا انسان آج دنیا بھر کی خوشیاں سمیٹے شاہراہِ حیات پر کامیابی سے گامزن ہے۔ہر وقت دل سے دعا نکلتی ہے اور آج اللہ نے میری دعا قبول کر لی۔''

''بس جو بھی ہوا اللہ کی رضامندی سے ہوا ہے، میں تو بس ایک وسیلہ ہوں۔''

''تمہارا ابھی گاؤں جانا ہوا؟''

''ہاں صاحب!وڈیرا تو فوت ہو گیا، زمینوں اور جائیداد کے سلسلے میں اسکے بھائیوں اور بیٹوں میں طویل جھگڑے چل رہے ہیں۔نزدیکی رشتہ دار تو نہیں ہیں۔برادری کے لوگ ہیں جو آج بھی غربت کی زندگی گزار رہے ہیں۔کبھی کبھی گاؤں جاتا ہوں اور انکی خبر گیری کرتا رہتا ہوں۔''

پھر میں کھانا کھا کر وہاں سے واپس چلا آیا۔اب کبھی کبھی لیسین سے ملاقات رہتی ہے، خوش وخرم زندگی گزار رہا ہے۔

☆......☆......☆

کوئٹہ سے ارسال کردہ

کنول

وہ بہت حسین تھی، اس کی آنکھیں کنول جیسی اور سراپا تراشے ہوئے مجسمے کی مانند

محبت کی خوبصورت اور انوکھی داستان......

عمران قریشی

برصغیر پاک و ہند کی تقسیم سے قبل ان علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی اقلیت تھی۔ وہاں مسلمانوں کی بے راہ روی اور جہالت کا یہ عالم پایا جاتا تھا کہ وہ ماتھے پر تلک لگاتے۔ ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتے، اور ہندوؤں میں ہی شادی کر کے اُن کے ساتھ مندروں میں پوجا کے لیے جاتے تھے۔

بہت سے مسلمان ایسے بھی تھے۔ جو صبح اٹھ کر گائے کے آگے ہاتھ جوڑتے۔ اُس کے آگے دیے جلاتے، والد صاحب نے جب تبلیغ کے سلسلے کا آغاز کیا۔ تو ستمری گاؤں کے اُن گھرانوں جن کی تعداد پانچ تھی۔ نہایت حیرت بھری نگاہوں سے والد صاحب کی باتوں کو سنا۔ لیکن قطعی توجہ نہیں دی۔ تب والد صاحب نے دریائے کاویری کے کنارے مسجد بنانے کا اعلان کیا۔ خوابیدہ مسلمان گھرانوں میں ہلچل کے آثار پیدا ہوئے۔

تاہم ہندوؤں میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ میری عمران دنوں سات سال کے قریب تھی۔ میں صبح صادق والد صاحب کے ساتھ مسجد کے نامکمل ڈھانچے کی طرف جاتا۔ والد صاحب فجر کی نماز پڑھاتے اور فارغ ہونے کے بعد ہم مسجد کی تکمیل میں مصروف ہو جاتے۔ والد صاحب کی محنت اور مسجد کی عمارت کی بدولت نمازیوں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہونے لگا۔ گاؤں کا پنڈت رام پرشاد دریائے کاویری میں اشنان کرنے کے بعد والد صاحب کے پاس ٹھہر جاتا۔ وہ حیرت بھری نگاہوں سے ہمیں مسجد کے کام میں مگن دیکھتا۔ پھر تجسس بھرے لہجے میں والد صاحب سے پوچھتا۔

''آپ کی تبلیغ اور مسجد کی تعمیر کا سلسلہ میری سوچ سے بالاتر ہے۔ ستمری گاؤں کے مسلمانوں کا تعلق اوشے اسلام سے ہے اور اوشے اسلام سے ہی رہے گا۔ آپ اُن پر تبلیغ کر کے انہیں مذہب کی مزید کس نہج تک لے جاسکتے ہیں۔''

والد صاحب جواب دیتے۔

''ستمری کے مختصر مسلمان اسلامی تعلیمات

سے نابلد ہیں۔ اگر اِن پر تبلیغ نہ کی گئی تو مجھے خدشہ لاحق ہے کہ اسلام سے خارج نہ ہو جائیں۔" پنڈت مسکراتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہتا۔

"میرا سوال وہیں ہے میں اور میری قوم صدیوں سے ہندو تھے اور صدیوں تک ہندو ہی رہیں گے۔ ہندومت سے خارج ہونا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ مجھے اگر فکر ہے تو ہندومت میں تعداد کے اضافے کی ہے۔ آپ کے لیے بھی میرا مشورہ یہی ہے کہ مسلمانوں پر تبلیغ کرنے کے بجائے غیر دھرم والوں پر تبلیغ کے سلسلے کا آغاز کیجیے اور اسلامی طبقے کی تعداد میں اضافے پر زور دیجیے۔" والد صاحب سنجیدہ لہجے میں جواب دیتے۔

ستری کے مسلمان اس قابل نہیں ہیں کہ غیر دھرم کے کسی فرد پر تبلیغ کر سکیں۔ وہ اسلام سے یکسر دور ہو چکے ہیں۔ میرے خیال کے مطابق اُن پر محنت کی زیادہ ضرورت ہے۔ اسلام کے پھیلاؤ پر بعد میں بھی توجہ دی جا سکتی ہے۔" گفت و شنید کا سلسلہ وقتی طور پر ختم ہو جاتا اور پنڈت گاؤں کی طرف چلا جاتا۔ انہی دنوں تقسیم پاک و ہند کی چپقلش کا آغاز ہوا۔

یہ افواہیں گردش کرنے لگیں کہ انگریزوں کے جانے کے بعد جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہو گی۔ وہ علاقے مسلمانوں کو دے دیے جائیں گے اور جن علاقوں میں ہندوؤں کی زیادتی ہو گی۔ انہیں ہندوستان میں مدغم کر دیا

جائے گا۔

ستمری میں چونکہ ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ اس لیے لامحالہ ستمری کے ہندوستان میں جانے کے کافی امکانات تھے۔ اس امکان کو مدنظر رکھتے ہوئے تین مسلمان گھرانے ان علاقوں سے منتقل ہوگئے۔ جہاں مسلمان کی اکثریت تھی۔ اُن کے جانے سے ناصرف مسجد کی تکمیل کا سلسلہ متاثر ہوا۔ بلکہ نمازیوں کی تعداد میں بھی کمی واقع ہوگئی۔ اگلی صبح فجر کی نماز کے بعد والد صاحب کی پنڈت سے ملاقات ہوئی۔

پنڈت نے پُرتفکر لہجے میں والد صاحب کو گاؤں چھوڑنے کا مشورہ دیا۔ والد صاحب نے جواب دیا۔

''جب تک گاؤں میں ایک بھی مسلمان باقی ہے۔ تب تک میں گاؤں کو چھوڑنے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا ہوں۔'' دوسرے دن خبر موصول ہوئی کہ ہندو بلوائیوں نے قریبی گاؤں پر حملہ کرنے کے بعد مسلمانوں کے گھروں کو نذر آتش کردیا ہے۔ اس خبر کے بعد ستمری کے دونوں مسلمان گھرانوں نے بھی گاؤں کو چھوڑ دیا اب وہاں واحد ہی ہمارا گھرانہ باقی رہ گیا تھا۔ پنڈت نے ایک دفعہ پھر والد صاحب کو گاؤں چھوڑنے کے لیے کہا۔

اس دفعہ والد صاحب نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ہجرت کی حامی بھرلی۔ صبح فجر کا وقت تھا۔ ہم تینوں نے جب گاؤں کا رخ کیا۔ تب گھر کے قریب پہنچنے کے بعد ہندو بلوائیوں نے ہم پر حملہ کردیا۔ اُن کی تعداد بیس کے قریب تھی۔ پنڈت نے انہیں روکنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ نہایت مشتعل اور آگ بگولہ ہورہے تھے۔ انہوں نے والد صاحب کو گھیرے میں لیتے ہوئے انہیں داڑھی کے پاس سے پکڑ کر زمین پر گھسیٹنا شروع کردیا۔ شور کی آواز سن کر میری والدہ گھر سے باہر نکل آئیں۔ انہوں نے والد صاحب کو بچانے کی کوشش کی۔

ہندوؤں نے انہیں کلہاڑی مار کر گھائل کردیا۔ وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگیں۔ بلوائیوں کا جتھا ان دونوں کے جسموں پر چھا گیا۔ میں دور کھڑا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ پنڈت نے میرے ہاتھ کو تھاما اور گھسیٹتے ہوئے اپنے گھر لے آیا۔ پنڈت کی بیوی ساوتری نے حیرت بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھتے مجھے گھر لانے کی وجہ دریافت کی۔ پنڈت بولا۔

''بھاگوان دھرم تبلیغ سے نہیں بلکہ تعداد میں اضافے سے پھیلتے ہیں۔ میں اسے ہندو بناؤں گا مجھے یقین ہے کہ میری اس کوشش کو تمام ہندو برادری سراہے گی۔'' ساوتری بولی۔

''پنڈت جی اس مُسلے کو گھر میں جگہ دینے سے پہلے یہ سوچ لیجیے گا کہ گھر میں ہمارے علاوہ اس کی ہم عمر لڑکی بھی ہے۔ کل کو کچھ اُلٹا سیدھا ہوگیا تو بدنامی آپ کی ہوگی۔'' پنڈت نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''دھرم کی خدمت کے لیے اگر مجھے آشا کی شادی اس کے ساتھ کرنا بھی پڑی۔ تو میں دریغ نہیں کروں گا۔ لیکن اسے پہلے ہندو دھرم میں نام پیدا کرکے دکھانا ہوگا۔ ستمری گاؤں کا مندر اس کا منتظر ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ دن زیادہ دور نہیں جب یہ اُس کا پنڈت بن کر گاؤں کے لوگوں کو حیرت زدہ کردے گا۔'' ساوتری خاموش ہوگی۔

☆......☆......☆

میرا نام تبدیل کرکے سری رام رکھ دیا گیا۔

پنڈت کی بیوی ساوتری اور لڑکی آشا کا سلوک میرے ساتھ بہتر تھا۔ میں صبح سویرے پنڈت کے ساتھ دریائے کاویری کی طرف جاتا۔ اشنان کرنے کے بعد ہم دونوں مندر آ جاتے۔ مندر کی صفائی کی جاتی۔

بھگوان کی مورتی کو غسل دیا جاتا۔ پھر گاؤں والوں کا تانتا بندھ جاتا۔ پوجا پاٹ کے بعد وہ اپنے مسائل سے پنڈت کو آگاہ کرتے۔ پنڈت انہیں حسب حیثیت حل کرنے کی کوشش کرتا۔ ستمری کے مندر کو اردگرد کے گاؤں میں نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ وہ باقی سب مندروں کی نسبت بڑا اور معتبر تھا۔ اس لیے مختلف گاؤں والوں کا بھی تانتا بندھا رہتا تھا۔

برصغیر پاک و ہند کو تقسیم کر دیا گیا۔ ستمری بھارت کا حصہ بن گیا۔ حالات بہتر ہونے لگے۔ دس سال کا عرصہ پلک جھپکتے میں گزر گیا۔ میں باقاعدگی کے ساتھ پنڈت کے ہمراہ مندر جاتا اور اُس کے ساتھ بیٹھ کر لوگوں کے مسائل سنتا۔ اُن دنوں سترہ اٹھارہ سال کی نہایت خوبصورت اور دبلی پتلی لڑکی نے مندر آنا شروع کیا۔ وہ ستمری کی رہائشی تھی۔

اُس کا نام کنول تھا۔ آنکھوں میں اُداسی اور افسردگی کے بادل چھائے رہتے تھے۔ سیاہ آنکھوں میں زندگی کی رمق نہیں تھی۔ وہ روزانہ صبح سیاہ چادر اوڑھے مندر میں آتی اور پوجا پاٹ کے بعد خاموشی کے ساتھ واپس چلی جاتی۔ مجھے اُس کی اُداس آنکھیں بہت اچھی لگتی تھیں۔ ساون کے مہینے کی بات ہے۔ آسمان پر سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔

تیز ہواؤں نے ستمری کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ خلاف معمول مندر میں گاؤں والوں کی تعداد نا ہونے کے برابر تھی۔ لیکن کنول معمول کے مطابق اپنے وقت پر مندر میں داخل ہوئی۔ اُس نے پوجا پاٹ کی اور واپس جانے سے قبل پنڈت کے چرنوں کو چھونے کے بعد افسردہ لہجے میں بولی۔

''پنڈت جی...... پوجا پاٹ کرتے ہوئے ہفتے بھر سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا۔ لیکن میرے پتی کی حالت پر رتی برابر بھی اثر نہیں ہوا۔ اب تو وہ بستر سے اٹھنے کے قابل بھی نہیں رہا...... کچھ ایسی پوجا بتایئے کہ ہم دونوں کی مشکل سفل ہو سکے۔''

پنڈت بولا۔

''دریائے کاویری کے دوسری طرف پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہندو مان کے مندر میں ماتھا ٹیک آؤ۔ بھگوان کی کرپا سے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

کنول نے موسم کے خطرناک تیوروں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ماتھا ٹیکنے کے لیے کون سا دن مناسب رہے گا۔'' پنڈت نے جواب دیا۔

''آج کا دن...... بھلے موسم خطرناک ہے۔ لیکن مشکلات میں کی ہوئی پوجا پاٹ کی اہمیت آسانی کی نسبت زیادہ ہوتی ہے۔ مندر کے باہر سے دیے خریدو...... اور فوراً دریائے کاویری کی طرف روانہ ہو جاؤ۔''

کنول اٹھ کر مندر سے باہر نکل گئی۔ اُس کے جانے کے بعد پنڈت میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''تم اس کے ہمراہ جاؤ...... مندر کے قریب جانوروں کی بہتات ہے۔ موسم بھی اچھا نہیں ہے۔ اُس کا اکیلے جانا مناسب نہیں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ صبح وسم کے تیوروں کو مدنظر

رکھتے ہوئے میں اپنا چھاتا ہمراہ لے آیا تھا۔ اُسے ہاتھوں میں تھام کر میں مندر سے باہر آ گیا۔

مندر کے قریب ہی پوجا پاٹ کا سامان فروخت کرنے والے کھوکھے بنے ہوئے تھے۔ وہ ایک کھوکھے کے پاس کھڑی سامان خریدنے میں مصروف تھی۔ میں نے اُسے پنڈت کی ہدایت سے آگاہ کیا۔ اُس نے کسی خاص ردعمل کا اظہار نہیں کیا اور سامان خریدنے کے بعد ہم دونوں دریائے کاویری کی طرف آ گئے۔

طوفانی ہواؤں کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ دریا کی موجیں سانپ کی طرح سر پٹک کر اپنے غصے کا اظہار کر رہی تھیں۔ تاہم پل کے پاس کچھ امن تھا۔ ہم اُسے عبور کر کے دوسری طرف واقع گھنے جنگل میں داخل ہو گئے۔ میں نے خاموشی توڑنے کی نیت سے پوچھا۔

''پوجا پاٹ کے بجائے تم اپنے شوہر کا مناسب علاج کیوں نہیں کرواتیں۔'' وہ بولی۔

''ہمارے پاس علاج کے لیے رقم نہیں ہے۔ اُسے کالے یرقان کا مرض لاحق ہے، جس کے لیے بہت سارے روپوں کی ضرورت پڑتی ہے۔'' میں نے اُسے بتایا۔

''ستمری کے قریب کچھ عرصہ قبل ڈسپنسری کا آغاز ہوا ہے۔ وہاں غریب اور نادار مریضوں کا علاج مفت کیا جاتا ہے۔ تم استفادہ حاصل کر سکتی ہو۔'' کنول سرد آہ بھرتے ہوئے بولی۔

''دو ہفتے قبل میں سنتو کو وہاں لے گئی تھی۔ پچھلے ہفتے انہوں نے اُسے لاعلاج قرار دے دیا۔ وہاں سے ناامید ہونے کے بعد میں نے مندر کا رخ کیا۔

جنگل کا اختتام ہونے کے بعد ہم دونوں نے سرسبز درختوں سے گھرے ہوئے پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیا۔ درختوں پر انواع و اقسام کے بندر اچھل کود کر رہے تھے۔ پہاڑ کی زمین پر خشک پتوں کی بہتات تھی۔ پھر موسلادھار بارش کا آغاز ہو گیا۔ میں نے چھاتا کھولا اور کنول کے ہاتھوں میں تھما دیا۔

اُس نے تشکر بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور ہم تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ گھنے درختوں کی وجہ سے میں بارش کی بوچھاڑ سے قدرے محفوظ تھا۔ تاہم درختوں کا یہ سلسلہ مستقل نہیں تھا۔ بعض جگہوں پر مجھے کھلے آسمان تلے گزرنا پڑتا تھا۔ تب وقتی طور پر موسلادھار بارش مجھے پانی سے شرابور کر دیتی تھی۔ تاہم یہ سلسلہ مختصر وقت میں اختتام پذیر ہو جاتا تھا اور میں دوبارہ درختوں کی پناہ میں داخل ہو جاتا تھا۔ کنول چھاتے کی وجہ سے بارش کی کارستانیوں سے محفوظ تھی۔

ایک گھنٹے کی مسافت کے بعد چڑھائی کا اختتام ہوا اور ہم پہاڑ کی چوٹی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ چوٹی پر ہمیں مندر کی عمارت 'برآمدے اور مختصر کمرے کی صورت میں دکھائی دی۔ میں اور کنول بھاگ کر برآمدے میں داخل ہو گئے۔

میرے کپڑے پانی سے شرابور تھے اور جسم خزاں رسیدہ پتے کی مانند کانپ رہا تھا۔

میں نے کنول کو پوجا پاٹ کے لیے کہا اور خود مندر سے باہر نکل کر درختوں کے گھنے جھنڈ کی طرف آ گیا۔ یہاں خشک لکڑیوں اور جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ میں انہیں جمع کر کے مندر کے برآمدے میں لے آیا۔ کنول بھگوان کی مورتی کے سامنے دیے روشن کر چکی تھی۔

میں نے اس کے قریب رکھی ہوئی ماچس اور مٹی کے تیل کو اٹھایا اور لکڑیوں پر چھڑکنے کے بعد انہیں آگ لگا دی۔

پھر قمیض اُتار کر اُسے آگ پر خشک کرنے لگا۔ ماحول کچھ گرم ہوا تو آسودگی بھری تسکین کا احساس ہوا۔ سوچنے سمجھنے کی حس عود کر نمودار ہوئی۔ دوپہر کے ڈھائی بجنے والے تھے۔ پہاڑی علاقوں میں شام جلدی اتر آتی ہے۔ اندھیرے میں نیچے اترنا دشوار ثابت ہوسکتا تھا۔ کنول کے لیے تو ناممکن تھا۔

بارش رُکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ بادوباراں کے لامتناہی سلسلے نے پہاڑ کی چوٹی کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ کنول پوجا پاٹ سے فارغ ہوکر آگ کے الاؤ کے قریب آ بیٹھی۔ اُس کا سرخ وسفید چہرہ آگ کی حدت سے گلابی ہونے لگا۔

وہ آنکھیں جھکائے الاؤ کے درمیان چٹختی ہوئی لکڑیوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے ہمکلام ہوتے ہوئے کہا۔

”بارش رُک ہی نہیں رہی...... کچھ دیر میں شام ہوجائے گی اندھیرے میں پہاڑ سے نیچے اترنا ہمارے لیے مشکل ہوگا۔“ وہ بولی۔

”مجھے واپس گاؤں جانے کی خواہش نہیں ہے...... وہاں بیمار سنتو اور بوجھل زندگی کے علاوہ کچھ نہیں ہے...... میں نے بھگوان کے آگے سر ٹیکنے کے بعد سنتو کے مرنے کی پراتھنا کی ہے اور مجھے یقین ہے کہ بھگوان مجھے نراش نہیں کرے گا۔“

اُس بے بس اور لاچار لڑکی پر مجھے ترس آنے لگا۔ اتنی کم عمری میں اُس پر بہت زیادہ ذمہ داریاں عائد ہوگئیں تھیں۔ میں نے ازراہ ہمدردی پوچھا۔

”تمہارے آگے پیچھے سنتو کے علاوہ اور کون ہے؟“ وہ سرد آہ بھرتے ہوئے بولی۔

”کوئی بھی نہیں...... ماں نے آخری وقت میں سر کا بوجھ اتار کر سنتو کے بیمار کندھوں پر منتقل کردیا۔ آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ اس لیے بھگوان کی مرضی کے آگے سر جھکا کر خاموشی کے ساتھ سنتو کے گھر چلی آئی۔“ میں نے قریب رکھی ہوئی لکڑیاں الاؤ میں جھونک دیں۔ آگ بھڑک اٹھی۔ بارش کی شدت میں مزید اضافہ ہوگیا۔

☆......☆......☆

کچھ دیر بعد رات کا اندھیرا ہونے لگا۔ جنگل میں گھمبیر خاموشی طاری تھی۔ کبھی کبھار پہاڑوں پر بجلی گرتی۔ تو دل دہل کر رہ جاتا۔ مجھے شدت کے ساتھ بھوک کا احساس ہورہا تھا۔ لیکن مندر کے قریب پیٹ پوجا کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اندھیرا پھیلنے سے قبل میں نے خشک جھاڑیوں اور لکڑیوں کا انبار برآمدے میں اکٹھا کرلیا۔ یہ لکڑیاں صبح تک ہمارے جسموں کو آسودگی کا سامان مہیا کرسکتیں تھیں۔

لیکن میری خام خیالی ثابت ہوئی۔ آدھی رات کے بعد لکڑیاں ختم ہوگئیں اور طوفانی ہواؤں کی بدولت ہمارے جسم یخ بستہ قلفیوں کی مانند جمنے لگے۔ ہم اٹھ کر مندر کے اندر آگئے۔ یہاں ہواؤں کے زور میں کسی حد تک کمی تھی۔ لیکن سردی کی فضا بدستور قائم تھی۔

ہم مختلف کونوں میں دبک کر بیٹھ گئے۔ مندر کی زمین برف کی سل کی مانند سخت اور سرد تھی۔ سردی کپڑوں کے راستے جسم میں گھس رہی تھی۔ میں نے کئی دفعہ دل میں تہیہ کیا کہ مندر سے باہر نکل کر لکڑیاں جلانے کے لیے لے آؤں۔ لیکن

ہمت نے ساتھ نہیں دیا۔ طوفانی بارش میں آدھی رات کے وقت باہر جاکر گھپ اندھیرے میں لکڑیاں تلاش کرنا آسان کام نہیں تھا۔ کہیں قریب پہاڑ پر بجلی گری۔

مندر کے اندر کا ماحول مختصر وقت کے لیے روشن ہوا۔ میری نگاہوں نے کنول کے جسم کو تلاش کیا۔ وہ دروازے کے پاس کونے میں سمٹی ہوئی گٹھڑی کی مانند لیٹی ہوئی تھی۔ میں اٹھ کر اُس کے پاس آ گیا۔ کمرے میں دوبارہ اندھیرا طاری ہوگیا تھا۔ چند لمحے بت بن کر کھڑے رہنے کے بعد میں نے کنول کے جسم کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

اُس نے مزاحمت کی کوشش نہیں کی۔ میں اُس کے قریب فرش پر لیٹ گیا۔ طوفان گزر گیا۔ صبح مطلع بھی صاف ہوگیا۔ سورج نکلتے ہی ہم دونوں سرد صبح کے درمیان ستمری کی طرف اترنے لگے۔

گزشتہ تمام رات برسنے والی بارش کی وجہ سے جنگل کے درخت دھل کر نکھر گئے تھے۔ اُن کا سبز رنگ آنکھوں کو بہت بھلا لگ رہا تھا۔ ہمیں جنگل کی چکنی اور پھسلنے والی مٹی پر چلنا کچھ دشوار محسوس ہو رہا تھا۔ ابھی ہم نے آدھے گھنٹے کا سفر طے کیا تھا کہ ستمری سے چند لوگ ہماری مدد کے لیے پہاڑ کی طرف آ گئے۔

انہوں نے ہمیں بتایا کہ طوفانی بارش اور پہاڑی ریلے کی وجہ سے دریائے کاویری کا پل ٹوٹ گیا ہے وہ کشتی میں سوار ہوکر بمشکل تمام پہاڑ کی طرف آنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اُن کے ہاتھوں میں کمبل اور چائے کا سامان تھا۔ ہم دونوں نے مختصر ناشتہ کیا۔ پھر کمبل اوڑھ کر پہاڑ سے نیچے اترنے لگے۔ دریائے کاویری کا پانی خوفناک منظر پیش کر رہا تھا۔ لکڑی کے پل کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔ کشتی کے ملاح جنگل کے کنارے کھڑے ہمارے منتظر تھے۔ ہم کشتی میں بیٹھ گئے۔

اور بپھری ہوئی موجوں کا مقابلہ کرتے ہوئے آدھے گھنٹے کے بعد دوسری طرف کی حدود میں داخل ہوگئے۔ گاؤں پہنچنے کے بعد کنول اپنے گھر چلی گئی۔ میں بھی تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ گھر آ گیا۔ دوپہر تک مجھے سخت بخار نے آ گھیرا۔ گاؤں کے حکیم کو بلایا گیا۔ اُس نے دوائی دی۔ لیکن کچھ اضافہ نہ ہوا۔ بخار کی شدت میں ہر آنے والے لمحے کے ساتھ اضافہ ہونے لگا۔

آخری وقت میں، میں نے ہذیان بکنا شروع کردیا۔ مجھے شدت کے ساتھ کنول کی کمی کا احساس ہو رہا تھا۔ میں اُسے دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔

میری طبیعت کی ناسازی سے پریشان ہوکر پنڈت نے مندر جانا ترک کردیا۔ دوسرے دن شام کے وقت جب میں مدہوشی کے عالم میں بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ تب مجھے کنول کی آواز سنائی دی۔ میں نے جھٹکے کے ساتھ آنکھیں کھول دیں۔ وہ ساتھ والے کمرے میں پنڈت اور ساوتری کے ساتھ بات چیت کر رہی تھی۔ میں چارپائی سے اُتر کر ساتھ والے کمرے میں آ گیا۔ پنڈت نے مجھے باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔ تو اُس کے چہرے پر حیرت طاری ہونے لگی۔

ساوتری کے چہرے پر بھی حیرانی کے تاثرات تھے۔ کنول چارپائی کے قریب زمین پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ میرے کمرے میں داخل ہونے کے باوجود بھی اُس نے میری طرف مطلق نہیں دیکھا۔ مجھے اُس کی بے رخی ایک آنکھ

نہیں بھائی۔ پنڈت نے مجھے اُس کے سامنے رکھی ہوئی چار پائی پر بٹھا دیا اور فکر مند لہجے میں بولا۔

"تمہیں کمرے سے باہر نکلنے کی کیا ضرورت تھی۔ بیماری میں اضافہ بھی ہوسکتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"کنول کی آواز سنی تو سنتو کی خیریت دریافت کرنے کے لیے چلا آیا۔ وہ کیسا ہے؟" پنڈت بولا۔

"پہلے سے بہتر ہے تمہیں چنتا کرنے کی ضرورت نہیں ہے بھگوان اُسے جلد صحت یاب کردے گا۔" کنول پنڈت سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

"پنڈت جی آپ دو دنوں سے مندر نہیں آئے مجھے آپ کے لیے چنتا تھی۔ کل کا دن شش وپنج کی نذر ہوگیا آج میں نے دل میں پکا تہیہ کیا کہ آپ کی خیریت دریافت کرنے ضرور جاؤں گی۔" پنڈت سرد لہجے میں بولا۔

"تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا مندر کی باتیں اگر مندر میں ہوں تو زیادہ بہتر ہوتا ہے۔" کنول شرمندہ لہجے میں بولی۔

"میں آپ کو تکلیف دینے کی معافی چاہتی ہوں۔ لیکن ہنومان کے مندر میں رات گزارنے سے مجھے بہت فائدہ ہوا اگر آپ اجازت دیں تو ہفتے میں ایک دفعہ وہاں دیے روشن کرآؤں۔" پنڈت نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

"نادان لڑکی...... بھگوان کے آگے دیے روشن کرنے کے لیے پنڈت سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر تم میں ہمت ہے تو روزانہ پوجا پاٹ کے لیے مندر چلی جاؤ۔" کنول زمین سے اٹھ کر کھڑی ہوگی۔ پھر میری نگاہوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

"بھگوان کی خوشنودی کے لیے میرے لحاظ سے یہ بہت کم ہے اور پہاڑ کے اوپر مندر میں بہت سکون ہے۔ اُس سکون کی خاطر میں روزانہ مندر جاسکتی ہوں۔" اُس کی بے اعتنائی کی وجہ سے میرے دل کو جو صدمہ پہنچا تھا آخری گفتگو کو سن کر اڑنچھو ہوگیا۔ ساوتری کی جہاندیدہ نگاہوں سے بھی کنول کی معنی خیز گفتگو پوشیدہ نہ رہ سکی۔ وہ تلخ لہجے میں بولی۔

"لڑکی پوجا پاٹ کو چھوڑ کر اگر تم اپنے پتی کی خدمت کی طرف توجہ دو تو تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہوگا۔ وہ تمہاری توجہ کا مستحق ہے اور تمہارے دونوں جنموں کی بہتری اُس کی خدمت میں پوشیدہ ہے۔ گھر لوٹ جاؤ اور اُس کی خدمت میں دن رات ایک کردو۔" سرد ماحول کو محسوس کر کے کنول گھر سے باہر نکل گئی۔ اُس کے جانے کے بعد ساوتری نفرت بھرے لہجے میں بولی۔

"مجھے اس کے لچھن ٹھیک نہیں لگتے۔ آئندہ اسے ہمارے گھر میں نہیں آنا چاہیے۔" پنڈت نے کوئی جواب نہیں دیا اور میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آگیا۔ مجھے اپنے جسم میں زندگی انگڑائی لیتی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔ جسم ہلکا پھلکا ہوگیا۔ اب میں شدت کے ساتھ دوسرے دن کا منتظر تھا۔ وہ رات بہت طویل ثابت ہوئی۔

کروٹیں بدلتے رہنے کی وجہ سے مجھے اپنا تمام جسم مشین میں دھنکی ہوئی روئی کی طرح محسوس ہونے لگا تھا۔ بالآخر رات گزر ہی گئی۔ صبح منہ اندھیرے پنڈت میرے کمرے میں آیا اور طبیعت دریافت کرنے کے بعد اُس نے مجھے مندر میں آنے کی تاکید کی۔

میں نے طبیعت کی ناسازی کا بہانہ بناتے ہوئے جواب دیا۔

”بخار تو اتر گیا ہے۔ تاہم جسم میں کمزوری ابھی باقی ہے۔“ پنڈت شک بھری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کمرے سے باہر چلا گیا۔ اُس کے جانے کے بعد میں نے نہایت اہتمام کے ساتھ غسل کیا اور ناشتہ کر کے اپنے کمرے میں آ گیا۔ میرے کمرے کی کھڑکی مکان کے پچھلے حصے کی طرف کھلتی تھی۔ اُس کھڑکی کے ذریعے میں مکان سے باہر نکل آیا۔ پھر تیز قدموں کے ساتھ دریائے کاویری کی طرف چل دیا۔ مجھے کامل یقین تھا کہ وہ مندر میں ضرور آئے گی۔ دریا کا پل عبور کرنے کے بعد میں نے جنگل میں قدم رکھ دیا۔ موسم معتدل اور فضا خوشگوار تھی۔ چمکیلی دھوپ جنگل پر مسلط تھی۔ نیلے آسمان پر سفید بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ جنگل پر منحوس خاموشی اور سکوت طاری تھا۔ میں نے سرشاری کے عالم میں جنگل کو عبور کیا اور پہاڑ کے اوپر چڑھنے لگا۔ یہاں گھنے درختوں کی وجہ سے ہلکی تاریکی کی چادر تنی ہوئی تھی۔ جنگل کے بندروں نے چیختے ہوئے میرا خیر مقدم کیا اور میں لاپرواہی کے عالم میں چوٹی کی طرف بڑھنے لگا۔ میرے دماغ میں وہ الفاظ ترتیب دینے کے باوجود بھی بے ترتیب ہوتے چلے جا رہے تھے۔ جو کنول کو مخاطب کر کے اپنے دل کی کیفیت کو بیان کرنے کے لیے میں سوچ رہا تھا۔ اُن الفاظ کو مرتب کرتے ہوئے مجھے وقت گزرنے کا بالکل بھی احساس نہیں ہوا اور میں پہاڑی کو عبور کر کے مندر کی طرف آ گیا۔ میری حساس ناک نے اتنی دور سے بھی دیے جلنے کی مخصوص بو کو محسوس کر لیا وہ وہیں تھی۔ میں نے بھاگتے ہوئے مندر میں قدم رکھا اور کمرے میں جھانکا کنول بھگوان کی مورتی کے سامنے سر جھکائے کسی چینی گڑیا کی طرح بیٹھی

تھی۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں اور ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ وہ گلابی رنگ کی شلوار قمیض میں ملبوس تھی میری طرح وہ بھی نہایت اہتمام کے ساتھ تیار ہو کر آئی تھی۔ اُس نے میرے قدموں کی آہٹ کو محسوس کرتے ہوئے آنکھیں کھول دیں اور گردن کو موڑ کر میری طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھیں سرے سے لبریز تھیں۔ میں وقتی طور پر اُن میں کھو کر رہ گیا۔ وہ مسکراتے ہوئے میرے استقبال کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے بے اختیاری کے عالم میں اُسے بانہوں میں بھر لیا۔ اُس نے احتجاج کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ میرے سینے کے ساتھ سر لگاتے ہوئے پُرشکوہ لہجے میں بولی۔

”میں صبح سے تمہارے انتظار میں مندر کی مورتی کے سامنے بیٹھی ہوں۔ تم نے آنے میں بہت دیر کر دی۔“ میں نے سرشاری کے عالم میں جواب دیا۔

”صبح پنڈت کے مندر جانے کے بعد میں نے کمرے کو اندر سے بند کیا اور کھڑکی کے راستے باہر نکل کر یہاں چلا آیا۔ اس سے زیادہ جلدی ممکن نہیں۔“ ہم مندر کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔ اُس نے سر میری گود میں رکھ دیا اور میں اُس کے بالوں کو سہلانے لگا۔ وہ مجھے اپنے اور سنتو کے رشتے کے متعلق بتانے لگی۔ اُن دونوں کا ازدواجی رشتہ چند مجبوریوں اور لاچاریوں پر مشتمل تھا۔ جس میں محبت کا عمل دخل نا ہونے کے برابر تھا۔ میں نے جب اُسے مسلمان ہونے کے متعلق بتایا تب وہ بولی۔

”مجھے تمہاری مذہبی حیثیت سے کوئی سروکار نہیں۔ ہمارے رشتے کے لیے یہی جواز کافی ہے کہ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور محبت

کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔‘‘ میں نے مطمئن انداز میں آنکھیں بند کرلیں۔ ڈھائی بجے کے قریب کنول نے مندر کے اندر رکھی ہوئی چھوٹی سی پوٹلی کو کھولا۔ اُس کے اندر آلو کی بھجیا اور پودینے کی چٹنی رکھی ہوئی تھی۔ ہم دونوں نے کھانا کھایا اور دوبارہ ایک دوسرے کی رفاقت میں گم ہوگئے۔ مغرب سے کچھ پہلے مجھے آہٹ کا احساس ہوا۔ میں نے ہڑبڑا کر پہاڑ سے نیچے جنگل کی طرف نگاہ دوڑائی ۔ جنگل بندروں اور پرندوں کی آوازوں سے گونج رہا تھا۔ وہ بلاشبہ کوئی تھا۔ لیکن صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں ہڑبڑا کر سیڑھیوں سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ کنول بھی خوفزدہ نگاہوں سے اردگرد کا جائزہ لے رہی تھی۔ قدموں کی آہٹ اب واضح سنائی دینے لگی تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھا۔ مندر کے سامنے سے ہوتا ہوا پچھلے حصے کی طرف جارہا تھا۔ پھر یکدم مندر کی پچھلی دیوار سے ستمری کے پانچ جوان ہاتھوں میں کلہاڑیاں تھامے نمودار ہوئے۔ اُن کے پیچھے پنڈت بھی تھا۔ اُس کا چہرہ غصے سے لال بھبھوکا ہورہا تھا۔ گاؤں کے پانچوں نوجوان ہم دونوں کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہوگئے۔ پنڈت نے میری طرف توجہ کیے بغیر کنول کو بالوں سے تھاما اور بیدردی کے ساتھ دھکا دے کر نوجوانوں کے حوالے کرتے ہوئے زہرخند لہجے میں بولا۔

’’اس حرافہ کو گاؤں کی طرف لے چلو ایک ایسی پتنی جو اپنے پتی کی لاش پرسے ہو کر غیر مرد کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی پھر رہی ہو۔ اُسے زندہ رہنے کا حق نہیں۔ پتی کی چتا کے ساتھ ستی کردینا چاہیے۔‘‘ میں حیرت کی تصویر بنا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ یہ سب میری توقع کے برخلاف تھا۔ لیکن مزاحمت کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ تاہم میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں پنڈت سے پوچھا۔

’’کیا سنتو مرگیا ہے۔‘‘ پنڈت نے جواب دیا۔

’’وہ سورج طلوع ہونے سے قبل مرگیا تھا۔ یہ اُس کی لاش کو چھوڑ کر یہاں آئی ہے۔‘‘ پنڈت نے مجھے بازوؤں کے پاس سے تھاما اور گھسیٹتا ہوا پہاڑ سے نیچے جنگل کی طرف اترنے لگا۔

☆......☆......☆

دوسری صبح تمام ستمری گاؤں مندر کے آگے بنے ہوئے میدان میں موجود تھا۔ لکڑی کی کھاٹ پر سنتو کی لاش رکھی ہوئی تھی۔ میں نے مندر کی طرف آتے ہوئے نظر بھر کر اُس کی طرف دیکھا۔ وہ عمر کے لحاظ سے کنول سے بڑا تھا۔ چہرے پر موت کی زردی پھیلی ہوئی تھی اور سفید بال ماتھے پر بے ترتیب پڑے تھے۔ مجھے پنڈت کی کرسی کے قریب زمین پر بٹھا دیا گیا۔ میدان مچھلی بازار کی سی کیفیت پیدا کررہا تھا۔ گاؤں والے ایک دوسرے کو معاملے سے آگاہ کرنے میں مصروف تھے۔ پنڈت نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر انہیں خاموش ہونے کے لیے کہا۔ پھر کرسی سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

’’کل کے واقعہ کے بعد میں نے کنول کو اُس کے شوہر کی چتا کے ساتھ ستی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ آپ سب اس بات سے باخوبی آگاہی رکھتے ہیں کہ ہندو پرم پرا میں ستی کی رسم کو کتنی اہمیت کا اختیار حاصل ہے۔ اس رسم کے بعد ہندو دھرم کی کوئی بھی پتنی اپنے پتی سے بے وفائی کرنے سے پہلے ستی کی رسم کے متعلق ضرور سوچے گی۔ اگر گاؤں کے کسی فرد کو میرے فیصلے سے اختلاف تھا تو وہ کھڑے ہو کر بیان کرسکتا ہے۔‘‘ مجھے پر خاموشی طاری رہی۔ انہیں پنڈت کے فیصلے

سے اختلاف نہیں تھا۔ لیکن مجھے بہرحال تھا۔ اس لیے اپنی جگہ کو چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ مجمع میں حیرت بھری چہ میگوئیوں کی آوازیں ابھریں۔ کچھ نفرت بھرے جملے بھی سنائی دیے۔ پنڈت نے غصیلی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ پھر تحمل مزاجی سے کام لیتے ہوئے بولا۔

''اس افسوسناک واقعے میں براہ راست ملوث ہونے کی وجہ سے تمہیں اس بات کا حق حاصل نہیں ہے کہ تم میرے فیصلے پر تنقید کرسکو۔ تاہم میں تمہیں اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع دیتے ہوئے فیصلے پر تنقید کی بھی اجازت دیتا ہوں۔'' میں نے پنڈت سے پوچھا۔

''مجھے اور کنول کو گناہ میں سرزد ہوتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا۔ پھر آپ اتنا بڑا فیصلہ صرف شک کی بنیاد پر کیسے کرسکتے ہیں۔'' پنڈت طنزیہ لہجے میں بولا۔

''مندر کی سیڑھیوں پر کنول کو تمہاری آغوش میں لیٹے ہوئے میرے علاوہ ستمری کے بہت سے نوجوانوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ہندو دھرم کے انوسار کوئی بھی شادی شدہ کنیا ان باتوں کی مرتکب نہیں ہوسکتی اگر ہوگی تو اُسے ستی کردینا ایک پنڈت پر جائز ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''ہندو دھرم میں یہ سزا صرف پتنی تک ہی کیوں محدود ہے۔ مرد اس سے کیوں خارج ہیں۔'' پنڈت نے میرے بجائے گاؤں کے مجمع سے مخاطب ہو کر کہا۔

''یہ ایک نہایت اہم سوال ہے۔ میں اس کا جواب دے کر تم سب کی معلومات میں اضافہ ضرور کروں گا۔ ہندو دھرم میں پتی کی موت کے بعد پتنی کو دوسری شادی کی اجازت حاصل نہیں ہے اور فطری طور پر پتی کی موت کے بعد اُس کی منوں کامناؤں میں اضافہ ہونا بھی کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ ان کامناؤں کی تکمیل کے لیے وہ غلط راستے کا انتخاب بھی کرسکتی ہے۔ ستی کی رسم غلط راستے کے اس چناؤ کی روک تھام کے لیے بنائی گئی ہے۔ چونکہ پتی کو دوسری شادی کا اختیار ہوتا ہے۔ اس لیے یہ رسم اُس پر عائد نہیں ہوتی۔'' مجمع میں تحسین آمیز کلمات گونجے۔ میں نے تلخ لہجے میں پنڈت سے پوچھا۔

''اگر آپ کی لڑکی ایسی بے وفائی کی مرتکب ہوتو کیا اُس پر بھی ستی کی رسم لازم وملزوم ہوگی۔ یا پھر ایک معتبر پنڈت کی لڑکی ہونے کے ناطے اس کے لیے کوئی متبادل راستہ موجود ہے۔'' پنڈت نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

''مجھے یقین ہے کہ آشا میری تعلیم وتربیت کی بدولت ایسی غلطی نہیں کرے گی۔ اس کے باوجود بھی میں پتی کی موت پر اپنی لڑکی کو ستی کرنے پر فخر محسوس کروں گا۔ اس کے لیے مجھے آشا کی بے وفائی کے جواز کا بھی انتظار نہیں کرنا ہوگا۔ پتی کی موت کے بعد پتنی کی زندگی کا بھلا کیا مقصد...... اُسے باخوشی اپنے آپ کو ستی ہونے کے لیے پیش کردینا چاہیے۔'' مجمع نے ایک دفعہ پھر پنڈت کے خیالات کو سراہتے ہوئے اُسے داد دی۔ وہ پنڈت کی عظمت کے معترف ہو چکے تھے۔ پنڈت نے ہاتھ اُٹھا کر انہیں خاموش ہونے کے لیے کہا۔ پھر مجھے کاندھے کے پاس سے تھام کر میرا رخ گاؤں والوں کی طرف کرتے ہوئے بولا۔

''میرا لڑکا آپ کے سامنے ہے۔ اس کے متعلق آپ جو فیصلہ کریں گے مجھے منظور ہوگا۔'' مجمع میں خاموشی طاری ہوگئی۔ پھر ستر اسی سال کا بوڑھا اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

''رام پرشاد تمہارے لڑکے سے وہ پاپ

سرزد ہوا ہے۔ جس کی سزا کے طور پر اگر اسے سنتو
کی چِتاء میں جھونک دیا جائے تو کم نہیں ہوگا۔ لیکن
ستمری گاؤں کے لیے تمہاری خدمات کو مدنظر
رکھتے ہوئے میں صرف اسے گاؤں سے بدر
کرنے کی سفارش کرتا ہوں۔ اسے کہو گاؤں سے
دور چلا جائے اور دوبارہ یہاں نہیں آئے۔''
گاؤں والوں نے بوڑھے کی ہاں میں ہاں ملائی
اور پنڈت کے اٹھتے ہی گاؤں والے اپنے
گھروں کی طرف چل دیے۔

☆......☆......☆

شام کے وقت پنڈت اپنے سر کو کپڑے سے
باندھے چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ ساوتری اُس کے
پاؤں دباتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''رام جی اس تمام کیے دھرے کے قصوروار
آپ خود ہیں۔ نا اس مُسلے کو گھر لاتے اور نا ہی
آج یہ دن دیکھنا پڑتا۔'' پنڈت سوچ میں گم لہجے
میں بولا۔

''میں تہیہ کر چکا ہوں۔ صبح سری اور آشا کے
پھیرے پڑھوا دوں گا۔ بادل پور گاؤں میں
میرے چھوٹے بھائی کا لڑکا سوم پرشاد رہتا ہے۔
یہ دونوں وہاں جا سکتے ہیں۔'' میں نے انکار میں
سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''میں شادی نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ اگر مجھے
مجبور کیا گیا تو احمد آباد چلا جاؤں گا۔ وہاں مولوی
عبدالرحمن کا مدرسہ ہے۔ جہاں دینی تعلیمات کے
علاوہ مفت رہائش بھی دی جاتی ہے۔'' ساوتری
دل تھام کر رہ گئی۔ پنڈت کے چہرے پر بھی
زلزلے کے آثار پیدا ہوئے اور وہ تھکے ہوئے
لہجے میں بولا۔

''تم نے ہماری اچھائیوں کا خوب بدلہ دیا۔
اچھا ہوتا میں تمہیں ہندو بلوائیوں کے نرغے میں
چھوڑ دیتا۔ آج مجھے یہ دن نہیں دیکھنا پڑتا۔'' میں
نے جواب دیا۔ ''اُس احسان کے بدلے میں
آپ نے میرا دھرم بدل دیا۔ مجھے مندر میں پوجا
پاٹ کے لیے جانے پر مجبور کیا۔ میری زندگی کو دو
راستوں میں تقسیم کر کے رکھ دیا۔ میں نے انکار
نہیں کیا لیکن اب حد ہو چکی ہے۔ آپ کے دھرم
کو اس بات کی قطعی اجازت نہیں ہے کہ وہ کسی
معصوم لڑکی کی زندگی اور موت کا فیصلہ کر سکے۔''
ساوتری بولی۔

''رام جی اسے احمد آباد جانے دیجیے یہ نمک
حرام ہے۔ اگر اس میں تھوڑی سی بھی غیرت ہوتی
تو آپ کو کبھی بھی نراش نہیں کرتا۔'' میں نے اُس
کی باتوں کو نظرانداز کرتے ہوئے پنڈت کے
دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھاما اور گلوگیر
لہجے میں کہا۔

''میں آج بھی آپ کا ہر حکم ماننے کے لیے
باخوشی آمادہ ہوں۔ ہندو مت کو دل سے قبول
کر کے اس کا علم حاصل کرنے کے لیے بھی تیار
ہوں۔ اگر آپ کنول کو ستی کرنے سے انکار
کر دیں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ آپ کے لیے
مشکل ہوگا۔ لیکن ناممکن نہیں۔ آپ ستمری مندر
کے بڑے اور معتبر پنڈت ہیں۔ فیصلہ کرنا اور
اُسے قبول کرنا آپ کے اختیار میں ہے۔'' میری
بات سن کر ساوتری کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے
لگیں۔ تاہم پنڈت کے ماتھے پر سوچ کی گہری
لکیریں دکھائی دینے لگیں۔ وہ مقصد کی کامیابی
کے نزدیک پہنچنے کے بعد نہایت مشکل دھرم سنکٹ
میں پھنس کر رہ گیا تھا۔ اپنے فیصلے کو تبدیل کرنے
کے بعد اُس کی حیثیت گاؤں والوں کی نگاہوں
میں متاثر ہو سکتی تھی اور فیصلہ تبدیل کیے بغیر وہ
مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا' تاہم اُس کی

نگاہوں میں مقصد کی حیثیت عہدے کے لحاظ سے کچھ زیادہ تھی۔ اس لیے چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد وہ بولا۔

''ٹھیک ہے...... لیکن تم کنول سے کسی بھی قسم کا تعلق نہیں رکھو گے۔ میں اُسے کل صبح ستمری سے دور کہیں بھجوا دوں گا۔ تمہیں اُس کی پوشیدگی سے بے خبر رکھا جائے گا۔'' میں نے غصیلے لہجے میں پنڈت سے مخاطب ہو کر کہا۔

''اگر کنول سے مجھے جدا کیا گیا تو میں بھی آشا سے شادی نہیں کروں گا۔ آپ کو اس بات کا لحاظ رکھنا ہوگا۔'' پنڈت سرد لہجے میں بولا۔

''ٹھیک ہے تم کل ہی بادل پور گاؤں کے لیے روانہ ہو جاؤ۔ آج سے ایک سال قبل میری درخواست پر وہاں حکومت کی طرف سے مندر کے لیے زمین الاٹ کی گئی تھی۔ لیکن عمارت کی تعمیر کے لیے میرے پاس رقم نہیں تھی۔ تمہیں بادل پور گاؤں کی زمین پر نا صرف مندر تعمیر کرنا ہوگا۔ بلکہ رقم کے حصول کے لیے اردگرد گاؤں اور شہروں میں جا کر چندہ بھی جمع کرنا ہوگا۔ میں نے سوم پرشاد کو تمہاری آمد سے مطلع کر دیا ہے۔ وہ تمہارے بالوں پر استرا پھروا کر دھوتی چادر مہیا کر دے گا۔ تمہاری رہائش اُس کے گھر میں ہوگی اور تم میرے احکامات کا پابند ہو گے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ تمام رات اپنے اور کنول کے متعلق سوچتے ہوئے گزر گئی۔

صبح میں پنڈت کے ساتھ مندر آ گیا۔ لوگوں کا ہجوم میدان میں جمع ہونے لگا تھا۔ یہ ہجوم صرف ستمری کے رہائشیوں پر مشتمل نہیں تھا۔ بلکہ اردگرد گاؤں کے لوگ بھی اُن میں موجود تھے۔ اُن سب کے پُرتجسس چہرے کنول کو دیکھنے کے لیے بے تاب تھے۔ وہ کنول کو سنتو کی چتاء پرستی ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے۔ ہندو دھرم کے انوسار اگر پتنی خود اپنے آپ کو پتی کی چتا پرستی ہونے کے لیے پیش کر دے۔ تو اُس کے اگلے سات جنم بہتر ہو سکتے تھے اور وہ عزت و احترام کے ان درجوں پر فائز ہو جاتی۔

جن کو حاصل کرنے کے لیے اُسے سات جنم پوجا پاٹ شوہر کی خدمت اور دوسری مختلف تپسیا کے علاوہ نا جانے کتنی محنت کرنا پڑتی۔ بہرکیف پنڈت نے مندر کی سیڑھیوں پر کھڑے ہوتے ہوئے لوگوں کے ہجوم سے مخاطب ہوتے ہوئے انہیں بتایا کہ سنتو کی ودواہ کنول گزشتہ رات مکان سے فرار ہو گئی ہے۔ اس لیے ستی کی رسم کو وقتی طور پر ملتوی کیا جاتا ہے۔ پنڈت کے چیلے اُس کی تلاش میں نکل چکے ہیں۔ توقع ہے کہ شام سے پہلے اُسے تلاش کر کے ستمری لے آیا جائے گا۔ مجمع والوں کے چہروں پر مایوسی کے بادل چھانے لگے۔ انہیں پنڈت کی باتوں پر اعتبار تھا۔ تاہم گزشتہ روز مجھے گاؤں بدر کرنے والے بوڑھے نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔

''پنڈت جھوٹ نہ بولو کنول فرار نہیں ہوئی بلکہ اُسے فرار کیا گیا ہے۔ رات کو میں نے حاجت کی فراغت کے لیے قریبی کھیتوں کا رخ کیا۔ تو میں نے اپنی آنکھوں سے پنڈت کے آدمیوں کو کسی عورت کے ساتھ کھیتوں سے دور ستمری کی سرحد کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ عورت سیاہ چادر میں ملبوس تھی۔ اس لیے میں اُس کا چہرہ نہیں دیکھ پایا۔ لیکن جسامت اور قدبت سے اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ کنول ہی تھی۔'' لوگوں کے ہجوم میں مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے مشابہہ

آوازوں نے جنم لینا شروع کیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اونچی آواز میں مجمع سے مخاطب ہو کر کہا۔

"بوڑھے کے کہنے کے مطابق قد و قامت اور جسامت کے لحاظ سے وہ عورت دکھائی دیتی ہے لیکن کنول سترہ اٹھارہ سال کی لڑکی ہے۔ ستر اسی سال کی عمر میں بوڑھے کی آنکھوں پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا اور رات کے گھپ اندھیرے میں تو بالکل بھی نہیں۔ اس کے علاوہ کنول کے فرار میں پنڈت کا کوئی ذاتی مفاد نہیں پایا جاتا۔ ستی کی رسم اُس کے کہنے پر ہی ادا کی جارہی تھی۔" بوڑھا بولا۔

"کنول اور تمہارے تعلق سے تمام ستمری واقف ہے۔ اولاد کی محبت باپ کو دھرم کے فیصلے تبدیل کرنے کے لیے مجبور کرسکتی ہے۔ تم نے پنڈت کو مجبور کیا کہ وہ رات کے اندھیرے میں کنول کو ستمری سے دور بھجوادے۔" میں نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

"میں آج بادل پور گاؤں جارہا ہوں۔ پنڈت کی درخواست پر حکومت کی طرف سے وہاں مندر کی تعمیر کے لیے زمین الاٹ کی گئی ہے۔ اُس زمین پر مندر کی تعمیر کی ذمہ داری میں نے اٹھائی ہے۔ اگر گاؤں والوں میں سے کوئی ساتھ چلنا چاہے تو مجھے اعتراض نہیں ہوگا۔ وہاں مندر کی تعمیر کے علاوہ کنول کہیں نہیں ہوگی۔" گاؤں کے ہجوم میں تعریفی کلمات ابھرے اور بوڑھے کا جوش و خروش اُن تعریفی کلمات کے درمیان دب کر رہ گیا۔ سنتو کی چتا کا کریا کرم مندر سے کچھ دور واقع شمشان گھاٹ میں کردیا گیا اور میں اپنا سامان سمیٹ کر بادل پور گاؤں چلا گیا۔

☆......☆......☆

سوم پرشاد اچھے دل و دماغ کا پڑھا لکھا انسان تھا۔ قریبی قصبے کے اسکول میں ٹیچر تھا۔ اُس کی بیوی نرملا درمیانی عمر کی صحت مند عورت تھی۔ اُن دونوں نے نہایت خوش دلی سے میرا خیر مقدم کرتے ہوئے مندر بنانے کی ذمہ داری کو سراہا۔ دوپہر کے کھانے میں سرسوں کا ساگ اور دہی کی لسی تھی۔ میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اس لیے خوب ڈٹ کر کھایا۔ کھانے کے بعد مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ میں اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ نرملا نے میرے لیے کمرہ درست کردیا تھا۔

میں نے اپنے مختصر سامان کو ترتیب دیا اور سونے کی نیت سے لیٹ گیا۔ سوم پرشاد کا گھر دو کمروں پر مشتمل تھا۔ میرے ساتھ والا کمرہ اُن دونوں کی رہائش کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ کمروں کے سامنے برآمدہ تھا اور برآمدے کے آگے اینٹوں کا بنا ہوا صحن تھا۔ صحن کے کونے میں برگد کے درخت کی شاخیں کافی حصے پر سایہ فگن تھیں۔ جن کے نیچے بھوری رنگ کی بکری بندھی تھی۔ بکری کا پھولا ہوا پیٹ اس بات کی نشاندہی کرتا تھا کہ وہ بچہ دینے والی تھی۔ چارپائی پر لیٹتے ہی میں نے خراٹے لینے شروع کردیے۔ شام کے سات بجے میری آنکھ کھلی سوم میرا منتظر تھا۔ وہ مجھے بادل پور میں واقع اُس زمین کی طرف لے آیا۔ جو حکومت کی طرف سے الاٹ کی گئی تھی۔ زمین گاؤں سے کچھ ہٹ کر تھی اور اُس پر شہتوت کے درخت لگے ہوئے تھے۔

میں نے زمین کا معائنہ کیا اور گھر آنے سے قبل بالوں پر استرا پھروادیا۔ نرملا نہایت اہتمام سے تیار ہو کر ہم دونوں کی منتظر تھی۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھیں سرمے سے لبریز تھیں۔ مانگ میں سیندور اور ہاتھوں میں مہندی لگی تھی۔ وہ سرخ

رنگ کی شلوار قمیض پہنے ہوئے تھی۔ ہم تینوں نے خاموشی کے ساتھ کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد میں کمرے میں آ گیا۔ رات کو دیر سے نیند آئی۔ تمام رات برآمدے میں پازیب کی ہلکی جھنکار سنائی دیتی رہی۔ صبح کے قریب خاموشی طاری ہوگئی۔ ناشتہ کرنے کے بعد میں اور سوم اکٹھے گھر سے باہر نکل آئے۔ ہم دونوں کی متفقہ رائے کے مطابق میں نے کام کا آغاز سوم کے اسکول سے کیا۔ اسکول بادل پور گاؤں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ہم آدھے گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد وہاں تک پہنچ گئے۔ عمارت بارہ کمروں اور دس ٹیچروں پر مشتمل تھی۔ میں نے ٹیچروں اور بچوں کو میدان میں جمع کیا اور سات جنموں کی کہانی سنانے کے بعد انہیں مندر کی تکمیل اور اپنے مقصد سے آگاہ کیا۔

بچوں اور ٹیچروں نے میری باتوں کو نہایت توجہ کے ساتھ سنا...... اور حسب توفیق مدد کی۔ آدھے گھنٹے کے بعد میں مختصر رقم کو اپنے ساتھ لائے ہوئے تھیلے میں ڈال کر عمارت سے باہر آ گیا۔ پھر دوپہر تک اردگرد کے گاؤں میں کسی بھکاری کی طرح بھیک مانگتا رہا۔ دوپہر کے قریب گھر چلا آیا۔ سوم گھر میں نہیں تھا۔ نرملا سے دریافت کرنے پر اُس نے مجھے بتایا کہ کسی کام سے قریبی شہر گیا ہے۔ شام تک واپسی ممکن ہے۔ میں نے برآمدے میں رکھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ وہ سامنے بیٹھی بہت غور سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں کی تپش کو محسوس کر کے میرے ماتھے پر پسینے کی بوندیں ابھرنے لگیں۔ اُن بوندوں کو دیکھ کر اُس نے قریب رکھے ہوئے پنکھے کو ہاتھ میں تھاما اور میرے قریب ہو کر بیٹھ کر جھلنے لگی میں نے گھبرا کر برگد کے درخت کے نیچے بندھی ہوئی بکری کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ سرد آہ بھرتے ہوئے بولی۔

"ایک دو دنوں کے بعد یہ بے زبان بھی ماں بننے والی ہے۔ مجھ ابھاگن کے مقدر میں بھگوان نے مایوسی لکھ دی ہے۔ شادی کو مدت بیت گئی۔ لیکن گود خالی کی خالی ہے۔" میں نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

"کوئی علاج معالجہ کروایا۔" وہ بولی۔

"پچھلے سال شہر کے بڑے ڈاکٹر کو دکھایا تھا۔ اُس نے صاف جواب دے دیا۔ گاؤں کے حکیم کا علاج تین مہینے چلتا رہا۔ لیکن افاقہ نہیں ہوا۔ اب قریب کے گاؤں میں رہنے والے پیر سے علاج کروا رہی ہوں۔ وہ بہت کمینہ انسان ہے کہتا ہے اگر اولاد چاہیے تو پہلے میرے ساتھ سمبندھ قائم کرو مجھے نوالہ حلق میں پھنستا ہوا محسوس ہوا۔" وہ بولے جا رہی تھی۔

"پیر سے سمبندھ قائم کرنے سے بہتر ہے کہ میری گود ہمیشہ خالی رہے لیکن اگر تم چاہو تو میری مشکل کو آسان کر سکتے ہو۔" میں نے گھبرا کر کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور چارپائی سے اتر کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

☆......☆......☆

اُس واقعے کے بعد میں نے گھر میں وقت گزارنا کم کر دیا۔ میرا زیادہ وقت گھر سے باہر چندہ جمع کرنے کے دوران گزرنے لگا۔ وہ جمعہ کا دن تھا۔ صبح ہی سے آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ کسی بھی وقت بارش ہونے والی تھی۔ موسم کے تیوروں کو مدنظر رکھتے ہوئے میں چھاتا ساتھ لے آیا تھا۔ گاؤں سے باہر نکلتے ہی طوفانی بارش کا آغاز ہو گیا۔ میں جس سڑک پر بس کے

انتظار میں کھڑا تھا اُس کے دونوں اطراف گھنے درختوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ اس لیے میں بارش کی بوچھاڑ سے کافی حد تک محفوظ تھا۔ اردگرد کے تمام گاؤں میں گھوم چکا تھا۔ اس لیے اب میں نے قریبی شہروں کا رخ کرنا شروع کر دیا تھا۔ ایک مہینے کے دوران میرے پاس اچھی خاصی رقم جمع ہو گئی تھی۔ تاہم مندر کے قیام کے لیے ناکافی تھی۔ درختوں کے درمیان میں سے سرخ و سفید بس کا ڈھانچہ نکل کر میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔ خراب موسم کی وجہ سے تمام سیٹیں خالی پڑی تھیں۔ میں نے چھاتا سنبھالا اور چادر کو جسم کے گرد اچھی طرح لپیٹنے کے بعد بس میں سوار ہو گیا۔ یہ بس احمد آباد تک جاتی تھی۔ ہر چند کے زیادہ بڑا شہر نہیں تھا۔ تاہم تجارتی مراکز میں اہمیت کی بدولت کسی بڑے شہر سے کم بھی نہیں تھا۔ یہاں اسکولوں' کالجوں اور دفاتر کی بھرمار تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہاں سے خوب رقم دستیاب ہو سکتی تھی۔ میں نے ایک خالی سیٹ کا انتخاب کیا اور چادر کو جسم کے گرد لپیٹ کر سیٹ میں دھنس کر بیٹھ گیا۔ جسم کو گرمی محسوس ہوئی۔ تو میری آنکھیں آسودگی کی بدولت بند ہونے لگیں۔ سفر لمبا تھا۔ اس لیے سونے میں مضائقہ نہیں تھا۔ کچھ ہی دیر میں گہری نیند سو گیا۔ تیز ہوا کے جھونکے نے مجھے بیدار کیا۔ میں نے آنکھیں مسلتے ہوئے اردگرد بیٹھے ہوئے مسافروں کا جائزہ لیا۔

بس میں آٹھ مسافر سفر کر رہے تھے۔ اُن میں پانچ عورتیں اور تین مرد تھے۔ دو عورتیں مجھ سے اگلی سیٹ پر بیٹھی تھیں۔ اُن میں ایک قدرے بھدی اور بھاری تن و توش کی مالک تھی۔ وہ شلوار قمیض کے اوپر سوئٹر پہنے ہوئے تھی۔ جبکہ دوسری دبلی پتلی لڑکی سیاہ چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ کنول بھی سیاہ چادر پہنتی تھی۔ اداسیوں کی سرد دھند میرے جسم کا محاصرہ کرنے لگی۔ نا جانے پنڈت نے اُسے ستمری سے کہاں منتقل کیا تھا۔ وہ زندہ تھی یا نہیں...... مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ اس ایک مہینے کے دوران پنڈت نے مجھ سے رابطہ کرنے کی قطعی کوشش نہیں کی تھی۔

میری سوچ درمیان میں ہی رہ گئی۔ اگلی سیٹ پر بیٹھی سیاہ چادر میں ملبوس لڑکی کے جسم میں ہلچل کی کیفیت پیدا ہوئی۔ اُس کے ساتھ بیٹھی ہوئی عورت نے نہایت پھرتی کے ساتھ ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھیلے میں سے کاغذ کا بنا ہوا سفید لفافہ باہر نکالا اور لڑکی کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ لڑکی نے لفافے کو منہ کے قریب کیا اور بے اختیار سب کھایا پیا اُس میں انڈیل دیا۔ میں نے ہمدردانہ لہجے میں موٹی عورت کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''لڑکی کی طبیعت خراب لگتی ہے کیا ہوا اِسے؟'' عورت نے جواب دیا۔

''چند دن قبل اسے یرقان ہوا۔ اناتھ آشرم میں طبی امداد نا ہونے کے برابر ہے۔ میں اسے علاج کی نیت سے احمد آباد لے جا رہی ہوں۔ آپ اس کے لیے پراتھنا کر دیجیے گا۔'' میں نے دعائیہ کلمات منہ میں دہرائے اور بس سے باہر نگاہ دوڑائی۔ بس کھیتوں کے درمیان بنی ہوئی سڑک پر سفر کر رہی تھی۔ بارش کی شدت میں کمی واقع ہونے لگی تھی۔ تاہم بوندا باندی کا سلسلہ جاری و ساری تھا۔

ہوا میں خنکی کا عالم تھا۔ لڑکی نے فراغت کے بعد کھڑکی کھول کر لفافے کو باہر پھینک دیا۔ ہوا کے سرکش جھونکے نے بس کے نرم گرم ماحول کا محاصرہ کیا۔ لڑکی کے سر پر پہنی ہوئی چادر یکلخت

سرک گئی اور اُس کا چہرہ مختصر وقت کے لیے نمایاں ہوا۔ پھر اُس نے کھڑکی بند کر کے دوبارہ چادر اوڑھ لی۔ اس مختصر لمحے کے دوران میں نے جو کچھ دیکھا۔ اُس نے مجھے پچھلی یادوں میں گم کر دیا۔ لڑکی کی شکل حیرت انگیز طور پر کنول سے مشابہت رکھتی تھی۔ تاہم اُس کا چہرہ یرقان کی بدولت زرد ہو رہا تھا اور اُس پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ کنول ایسی نہیں تھی۔ اُس کا چہرہ شاداب اور رنگت سفید دودھ کی مانند بے داغ تھی۔ بال سیاہ رنگ کے لچھے دار تھے۔ مجھے مندر میں گزرنے والے مختصر دن یاد آنے لگے۔ میں نے نہایت بے دردی کے ساتھ انہیں دماغ سے بے دخل کر دیا۔ اُن کے متعلق سوچنا دل کو زخمی کر دینے کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

میں نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ بس احمد آباد کے بھرے پرے بازار کے درمیان پہنچ کر رک گئی۔ یہ سبزی منڈی تھی۔ لوگوں کا ہجوم خریداری کی نیت سے دندناتا پھر رہا تھا۔ بارش رک گئی تھی۔ تاہم ماحول جل تھل تھا۔ بس کے مسافر نیچے اترنے لگے۔ میرے آگے بیٹھی ہوئی بیمار لڑکی سیٹ کے ساتھ سر لگائے گہری نیند سو گئی تھی۔ موٹی عورت نے اُسے بیدار کیا اور اپنے پیچھے آنے کے لیے کہہ کر دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

لڑکی نے چادر کو سمیٹا اور لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ اُس کے پیچھے چل دی۔ دروازے کے پاس پہنچنے کے بعد موٹی عورت نے لڑکی سے کچھ پوچھا۔ لوگوں کے شور شرابے کی بدولت میں صاف سن نہیں پایا۔ لیکن لڑکی کا نام میرے ترسے ہوئے کانوں میں رس گھول گیا۔ میں نے بے اختیار بڑبڑاتے ہوئے زیر لب نام دوہرایا۔

''کنول......'' لڑکی مڑ کر دوبارہ سیٹ کی طرف آ رہی تھی۔ اُس کا سیاہ چادر میں سے نمایاں ہوتا ہوا چہرہ اب بالکل میرے سامنے تھا۔ وہ واقعی کنول تھی۔ بیماری نے اُس کے حلیے کو بدل کر رکھ دیا تھا اور وہ پہچانی نہیں جا رہی تھی۔ سیٹ کے پاس پہنچ کر اُس نے موٹی عورت کا تھیلا اٹھایا اور چادر کو درست کرتے ہوئے بس کے دروازے کی طرف چلی گئی۔ مجھ پر سکتے کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ میں پتھر کا بت بنا اُسے بس سے نیچے اترتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ پھر جیسے چابی والے کھلونے میں اچانک ہی جان پڑتی ہے۔ اُسی طرح میرے جسم میں حرکت کے آثار پیدا ہوئے اور میں نے ہڑبڑا کر اپنی سیٹ کو چھوڑا اور بس کے اگلے دروازے کی طرف لپکا۔ بس کا ڈرائیور اور کنڈیکٹر دروازے میں کھڑے بات چیت کر رہے تھے۔ میں نے انہیں دھکیل کر راستہ بنایا۔ پھر سیڑھیوں سے کود کر نیچے اتر آیا۔

موٹی عورت اور کنول لوگوں کے ہجوم میں سڑک کو عبور کر کے سامنے گلیوں کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ میں نے جسم پر موجود چادر کو درست کیا اور لوگوں کے درمیان راستہ بناتے ہوئے سڑک کی طرف بڑھنے لگا۔ بارش رُکنے کے بعد لوگ چیونٹیوں کی مانند خریداری کے لیے گھروں سے باہر نکل آئے تھے۔ مجھے آگے بڑھنے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ بادل پور گاؤں کی طرف سے آنے والی بس سے کچھ آگے دو اور بسیں روانگی کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ اُن کے قریب لوگوں کا ہجوم تھا۔

کنڈیکٹر چلاتے ہوئے بس کی روانگی کا اعلان کر رہے تھے۔ میں نے دونوں بسوں سے کنی کتراتے ہوئے آگے بڑھنے کی کوشش کی۔

کچھ دشواری پیش آئی۔ لیکن تن من کی جدوجہد کے بعد آخرکار میں بسوں کے آگے سے ہوتا ہوا سڑک کو عبور کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ دوسری طرف چند دفاتر اور پرچون دکانوں کے علاوہ فوٹوگرافروں کی دکانیں بنی ہوئی تھیں۔ یہ کمرشل ایریا تھا۔

اُن کے پیچھے چند گلیوں پر مشتمل رہائشی علاقہ تھا۔ میں نے کمرشل ایریا کو عبور کرنے کے بعد گلیوں میں گھس کر کنول کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ لیکن وہاں اُس کا نام ونشان نہیں تھا۔ اگر وہ بیمار تھی۔ تب اُسے بس سے اترنے کے بعد قریبی ہسپتالوں کی طرف جانا چاہیے تھا۔ میں نے ارد گرد گزرتے ہوئے لوگوں سے ہسپتالوں کے متعلق پوچھ گچھ کی۔ انہوں نے بتایا کہ سبزی منڈی کے قریب دو خیراتی ہسپتال ہیں۔ میں نے اُن ہسپتالوں کی تلاش کے سلسلے کا آغاز کر دیا۔ شام تک میں نے تمام اسپتال بمعہ دوا خانے چھان مارے۔ لیکن کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ تاہم چندے کی رقم خوب جمع ہوئی۔ اندھیرا ہونے کے بعد میں واپس سبزی منڈی کی طرف چلا آیا۔ بادل پور جانے والی بس تیار کھڑی تھی۔ میں نے سیٹ منتخب کی اور بادل پور آ گیا۔ گھر پر سوم اور نرملا میرے منتظر تھے۔ کھانے کے دوران میں نے پہلی دفعہ سوم سے پنڈت کے متعلق دریافت کیا۔ اس نے بتایا۔

”چند روز قبل پنڈت نے آشا کی شادی کر دی ہے اور وہ اپنے گھر میں خوش وخرم ہے۔“ میں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ پنڈت کا گھرانہ مجھ سے ناراض تھا۔ اتنی بڑی خوشی میں مجھے شامل نہ کرنا معمولی بات نہیں تھی۔ سوم نے کھانا نہ کھانے کی وجہ دریافت کی۔ میں نے بھوک نہ ہونے کا بہانہ کیا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ تمام رات بارش طوفانی انداز میں برستی رہی۔ برآمدے میں پازیب کی جھنکار بھی متواتر سنائی دیتی رہی۔ نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی اور حالات غیر موافق تھے۔ میں پنڈت کے گھرانے کا احسان اتارنے کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن وقت اتنی تیزی کے ساتھ کروٹ بدل رہا تھا کہ مجھے کچھ سوچنے کا موقع نہیں مل پا رہا تھا۔ نا جانے رات کے کس پہر میری آنکھ لگی۔ صبح کچھ تاخیر کے ساتھ کھلی سر میں ہلکا درد تھا۔ سوم ناشتہ کرنے کے بعد اسکول جا چکا تھا۔ نرملا صحن میں بیٹھی برتن دھو رہی تھی۔ مجھے کمرے سے باہر نکلتا دیکھ کر اُس نے ناشتہ تیار کیا اور میں چارپائی پر بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگا۔ وہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ اُس کی نگاہیں میرے چہرے پر مرتکز تھیں۔ مجھے بے چینی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ افسردہ لہجے میں بولی۔

”تم کیسے پنڈت ہو...... جس کے وجود سے کسی دکھیاری کو فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔“ میں نے بے دلی کے ساتھ ناشتے سے ہاتھ کھینچ لیا اور سرد لہجے میں اُسے جواب دیا۔

”میں پنڈت نہیں ہوں...... یہ روپ کسی کا احسان اتارنے کا مرہونِ منت ہے‘ ورنہ اس میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔“ نرملا بولی۔

”مجھے تمہارے پنڈت ہونے یا نہ ہونے سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ میں تو صرف معمولی سا سمبندھ چاہتی ہوں۔“ میں اچانک ہی پھٹ پڑا۔

”معاف کرنا مجھے تمہارے دھرم کے اصولوں کی سمجھ نہیں آئی۔ پتنی پتی کی زندگی میں کسی غیر مرد کے ساتھ تعلق رکھے تو اُسے ستی کر دیا جاتا ہے۔

لیکن یہ تعلق اگر اولاد کے حصول کے لیے ہو تو مضائقہ نہیں۔ اپنے بھگوان پر وشواس کرنا سیکھو، عزت واحترام بھی ملے گا اور منوں کا منائیں بھی پوری ہو جائیں گی۔'' وہ حیرت بھرا چہرہ لیے میری باتیں سن رہی تھی۔ میں اٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا۔

☆......☆......☆

دو دن احمد آباد کی سبزی منڈی میں کنول کو تلاش کرتے ہوئے گزر گئے۔ تیسرے دن میں نے بس کنڈیکٹر سے موٹی عورت کے متعلق دریافت کیا۔ اس نے مجھے بتایا۔

''وہ ناگ پور گاؤں کے پاس واقع ندی سے بس میں سوار ہوتی تھی۔ چند دن قبل تک وہ دونوں روزانہ سفر کرتی تھیں تاہم کچھ دنوں سے انہوں نے آنا کم کر دیا ہے۔'' بادل پور گاؤں سے ناگ پور تک اناتھ آشرم کی تعداد نا ہونے کے برابر تھی۔ میں اُسے باآسانی تلاش کر سکتا تھا۔ میں نے کنڈیکٹر سے کسی بڑے اناتھ آشرم کے متعلق دریافت کیا۔ اُس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اگلے دن میں نے ناگ پور گاؤں کے اردگرد کا علاقہ چھاننا شروع کیا۔ وہ چھوٹے موٹے گاؤں کی بھرمار تھی۔ لیکن اناتھ آشرم نہیں تھا۔ سفر کے دوران میری ملاقات ادھیڑ عمر فوجی سے ہوئی اُس نے مجھے بتایا۔

''دھنک پور قصبے میں ایک اناتھ آشرم ہے۔ قصبے کا راستہ کچھ دشوار گزار ہے مجھے وہاں تک جانے کے لیے ناگ پور گاؤں سے ویگن پکڑنی ہوگی۔ میرے چہرے پر خوشی کے تاثرات ابھرنے لگے۔ کنول یقیناً موٹی عورت کے ہمراہ ویگن میں سوار ہو کر ناگ پور گاؤں آتی ہوگی۔ پھر وہاں سے بس میں سوار ہو کر احمد آباد جاتی ہوگی۔

شام ہونے والی تھی۔ اس لیے میں نے دھنک پور جانے کا ارادہ دوسرے دن تک کے لیے ملتوی کیا اور بادل پور آ گیا۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد میں اور سوم چہل قدمی کی نیت سے قریبی کھیتوں کی طرف چلے گئے۔ میرا موڈ خوشگوار تھا۔ میں نے سوم کو مشورہ دیا کہ وہ احمد آباد کے قابل ڈاکٹروں سے اولاد کے لیے مشورہ کرے۔ چند ڈاکٹروں سے میری علیک سلیک ہے۔ میں اُن سے ملاقات کا وقت لے سکتا ہوں۔'' اُس نے حیرت بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھا پھر سرد آہ بھرتے ہوئے جواب دیا۔

''میرے دولڑکے حافظ آباد کے کالجوں میں زیرِ تعلیم ہیں اور مزید کی مجھے خواہش نہیں۔'' میرے سر پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ نرملا نے مجھ سے جھوٹ کہا تھا کہ اُس کی اولاد نہیں تھی۔ وہ ایک سمبندھ کے لیے اس حد تک جا سکتی تھی۔ مجھے اس کی قطعاً توقع نہیں تھی۔ سوم میرے چہرے کو جانچتے ہوئے بولا۔

''میں جانتا ہوں کہ تم کیا سوچ رہے ہو؟ اگر تم اُس کے ساتھ سمبندھ قائم کرنا چاہو تو مجھے اعتراض نہیں ہوگا۔'' میں نے بوکھلا کر اُس کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ میری طرف توجہ دیے بغیر بولا چلا جا رہا تھا۔

''اُس کا اور میرا ساتھ بیس سالوں پر محیط ہے ان بیس سالوں کے دوران اُس نے میری اچھی اور بری عادتوں کے ساتھ مجھے قبول کیا۔ اگر میں اُس کی ایک برائی کو نظر انداز کر دوں تو شاید اُس کی چند اچھائیوں کا بدلہ چکا سکوں۔'' مجھے اُس کی واہیات سوچ پر غصہ آنے لگا۔ لیکن میں اُس کے ساتھ بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے کچھ دیر چہل قدمی کے بعد ہم دونوں واپس گھر آ گئے۔

سوال نامہ برائے رائٹر/ریڈرز

☆......آج کل زندگی کیا کہہ رہی ہے؟

☆......ماضی کے جھرکوں کو وا کرنے پر کیسا محسوس کرتی ہیں؟

☆......لکھنے کا آغاز کب کیا اور کیا مطمئن ہیں آج کل جو چھپ رہا ہے اُس سے؟

☆......تبدیلی پر یقین رکھتی ہیں؟

☆......کون سے ایسے رویے ہیں جو دکھ دیتے ہیں؟

☆......سردیوں کی بارش سے خوشی محسوس ہوتی ہے یا یاد کے جگنو آنکھوں کو نم کر دیتے ہیں؟

☆......فلموں سے دلچسپی ہے؟ کیسی فلمیں پسند ہیں؟

☆......کیسے لوگ اچھے لگتے ہیں، زندگی سے کیا سیکھا؟

☆......سچی کہانیاں کا ساتھ کیسا پایا؟

اُس رات برآمدے میں پازیب کی جھنکار نہیں سنائی دی۔ صبح میں نے ناشتہ کرتے ہوئے سوم کو بتایا۔

"میں اُن پر مزید بوجھ نہیں بننا چاہتا ہوں۔"

سوم نے کسی خاص ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ تاہم نرملا کے چہرے پر افسردگی کے تاثرات پیدا ہوگئے۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں تھی۔ اس لیے ناشتہ کرنے کے بعد بس پکڑ کر ناگ پور گاؤں کے پاس واقع ندی کی طرف آ گیا۔ دھنک پور قصبے کی طرف جانے والی ویگن میں زیادہ رش نہیں تھا۔ اِکا دُکا سیٹوں پر مسافر بیٹھے تھے۔ میں بھی ایک سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ویگن نے نہر کو عبور کیا اور پہاڑی علاقے میں داخل ہوگئی۔ راستہ دشوار گزار تھا۔ مجھے پنڈت پر غصہ آنے لگا۔ ہمارے درمیان فاصلوں کی اونچی دیوار قائم کرنے کے لیے اُس نے جان بوجھ کر دھنک پور قصبے کا انتخاب کیا تھا۔ ایک گھنٹے کے سفر کے بعد ہم قصبے کے مختصر بازار تک پہنچ گئے۔ قصبہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ تاہم فوجی چھاؤنی اور بہت بڑے مندر کے قیام کی وجہ سے اُسے اردگرد کے گاؤں اور قصبوں کی نسبت زیادہ اہمیت حاصل تھی۔

اناتھ آشرم کی عمارت آسیب زدہ کھنڈرات سے مشابہت رکھتی تھی۔ میں نے لکڑی کے پھاٹک کے پاس بیٹھے ہڈیوں کے ڈھانچے پر مشتمل بوڑھے چوکیدار سے اناتھ آشرم کے مالک سے ملاقات کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ چوکیدار پنڈت کی حیثیت کا احترام کرتے ہوئے خاموشی کے ساتھ عمارت کے اندر چلا گیا۔ میں گیٹ کے پاس لگے ہوئے برگد کے درخت کے نیچے کھڑے ہو کر اُس کا انتظار کرنے لگا۔ پانچ منٹ کے بعد وہ واپس آیا اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے گیٹ کے اندر واقع کچے حصے کو عبور کر کے برآمدے میں داخل ہوگیا۔ برآمدے میں تین کمروں کے دروازے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ ایک کو کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ دروازے کے سامنے پرانی میز کے پیچھے رکھی ہوئی کرسی پر موٹی عورت براجمان تھی۔ مجھے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ احتراماً کھڑی ہوگئی۔ میں نے نرم لہجے میں اُسے بتایا۔

"میرا تعلق ستمری گاؤں کے مندر سے ہے اور میں کنول کے ساتھ جان پہچان کی وجہ سے اُس کی خیریت دریافت کرنے کی نیت سے اناتھ آشرم میں آیا ہوں۔" موٹی عورت افسردہ لہجے میں بولی۔

"وہ بہت بیمار ہے۔ اناتھ آشرم کی مالی حیثیت اس قابل نہیں ہے کہ اس کا مستقل علاج کروایا جاسکے۔ احمد آباد کے ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اگر اسے جلد از جلد ہسپتال منتقل نہ کیا گیا تو اُس کی صحت کے لیے اچھا نہیں ہوگا۔" میں نے اُسے بتایا۔

"میں قریب کے ایک گاؤں میں مندر کی تکمیل کی نیت سے رہائش پذیر ہوں۔ تاہم میری سوچ کے مطابق مندر کی عمارت سے زیادہ اُس میں پوجا کرنے والے انسانوں کی اہمیت ہوتی ہے۔ عمارتیں تو بنتی اور ختم ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن تپسیا کرنے والوں کو ختم نہیں ہونا چاہیے۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں اپنے خرچ پر کنول کا علاج کروانا چاہتا ہوں۔" موٹی عورت کی نگاہوں میں میرے لیے مزید عزت واحترام کی پرچھائیاں نمودار ہوئیں اور وہ بھرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"پنڈت جی آپ رام کے اوتار بن کر ایک

دکھیاری دوداہ کی زندگی کو سفل کرنے کے لیے اناتھ آشرم میں آئے ہیں۔ مجھے بھلا کیا اعتراض ہوسکتا ہے میں تو آپ کی ہمیشہ ممنون رہوں گی۔''

میں نے کنول سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ وہ کرسی سے اٹھ کر کمرے سے باہر آگئی۔ برآمدے کے دائیں طرف پتلی سی گلی اناتھ آشرم کے پچھلے کمروں کی طرف جاتی تھی۔ اُس گلی کے آخر میں خشک ہوتا ہوا لان بنا ہوا تھا۔ لان کے ساتھ ایک قطار میں چند کمرے بنے ہوئے تھے۔ پہلے کمرے کے دروازے کے پاس پہنچنے کے بعد اُس نے دروازہ کھولا اور کمرے میں داخل ہوگئی کمرے میں آمنے سامنے تین دیواروں کے ساتھ پلنگ لگے ہوئے تھے۔ دو پلنگوں پر بوڑھی عورتیں بیٹھی تھیں اور تیسری پر کنول چادر سر تک اوڑھے لیٹی تھی۔ موٹی عورت نے چارپائی کے پاس جا کر اُسے پکارا۔

کنول نے چادر کو سر سے ہٹایا۔ مجھے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی تھی۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے اور بال اُلجھے ہوئے تھے۔ ہونٹ خشک اور رنگ پیلا زرد ہو رہا تھا۔ مجھے اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر اُس کی نگاہیں میرے جسم پر جم کر رہ گئیں۔ آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہوگئیں۔ وہ ہوش و حواس سے بیگانہ تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اُس کے ہڈیوں بھرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھاما۔ میرے ہاتھوں کے لمس کو محسوس کر کے اُس نے آنکھیں بند کرلیں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میرے پیچھے کھڑی ہوئی موٹی عورت نے اُس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے پُر شفقت لہجے میں کہا۔

''کنول تم کہتی تھی نا کہ تمہارا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ آج تمہارا اپنا آگیا ہے اب تم اکیلی نہیں ہو۔'' کنول کی ہچکیوں میں کمی کے بجائے اضافہ ہوگیا۔ میں نے موٹی عورت کو کمرے سے باہر جانے کے لیے کہا وہ خاموشی کے ساتھ چلی گئی۔ میں چارپائی کے کنارے پر بیٹھ گیا اور کنول کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں بولا۔

''آج دل کھول کر رولو...... تمہارے دل کا غبار ہلکا ہوجائے گا۔ میرا تم سے وعدہ ہے کہ آج کے بعد میں تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں آنے دوں گا۔'' کنول نے وارفتگی کے عالم میں میرے ہاتھوں کو بھینچ لیا اور ممنونہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی کمرے میں چارپائی پر بیٹھی ہوئی دونوں عورتیں حیرت بھری نگاہوں سے ہم دونوں کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

☆......☆......☆

دوسرے دن میں نے کنول کو ہمراہ لیا اور ویگن میں بیٹھ کر ناگ پور چلا آیا۔ ناگ پور سے احمد آباد کی بس پکڑ کر ہم سبزی منڈی آگئے۔ منڈی کے قریب ہی ڈاکٹر ستیش کا دواخانہ تھا۔ میرے ساتھ اُس کی جان پہچان نہیں تھی۔ تاہم مندر کے چندے کی نیت سے دو چار دفعہ اُس کے دواخانے پر جانے کی وجہ سے سلام دعا ضرور ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر ستیش نے کنول کا اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد مجھے بتایا۔

''یرقان بگڑ چکا ہے۔ لیکن تھوڑی سی احتیاط سے بیماری پر قابو پایا جاسکتا ہے مسئلہ یہ ہے کہ لڑکی حاملہ بھی ہے...... اور اِسے خون کی اشد ضرورت ہے۔'' مجھے اپنے سر پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ ڈاکٹر بول رہا تھا۔

''دواخانے کے پاس گورنمنٹ کا ہسپتال ہے میری ڈیوٹی صبح وہاں ہوتی ہے تم کل اسے

وہاں لے آنا۔ میں اسے وارڈ میں داخل کروا دوں گا۔" اور میں سوچ رہا تھا کہ کنول کے پیٹ میں سانس لیتا ہوا بچہ سنتو کا تھا یا پھر میرا تھا۔ اس کے متعلق جب میں نے کنول سے دریافت کیا تو اُس نے بتایا۔

"بچہ میرا ہے۔" مجھے یقین تھا کہ وہ سچ کہہ رہی تھی ایک سال قبل جب سنتو کو بیماری نے گھیرے میں لے لیا تب وہ دوبارہ چارپائی سے اترنے کے قابل نہ ہوسکا تھا۔ اپنی سترہ سالہ زندگی میں پہلی دفعہ مجھے خوشی کا احساس ہوا۔ میں نے بے اختیاری کے عالم میں اُس کے دونوں ہاتھوں کو چوم لیا اور اُس نے سرشاری کے عالم میں آنکھیں بند کرلیں۔ دوسرے دن میں نے کنول کو ہسپتال میں داخل کروادیا۔ میرے پاس پیسوں کی کمی نہیں تھی۔ مندر کی عمارت کے لیے جمع کیے ہوئے بہت پیسے تھے۔ علاج مکمل ہونے کے بعد میں دوبارہ جمع کرسکتا تھا۔ کنول کا علاج نہایت تندہی کے ساتھ شروع کردیا گیا۔ ڈاکٹر ستیش کی سفارش پر مجھے وارڈ میں رہنے کی اجازت مل گئی۔ میں صبح کام پر نکل جاتا اور دوپہر کو جلدی واپس آجاتا تھا۔

باقی ماندہ دن کنول کی خدمت کے دوران گزرتا۔ وہ نہایت تیزی کے ساتھ صحت یاب ہونے لگی۔ انہی دنوں میں نے احمد آباد میں دو کمروں پر مشتمل گھر کرائے پر لیا۔ ہسپتال سے فارغ ہونے کے بعد ہم وہاں آگئے۔ موٹی عورت سے میں نے درخواست کی کہ جب تک کنول کے بچے کی پیدائش نہیں ہوجاتی۔ وہ اُسے احمد آباد میں ہی رہنے دے۔ اُسے بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ اس لیے خاموش ہوگئی۔ حالات تیزی کے ساتھ بہتر ہونے لگے۔ آٹھ مہینے کے بعد ہمارے ہاں لڑکا پیدا ہوا زچگی کے ان ایام میں موٹی عورت جس کا نام شکنتلا دیوی تھا نے ہمارا بہت ساتھ دیا۔ بچے کی ولادت کے دوسرے دن سوم کی احمد آباد آمد ہوئی۔

اُس کے ساتھ شکنتلا اور ستمری گاؤں کا ایک جوان بھی تھا۔ میرے استفسار پر اُس نے مجھے بتایا کہ پنڈت کی طبیعت بہت خراب ہے وہ آخری سانسیں لے رہا ہے اور مجھ سے جلد از جلد ملنے کا خواہش مند ہے۔ میرا دل پسیج گیا میں نے شکنتلا کو کنول کے پاس چھوڑا اور سوم کے ہمراہ ستمری کی طرف روانہ ہوگیا۔ دوران سفر میرے دریافت کرنے پر سوم نے مجھے بتایا کہ اسے میری رہائش کے متعلق شکنتلا سے معلوم ہوا۔ پنڈت کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ میں اناتھ آشرم کی عمارت میں کنول سے ملنے ضرور جاؤں گا۔ مجھے وہیں سے تمہارے متعلق معلومات حاصل ہوسکتی تھیں۔ میں دل ہی دل میں پنڈت کی ذہانت کا گرویدہ ہوگیا۔

طویل سفر کے بعد جب ہم نے گاؤں میں قدم رکھا۔ تو رات کے آٹھ بجنے والے تھے۔ پنڈت کے گھر کی فضا سوگوار تھی۔ دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا اور سامنے والے کمرے میں لالٹین کی زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ پنڈت چارپائی پر لیٹا تھا۔ اُس کے چہرے پر موت کی زردی پھیلی ہوئی تھی۔ آنکھیں دروازے پر مرتکز تھیں۔ ساوتری اور آشا چارپائی کے کناروں پر بیٹھیں اُس کے پاؤں دبا رہی تھیں۔ مجھے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر پنڈت نے چارپائی سے اٹھنے کی کوشش کی۔ میں نے پھرتی کے ساتھ آگے بڑھ کر اُس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ وہ افسردہ لہجے میں بولا۔

''مجھے یقین تھا کہ تم صبح سے پہلے ستمری آ جاؤ گے آج میرے گھرانے کو تمہاری اشد ضرورت ہے۔ اگر تم نہ آتے تو ہم تباہ و برباد ہو کر رہ جاتے۔ میرے دریافت کرنے پر اُس نے مجھے بتایا گزشتہ روز آشا کے پتی کا ناگ پور ندی کے کنارے ایکسیڈنٹ ہوا اور وہ پرلوک سدھار گیا۔ کل صبح اُس کا کریا کرم ہے۔ گاؤں والوں کا اصرار ہے کہ اُس کے کریا کرم کے ساتھ آشا کو ستی کیا جائے۔ سنتو کی چتا پر جذبات میں کی ہوئی باتیں میرے گلے کا پھندا بن گئی ہیں۔ آشا کے پتنی کی لاش اس وقت ہسپتال میں ہے۔ گاؤں والوں کو جیسے ہی لاش دستیاب ہوگی۔ وہ یہاں آ دھمکیں گے۔ میری تم سے بنتی ہے کہ آشا کو اپنے ساتھ ستمری سے دور لے جاؤ۔ کل میں نے تمہیں ہندو بلوائیوں سے بچایا تھا۔ آج تم میری بچی کو ہندو انتہا پسندوں سے بچا کر احسان کا بدلہ چکا دو۔'' میں نے جذباتی لہجے میں جواب دیا۔

''آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں میں آپ کے احسان کا بدلہ اپنی تمام زندگی دے کر بھی اتار نہیں سکتا ہوں۔ آشا کو میں نے اپنی بہنوں سے بڑھ کر سمجھا ہے اور ایک بھائی کے ہوتے ہوئے اُس کی بہن کی زندگی پر آنچ نہیں آ سکتی ہے۔'' ساوتری اور آشا ہچکیاں لے کر رونے لگیں پنڈت بے دم لہجے میں بولا۔

''میرے پاس وقت نہایت کم ہے۔ وہ کسی بھی وقت گھر کا رخ کرنے والے ہیں اُن کے یہاں آنے سے قبل آشا کو یہاں سے دور لے جاؤ۔'' بات کے اختتام پر اُس کا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا اور آنکھیں بند ہو گئیں۔ تاہم وہ سانس لے رہا تھا۔ میں نے اپنے پیچھے کھڑے سوم کو مخاطب کر کے کہا۔

''تم چند دنوں کی چھٹی لے کر ستمری چلے آؤ' پنڈت کے گھرانے کو تمہاری اشد ضرورت ہے۔ چاہتا تو تھا کہ میں اس مشکل وقت میں ان کے قریب رہ سکتا۔ لیکن آشا کو گھر سے دور لے جانا نہایت ضروری ہے۔'' سوم نے اثبات میں سر ہلایا اور میں الوداعیہ کلمات دہراتے ہوئے آشا کا ہاتھ تھام کر گھر سے باہر نکل آیا۔ گاؤں کے باہر بڑی سڑک کے پاس سے ہمیں ٹرک میں لفٹ مل گئی۔

ٹرک نے ہمیں ناگ پر گاؤں کے پاس اُتار دیا اور ہم احمد آباد کی ویگن میں بیٹھ کر گھر آ گئے۔ چند دن وہاں رہنے کے بعد میں کنول اور آشا دہلی منتقل ہو گئے۔ یہاں ہمیں کوئی جانتا نہیں تھا۔ اس لیے آشا اور کنول کو اسلام قبول کرنے میں کسی قسم کی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ میں نے آشا کا نام عائشہ اور کنول کا فاطمہ رکھا۔ کچھ عرصہ فکر روزگار اور رہائش کے بندوبست میں گزر گیا۔ حالات بہتر ہونے کے فوراً بعد میں نے سوم کو اپنے موجودہ پتے سے مطلع کرنے کے بعد پنڈت کے گھرانے کے متعلق دریافت کیا۔ پندرہ دنوں کے بعد جواب موصول ہوا۔ لکھا تھا۔

''تم خیریت سے ہو یہ پڑھ کر دل کو تسلی ہوئی۔ پنڈت اور ساوتری دونوں پرلوک سدھار چکے ہیں۔ تمہارے ستمری سے جانے کے بعد شر پسند ہندوؤں نے صبح کے قریب پنڈت کے گھر کا رخ کیا۔ تب آشا کو وہاں نا پا کر مشتعل ہو گئے۔ ستر اسی سال کا ایک بوڑھا غصیلے لہجے میں بولا۔ کل رات میں نے سری رام کو پنڈت کے گھر کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے میں صحیح اندازہ نہیں لگا سکا۔ لیکن اب آشا کی غیر موجودگی میں میں بلا تامل یہ کہہ سکتا ہوں کہ کنول

کی طرح پنڈت نے آشا کو بھی سری رام کے ساتھ بھگا دیا ہے۔ ایک دو اور جوانوں نے بوڑھے کی تائید کی' تب وہ تحمل مزاجی کے ساتھ کام لیتے ہوئے بولا۔''

''ستی کی رسم ضرور ادا کی جائے گی۔ صرف ہمیں پنڈت کے مرنے کا انتظار کرنا ہوگا۔ ہر چند کے آج اس گھر میں کچھ نہیں ہے۔ لیکن کل ضرور ہوگا۔ تم سب آج ہی سے ستی کی تیاریاں شروع کردو۔ پھر وہ گھر سے باہر نکل گئے۔ اُن کے جانے کے بعد میں نے سکون کا سانس لیا کہ معاملہ خیر و عافیت کے ساتھ ختم ہوگیا۔ لیکن میری خام خیالی ثابت ہوئی۔ دو دنوں کے بعد پنڈت کی موت واقع ہوگئی۔

اُس کی موت کی خبر سنتے ہی تمام گاؤں والے ایک دفعہ پھر پنڈت کے گھر کے سامنے جمع ہونے لگے۔ انہیں پنڈت کی موت کا رتی برابر بھی افسوس نہیں تھا۔ وہ چیختے چلاتے ہوئے ستی کی رسم کا مطالبہ کررہے تھے۔ دو بوڑھے مجمع کو ہٹاتے ہوئے آگے بڑھے اور مکان کے اندر داخل ہوگئے۔ اُن کے ساتھ دو عورتیں بھی تھیں۔ کمرے میں داخل ہونے کے بعد دونوں بوڑھوں نے پنڈت کے جسم کو بازوؤں اور ٹانگوں کے پاس سے تھام لیا۔ میں نے احتجاج کی کوشش کی تب دونوں تلخ لہجے میں بولے۔

آج اگر ستی کی رسم ادا نہ کی گئی تو ستمری والوں کا پنڈت کے وجود سے اعتبار اٹھ جائے گا آشا نہ سہی......ساوتری ہی سہی......رسم تو ضرور ہوگی۔ بوڑھے لاش کو اٹھانے کے بعد گھر سے باہر نکل گئے۔ ساوتری چارپائی کے پاس بت بنی بیٹھی تھی۔ ایک عورت نے اُسے بازو کے پاس سے تھامنے کی کوشش کی۔ وہ ریت کی بوری کی طرح زمین پر ڈھے گئی۔

ستی کی رسم ستمری گاؤں والوں کے نصیب میں نہیں تھی۔ ساوتری نا جانے کس پہر پنڈت کے ہمراہ موت کی وادیوں میں گم ہوگئی تھی۔ شام کو دونوں کی چتاؤں کا کریا کرم کردیا گیا اور میں بوجھل قدموں کے ساتھ بادل پور آ گیا۔ خط کا اختتام ہوا۔ میں نے جواب میں اُسے جو خط تحریر کیا اُس میں پنڈت کے گھرانے کی تعزیت کے بعد نرملا کے متعلق دریافت کیا۔ جواب میں اُس نے بتایا۔

''وہ ایک سمبندھ کی تلاش میں اپنے گھر کو خیر باد کہہ کر گاؤں کے نوجوان لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی۔ اُسے یہ بہت پہلے کرلینا چاہیے تھا۔ چند دن قبل ناگ پور گاؤں کے قریب واقع ندی سے اُس کی لاش ملی ہے۔ لڑکے کا کچھ پتا نہیں چلا نرملا باوجود کوشش کے سمبندھ استوار نہ کرسکی۔ اُس پگلی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ سمبندھ پتی اور پتنی کے رشتے کے علاوہ اور نہیں ہوتا۔

وہ اُس رشتے کو چھوڑ کر مزید کی تلاش میں موت کی گہرائیوں میں کھوگئی۔

میں نے خط سے نگاہیں ہٹائیں۔ وہ آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ میرے پاس اُسے دلاسہ دینے کے لیے الفاظ نہیں تھے۔ تین اکٹھی موتوں کے متعلق یکے بعد دیگرے معلوم ہونے کے بعد میرے پاس لفظوں کا ذخیرہ ختم ہوکر رہ گیا تھا۔ لیکن دل میں ایک کسک ضرور تھی کہ ایک دفعہ بادل پور گاؤں خود جاؤں۔ سوم سے ملنے کی خواہش دل میں تھی۔ لیکن بال بچوں میں اُلجھ کر یہ خواہش پوری نہ ہوسکی اور میں زندگی کی مصروفیات میں کھو کر رہ گیا۔

☆☆......☆☆

کتاب تعارف

ریگِ ماہی، دردانہ نوشین خان کا طلسماتی شاہکار

احمد سجاد بابر

دردانہ نوشین خان ۔۔۔ ایک ایسا نام جو اعتبار اور معیار کی سند بن چکا ہے۔ مظفر گڑھ کی دھرتی سے اٹھ کر ادبی افق پر چھا جانے والی بگولہ صفت، دردانہ نوشین خان قلم و قرطاس سے جُڑا ایک معتبر نام اور ایک قابلِ تکریم حوالہ ہے جن کے قلم کا سفر دہائیوں پر محیط ہے، لفظ کی کوملتا، قلم کی نشتریت، موضوع کی انفرادیت ان کا سب سے بڑا تعارف ہے۔ دردانہ نوشین کا افسانوی مجموعہ ''ریگِ ماہی'' منظر عام پر آتے ہی قاری اور ناقد دونوں کو متوجہ کر چکا ہے، حال ہی میں ''خالد احمد ایوارڈ'' اور 50 ہزار کا کیش انعام ان کی صلاحیتوں کا ایک ادنیٰ سا اعتراف ہے۔

''ریگِ ماہی'' جیسا علامتی نام دردانہ نوشین خان کی ذہنی اٹھان کی نشاندہی کرتا ہے، وہ تصویر کی دوسری طرف جھانکنے کی صلاحیت سے مالا مال ہیں اور یہی فہم و دانش ان کو ممتاز کرتی ہے، ان کی تحریروں کی خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے دوسرے رائٹرز کی طرح محض لب و رخسار، رومانس، ہانڈی ڈوئی، ساس بہو وغیرہ جیسے روایتی افسانے نہیں لکھے بلکہ ان کے ہاں تدبّر ہے، غور و فکر ہے، نئے موضوعات ہیں، کائنات کا فلسفہ، انسان کی نفسیات، ہستی و نیستی کے سوالات کی پرتیں کھولتے موضوعات ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں 29 افسانے، کہانیاں ہمیں بتاتے ہیں کہ انگریزی ادب کی یہ معلّمہ اردو پر کمال دسترس رکھتی ہیں۔

مجھے یہ اعتراف کرنے میں بھی کوئی عار نہیں کہ دردانہ نوشین کی تحریر کے اندر تحریر ہوتی ہے، ان کی بات کو رُک کر، غور سے، دوبارہ، سہ بارہ پڑھ کر ان کے جملوں کی سمجھ آتی ہے۔ حرف کی پٹاری سے اسرار اور بھید جھانکتے ہیں، پٹاری کھول دی جائے تو فہم و ادراک کا ناگ ڈس کر ادھ موا کر دیتا ہے۔ پٹاری نہ کھولی جائے تو ذہن کا کاسہ خالی رہ جاتا ہے۔ ریگِ ماہی حیرت کدہ ہے، اس میں دردانہ نوشین کہیں پر محبت کی گتھیاں سلجھاتی ہوئیں نعرہ ھُو بلند کرتی ہیں

میکسیکو

میکسیکو براعظم شمالی امریکہ کے انتہائی جنوب میں واقع ہے۔اس کے مشرق میں خلیج میکسیکو اور مغرب میں بحرالکاہل ہے۔ میکسیکو کی سرحدیں لاطینی امریکی ملکوں گوئٹے مالا اور بیلیز کے علاوہ شمال میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ (یو ایس اے) سے بھی ملتی ہیں۔

میکسیکو معدنی وسائل سے مالا مال ملک ہے۔اس کا شمار تیل پیدا کرنے والے بڑے ملکوں میں ہوتا ہے جبکہ دنیا میں چاندی برآمد کرنے والا سب سے بڑا ملک بھی یہی ہے۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ دنیا کی کئی عظیم تہذیبیں میکسیکو اور وسطی امریکہ میں پروان چڑھیں۔

محمد نواز۔دیر

ڈائری سے ایک ورق

جس میں بدگمانی ہو جہاں شک کی گنجائش ہو جہاں جھوٹی کہانی ہو...... وہ لوگ اچھے نہیں ہوتے۔اچھے تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو بھولے پن میں پیار کرتے ہوں جو بچے اور سیدھے ہوں جو ملتے ہیں تو خوشیوں کا سماں باندھ دیتے ہیں بچھڑتے ہیں تو دل میں ایک خلا سا چھوڑ جاتے ہیں۔

شازیہ اسحاق۔صادق آباد

دریچے

زندگی کتنی بھی کٹھن مشکل اور تکلیف دہ کیوں نا ہو جائے تازہ ہوا کے لیے ایک دریچہ ضرور کھلا رہنا چاہیے تاکہ آپ سانس لے سکیں اور اپنے زندہ ہونے کا یقین پا سکیں۔ کیونکہ بند دریچے یقین اور اُمید کے لیے زہر قاتل ثابت ہوتے ہیں سو دریچے کھلے رکھیے اُمید یقین اور آس کے دریچے۔

زرین گل۔سوات

''محبت چمگادڑ ہے، عقل دبوچ لیتی ہے۔محبت شکاری ہے پرواز کے پر نوچ لیتی ہے، محبت دیمک ہے، عمر کو چاٹ لیتی ہے''

کہیں وہ ''کاکروچ'' تخلیق کرتی ہیں جس کا ہر ہر جملہ گھر گھر کی کہانی لگتا ہے، یوں لگتا ہے کہ یہ ڈرامہ ہم سب کا دیکھا ہوا ہے، یہ وہ تضاد ہے جو ہم سب اپنے اندر لئے پھر رہے ہیں۔چہروں پر نرمی، ہونٹوں پر مسکراہٹ اور اندر سے اٹھتی گالیاں ہمارے معاشرے کا خاصہ ہیں۔

''پھر کہیں مردانے سے چائے کا آئیڈیا اٹھا اور پانی میں ٹپکائے جانے والے نیل کے قطرے کی طرح پھیل گیا۔

ہاں ہاں کیوں نہیں...... کہہ کر اٹھنے والی خاتون کا شفقت لٹاتا چہرہ باورچی خانے میں زہر آلود ہو گیا''

دردانہ نوشین خان نے جب اپنی تحریر میں جنوبی پنجاب کی عکاسی کی تو وسیب، علاقائی کلچر میں مروجہ کرداروں کے نام، تراکیب، الفاظ ،محاورات ، رسوم اتنی خوبصورتی سے استعمال کئے کہ وہ ان کے عمدہ مشاہدہ کا ثبوت بن گئے۔کچھ مثالیں دیکھئے۔

''...بوتھی، مائی رسولاں، دادی سانڑھیں ،بکیرن زادی، گندی رنوں، شودی، مائی بلوچاں، ماڑیوں، ویڑا، ڈھینگر، ڈاچی، بھنئی ،امب ،ٹکر ،بہہ وغیرہ......''

ایک اچھا لکھاری گردوپیش سے غافل نہیں ہو

سکتا، اس کا ثبوت ریگِ ماہی کا افسانہ ''بعد۔۔۔ شاہ'' ہے۔

بادشاہ کہتا ہے کہ آسمانی آفتوں میں ہمارا کیا دوش، تو آج کے پاکستان کی صورتحال آنکھوں میں ایک کوندے کی طرح فلیش کرتی ہے۔ اسی طرح اسی افسانے کا ایک اور سین، ملک کے ایک شہر میں امن تباہ ہو چکا ہے، اغوا برائے تاوان کا دھندہ عروج پر ہے، بادشاہ کو اطلاع ملتی ہے۔

''۔۔۔۔۔۔جس وقت بادشاہ غضب کی حالت میں کہتا ہے ''ہم اس بدامنی کی شدید مذمت کرتے ہیں، یہ جلد بند ہو جانی چاہیئے''

بند کون کرے؟

سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے، شاہی تخاطب غالباً کوئی غیر مرئی موکل تھا''

تو کیا ہمیں یہ جملے سُنے سے نہیں لگتے؟؟

یہی تو لکھاری کا کمال ہوتا ہے۔ اسی افسانے کا ابتدائیہ ملاحظہ کیجئے

''آراستہ پیراستہ محل کی بارہ دری میں چہل قدمی کرتے، ریشم و دیباج پوش بادشاہ کے مغرور و مسرور قدم ٹھٹکے، غلام اور کنیزیں گھبرا گئیں۔

خدا نہ کرے فکرمندی کے بادل تاباں شاہی جبیں کو گہنائیں، مور چھل کا ارتعاش بڑھا، گلاب و یاسمین سے فضائیں معطر کی گئیں، کچھ قندیلیں اور روشن کی گئیں، کچھ ساز بجنے لگے، مگر منحوس شور نے سمع خراشی جاری رکھی۔''

حالات واقعات کی کامیاب منظر کشی افسانے کی بہت بڑی خصوصیت ہے۔ افسانہ نگار کو چاہیئے کہ یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے افسانے کا پلاٹ مقامی ماحول سے مرتب کرے تا کہ واقعات کی تصویر کشی میں اس سے کوئی فروگزاشت نہ ہو جائے۔ وردانہ نوشین خان نے اپنے چاروں طرف بکھرے موضوعات کی بنت کاری کی ہے۔

عمدہ منظر کشی کی مثال دیکھیئے

''دروازہ پر لٹکا ٹاٹ کا پردہ، پرانی چارپائی پر بچھی پھیکی بدرنگ چادر، میلی دیوار پر اکھڑتا چونا، بوسیدگی سے پیلے پڑتے خالی خولی چھوٹے بونے فرج میں رکھی پانی کی بوتلیں، اکھڑی اینٹوں کا غیر متوازی فرش اعلان کرتے تھے کہ یہ کاشانہِ مفلسی ہے'' (کاخِ اُمراء)

''گھر کے پھاٹک تک پہنچی تو باہر اتنے مردوں کا ہجوم تھا کہ ہراساں ہو کر چادر کا پلّو سر پر کھینچنا چاہا مگر جانے کہاں رہ گئی تھی، سمٹتی سمٹاتی، پہلو بچاتی داخل ہوئی،

لان، آنگن، برآمدے، راہداریاں اور کمرے دیکھے، ان دیکھے چہروں سے اٹے پڑے تھے'' (برزخ سے پہلی کہانی)

''زینت شودی مر گئی۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔وہ تڑپ کر اٹھ گئی۔۔۔۔وہ کیوں مر گئی، وہ کیسے مر سکتی ہے؟'' تازہ غم وارد ہو تو انکار چیخ اٹھتا ہے، خنجر قلب میں اترے تو پھڑکنا شدت کا ہوتا ہے، پھر اسے نکال لو یا نہ نکالو، اذیت نہیں مرتی'' (میٹرو بس)

اسی طرح ''بازیافت'' ایک فلسفیانہ سی تحریر ہے جس میں بنتِ آدم سے خطاب کی شکل میں حیات بعد از موت کا فلسفہ عورت کے تناظر میں بیان کیا گیا ہے

اختصار افسانے کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ افسانہ نگار کو اس اختصار میں جامعیت پیدا کرنے کے لئے اشارے اور کنائے کی زبان استعمال کرنی پڑتی ہے۔ ان اشاروں پر غور کرنے سے زندگی کے مسائل پر سوچ بچار کرنے کا سلیقہ پیدا ہوتا ہے۔ وردانہ نوشین کے زیادہ تر افسانے مختصر ہیں، اسی وجہ سے ان کے ہاں اشارے کنائے زیادہ

ملتے ہیں۔اسی طرح مشاہدے کی گہرائی، انسانی نفسیات کا عمیق مطالعہ اور حقائق اشیاء میں اتر جانے والی نگاہ نیز متوازن اور مرتب انداز فکر، افسانہ نگار کا قیمتی سرمایہ ہے۔دردانہ نوشین کی ہر تحریر میں گہرا مشاہدہ جھلکتا ہے، اس وجہ سے ان کے مکالمے اور بیانیہ کرداروں کے مطابق بدل جاتا ہے۔

ایک کامیاب افسانے میں کردار نگاری کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ افسانے کے کرداروں کو ہمارے گردوپیش چلتے پھرتے انسانوں کی خصوصیات اور اخلاق و عادات کا حامل ہونا چاہئے۔ اگر کردار مصنوعی ہوں گے تو قاری کو متاثر نہیں کرسکیں گے۔ ایک کردار کو بلاوجہ مثالی کردار دکھانا اور دوسرے کو بلاسبب اخلاق کی پستیوں میں دھکیل دینا بھی افسانے کی ایک بہت بڑی خامی ہے۔جس طرح عام انسان عادات و اطوار میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں اسی طرح افسانے کے کرداروں میں بھی یکسانیت نہیں ہونی چاہئے۔مثال کے طور پر ناپختہ نوجوانوں، پختہ کار اور جہاندیدہ بوڑھوں، عورتوں اور بچوں میں ان کی فطرت اور نفسیات کے اعتبار سے فرق دکھانا چاہئے۔ یہ تمام عناصر دردانہ نوشین کے افسانوں میں موجود ہیں، انہوں نے ہر طرح کے کردار پر لکھا۔ پڑھے لکھے، دیہاتی، ان پڑھ، پروفیسر، عامل، توہم پرست، حاکم، محکوم۔۔۔۔غرضیکہ ان کے ہاں کرداروں کی یکسانیت نہیں ملتی بلکہ ان کے کردار رنگا رنگ ہیں۔

افسانے کے مکالموں کا لب ولہجہ سادہ، فطری، برجستہ اور شگفتہ ہونا چاہئے۔خوشی، غم، حیرت یا غیظ وغضب کے موقعوں پر لہجے کے آہنگ میں موقع ومحل کے مطابق فرق کرنا لازم ہے۔بچوں کا لہجہ معصوم اور سادہ، مردوں کا لہجہ موقع محل کے اعتبار سے جاندار، پختہ سنجیدہ اور بعض اوقات درشت، مگر تدبر آمیز، عورتوں کا لہجہ عام طور پر نرم و ملائم، اور شفقت آمیز ہونا چاہئے۔افسانے میں باوقار سنجیدگی کی فضا کو قائم رکھنے کے لئے مکالموں میں تہذیب اور شائستگی کا پہلو نمایاں رکھنا چاہئے۔کرداروں کا بازاری قسم کے متبذل اور غیر شریفانہ لب و لہجے سے مجتنب رہنا ضروری ہے۔ ایسی ظرافت جو ابتذال کی حدوں سے دور رہے، افسانے کو ناگوار قسم کی سنجیدگی سے محفوظ رکھتی ہے۔

''اچھی لگ رہی ہو'' آئینے نے آنکھ ماری

(شرک)

حالات کی تلخی سے لبریز ایک بے روزگار لڑکی جب انٹرویو دے کر تھک جاتی ہے، ایک لڑکا اس سے پوچھتا ہے'' آپ کا اسمِ گرامی۔۔۔؟'' تو وہ وہ کیا کہتی ہے

''میرا اسمِ گرامی بے روزگار ہے۔۔۔۔بے روزگار کی مونث بے روزگارن نہیں ہوتی، اس لئے اسے غلطی مت کانسیڈر کیجئے گا۔۔۔۔

میں نے جوڈگریاں بغل میں داب رکھی ہیں، یہ آخرت کی طرح وطنِ عزیز میں بھی بے سود ہیں۔۔۔۔اور آپ کیا اس عالم بے سروسامانی میں لوسٹوری کی پہلی اینٹ رکھنے آئے ہیں؟ میری مانئے، انٹرویو دے چکے ہیں تو گھر جائیے، اماں مصلیٰ پر بیٹھی ہوں گی، انہیں آرام کرنے کو کہیے۔۔۔نہیں دے چکے تو آیۃ الکرسی، برازیل کے صدر، شتر مرغ کی قسمیں دہرا لیں۔۔۔'' (کاخ اُمراء)

''کاخ امراء'' کی ہیروئن نے غربت کو بہت قریب سے دیکھا ہے، اس افسانے میں اتنے یادگ

کچھ جملے درج کرنا بہت ضروری ہیں
''میں نے غربت کو فزیکلی سونگھا، چکھا، برتا اور بتایا ہے، آپ کی طرح فلموں میں نہیں دیکھا / جب کوئی غریب مرتا ہے تو اس کی موت پر رونا نہیں آتا، زندگی پر آتا ہے / غریبوں کی غربت کو ایسا ثبات ہے کہ تغیر کو ترستا ہے / اس طرح مٹھیوں میں بھر بھر کے ہٹانے سے غربت کے ٹیلے نہیں گریں گے / اگر ایمان کا بھاؤ لگتا تو یہ سارے کنگلے ایمان کے ٹھیلے سجائے ہانک رہے ہوتے، ایمان لے لو، ایمان / غربت کی دور کی نگاہ سدا کی کمزور رہی ہے''
افسانے کے اختتام پر کشمکش اور تصادم کی فضا آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہے اور افسانہ قاری کے ذہن پر کوئی طربیہ، حزنیہ یا حیران کن اضطرابی کیفیت چھوڑ کر اپنے انجام کو پہنچ جاتا ہے۔ افسانے کا انجام کچھ ایسا فطری انداز میں ہونا چاہئے کہ قارئین کے دل یہ محسوس کریں کہ کہانی کا یہ انجام بڑا مناسب اور برمحل ہے اور اس کے علاوہ کوئی اور انجام ممکن ہی نہیں تھا۔ دردانہ نوشین خان کو بھی یہ ملکہ حاصل ہے کہ وہ چونکا دینے والے انداز میں اپنی تحریر کو ختم کرتی ہیں۔
''کاخ امراء'' کی ہیروئن پریشان ہے کہ وہ اپنی نوکری جاری رکھے یا چھوڑ دے، اس کے پاس پانچ بجے تک کی مہلت ہے، نوکری چھوڑے تو غربت اور فاقے منتظر ہیں، جاری رکھے تو نوکری مشکوک ہے، جیل جانے کا امکان ہر لحہ ہے، وہ کشمکش میں ہے، آخر وہ نوکری جاری رکھنے کا فیصلہ کر کے جانے کو تیار ہو جاتی ہے، اس افسانے کا اختتام دیکھئے
''میرا ایک قدم گھر کی دہلیز سے باہر ایک اندر تھا کہ میں نے ابا کی آواز پر پلٹ کر دیکھا اور پتھر کی

''اُرداس'' ایک بہت منفرد موضوع پر لکھا گیا افسانہ ہے، ابیحہ کو بار بار خواب میں ایک اجنبی نوجوان، واثلہ، نظر آتا ہے، جو اس کا ہاتھ تھام کر لے جاتا ہے، جو اسے کہتا ہے کہ تم میری ہو، ابیحہ کی منگنی احسن سے ہو چکی ہے، وہ احسن سے پوچھتی ہے کہ یہ واثلہ کون ہے، احسن اسے بتاتا ہے کہ واثلہ شہید ہو کر دنیا سے رخصت ہو چکا ہے، اس پر کہانی کا اختتام دیکھئے
''صالحات کے لئے صالح شوہر انکے جنتی ساتھی ہوں گے، وہ نہیں چاہتی تھی کہ احسن غیر صالح ہو کر جیئے۔ اُس نے بائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی سے انگوٹھی اتار کر احسن کے سامنے رکھی اور جاتے جاتے کہا۔۔۔۔ مجھے آواز نہیں دینا احسن۔۔۔۔۔۔ احسن تب سے یہی سوچ رہا ہے کہ

ابیحہ نے اسے اچانک کیوں چھوڑ دیا۔''
اس بات میں کوئی دوسری رائے نہیں کہ دردانہ نوشین خان کا اسلوب بہت ہی الگ اور منفرد سا ہے، ان کے پاس اچھوتے لفظ اور تراکیب بھی ہیں اور بیان کرنے کا سلیقہ بھی ہے، نایاب سوچیں بھی ہیں اور چونکا دینے والے موضوعات بھی، پلاٹ بھی ہے اور بُنت کا کمال بھی ہے۔
وہ لکھاریوں کے ہجوم میں الگ کھڑی نظر آتی ہیں اور یہی اُن کی کمائی ہے۔ یہ ایسی کمائی ہے کہ جو ایک رائٹر کا خواب ہوا کرتی ہے مگر کوئی کوئی ہی فن کی اس بلندی پر نظر آتا ہے۔
''ریگ ماہی'' کی صورت میں اردو ادب کو ایک روپہلی کہکشاں ملی ہے، جس کے لئے ہم دردانہ نوشین خان کے شکر گزار ہیں۔
☆☆......☆☆

لاہور سے ارسال کردہ سچے واقعات پر مبنی کہانی

دوستی کا ناطہ

اس کے جاتے ہی میری والدہ محترمہ نے فوراً ریڈیو آن کیا تو اس پر صدر ایوب خان کا خطاب آنے والا تھا۔ اتنے میں ہم سب بچوں نے کپڑے بدل لیے چنانچہ ساڑھے بارہ بجے صدر ایوب خان کا خطاب نشر ہوا جس میں انہوں نے کہا کہ......

شیخ معظم الٰہی

کہتے ہیں کہ دوستی ایک ایسا ناطہ ہے جو ہیرے، سونے اور چاندی سے زیادہ مہنگا ہوتا ہے۔ آغا سکندر (ٹی وی اداکار) میرے بچپن کا دوست تھا۔ آغا سکندر میرا سب سے اچھا اور بہترین دوست تھا۔ ہم ایک ہی محلے میں (برف خانہ چوک گندھ انجن گوال منڈی) لاہور میں رہتے تھے۔ ایک ہی اسکول میں (گورنمنٹ سینٹرل ماڈل سکول) لاہور میں پڑھا کرتے تھے۔ اور ایک ہی تانگے میں اکٹھے اسکول آیا جایا کرتے تھے۔ تانگے میں ہم دو کم سن بچے ہوا کرتے تھے اور تانگے والے کا نام اسماعیل تھا۔

آغا سکندر بچپن میں بہت شراتی ہوا کرتا تھا۔ اکثر اوقات جب تانگے والا مجھے اسکول لے جانے کے لیے میرے گھر پر آتا تھا تو آغا سکندر کو مجھے بلانے کے لیے بھیج دیتا تھا اور سکندر گھر کی دوسری منزل پر پہنچ کر سیڑھیوں کے درمیان ایک جگہ کھڑے ہو کر اونچی آواز میں مجھے چوئن لائی پکارا کرتا تھا۔ اس نے میرا نام چوئن لائی (چین کے سابق وزیراعظم کا نام) رکھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تانگے والے کی چھڑی ہوا کرتی تھی جسے وہ زور زور سے دروازے پر مارا کرتا تھا۔ شور سن کر میری والدہ محترمہ اس سے ناراضگی سے کہا کرتی تھی کہ تم نے یہ کیا شور مچا رکھا ہے۔ ابھی آتا ہے معظم۔ مگر وہ اتنا ضدی تھا کہ وہ باز نہیں آتا تھا۔ تنگ آ کر میری والدہ اسے اپنی جوتی کھینچ کر مارتی تھیں۔ جسے وہ کیچ کر لیتا تھا اور واپس والدہ محترمہ کے ہاتھ میں پکڑا کر باہر بھاگ جاتا۔ یہ اسکا روزانہ کا معمول ہوا کرتا تھا۔ اتنی دیر میں میں بھی تیار ہو کر ناشتہ کر کے بھاگ کر تانگے میں جا کر بیٹھ جاتا تھا۔

بچپن کا زمانہ بھی حسین دور ہوتا ہے، نہ کوئی غم نہ فکر اور نہ کوئی سوچ۔ بس آزاد ماحول۔ اسکول آتے اور جاتے ہوئے راستے میں آغا سکندر لوگوں سے بہت شرارتیں کیا کرتا تھا۔ جس سے تنگ آ کر لوگ اسکی پٹائی بھی کر دیا کرتے تھے۔ تانگے والا اسماعیل بھی اکثر اسکی حرکتوں سے

چڑ جاتا تھا۔ میں اکثر اوقات اسے بچانے کی کوشش کرتا تو لوگوں سے ایک دو ہاتھ مجھے بھی پڑ جاتے تھے۔ اس میں ایک خاص بات تھی کہ اس نے کبھی میرے ساتھ شرارت نہیں کی۔ وہ ہمیشہ کہتا تھا کہ چوئن لائی میں دوستوں کا دوست ہوں، کبھی دوست کو تنگ نہیں کیا کروں گا۔ مگر لوگوں کے ساتھ ہمیشہ شرارت کرتا رہوں گا کیونکہ مجھے یہ کرنے میں مزا آتا ہے۔

۶ ستمبر ۱۹۶۵ کی جنگ جب شروع ہوئی تو اس دن میری والدہ محترمہ نے حسب معمول ہم سب بچوں کو اسکول جانے کے لیے تیار کر رہی تھیں کہ اتنے میں آغا ہمارے گھر آیا اور آتے ہی کہا چوئن لائی انڈیا نے ہمارے ملک پر حملہ کر دیا ہے۔ اس لیے سارے اسکول بند ہو گئے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ اسکے جاتے ہی میری والدہ محترمہ نے فوراً ریڈیو آن کیا تو اس پر صدر ایوب خان کا خطاب آنے والا تھا۔ اتنے میں ہم سب بچوں نے کپڑے بدل لیے چنانچہ ساڑھے بارہ بجے صدر ایوب خان کا خطاب نشر ہوا جس میں انہوں نے کہا کہ۔

''میرے ہم وطنو! بھارت نے ہماری زمین پر حملہ کر دیا ہے۔ اسے نہیں پتہ کہ اس نے کس قوم کو للکارا ہے۔ تم لا الہ الا اللہ پڑھتے ہوئے اس پر ٹوٹ پڑو اور اس وقت تک لڑتے رہو جب تک دشمن کی توپیں خاموش نہ ہو جائیں۔ اللہ پاک تمہارا حامی و ناصر ہو۔ پاکستان زندہ باد۔''



اس خطاب کے ساتھ ہی ہمارے ملک میں انڈیا کے خلاف نفرت کی لہر دوڑ گئی۔ ستمبر ۱۹۶۵ کے دو دن مجھے ابھی تک یاد ہیں جب انڈیا کے طیارے لاہور پر حملہ کرنے کے لیے آئے تو ہمارے شاہین جاں باز نے انہیں جہنم تک پہنچا دیا۔ جنگ کے دوران آغا سکندر ہمارے گھر آتا تو وہ مجھے لے کر چھت پر چلا جاتا تھا۔ پھر ہم دونوں مل کر انڈیا کے طیاروں کو برباد ہوتے دیکھا کرتے تھے۔ جب ہمارا شاہین ہوا باز کبھی انڈیا کے طیارے کو بم مار کر گراتا تھا تو ہم زور زور سے نعرے لگاتے کہ پاکستان زندہ باد۔ ہماری فوج زندہ باد۔

اس جنگ میں بچہ بچہ غازی بن چکا تھا۔ ہم سب بچے کہتے تھے انڈیا نے ہمارے ملک پر حملہ کیوں کیا؟ ہم اسے تباہ و برباد کر دیں گے۔ پھر سترہ دن کے بعد یہ جنگ ختم ہوگئی۔

آغا سکندر پانچوں جماعت تک اسکول میں میرے ساتھ رہا۔ اسکے بعد وہ اسکول چھوڑ کر چلا گیا۔ تقریباً اٹھارہ بیس سالوں کے بعد مجھے اپنی والدہ کے ساتھ ایک الیکٹرونکس کی دکان جانا پڑا۔ وہ دکان بہت بڑی تھی، جہاں میں نے آغا سکندر کو دیکھا (ایک ٹی وی ادکار کی حیثیت سے)۔ ان دنوں اسکا ایک ڈرامہ وارث آن ائیر تھا۔ اس نے اس ڈرامے میں پہلی دفعہ اداکاری کی تھی، اور وہ ہیرو کے کردار میں تھا۔

جب میں اپنی والدہ محترمہ کے ہمراہ دکان میں داخل ہوا تو وہ سب کو چھوڑ کر مجھ سے ملنے کے لیے آیا اور کہا کہ آپ گوال منڈی میں رہتے ہیں؟ میں نے کہا کہ ہاں پھر اس نے پوچھا کہ کیا آپ سینٹرل ماڈل اسکول لاہور میں پڑھا کرتے تھے؟ تو میں نے جواب دیا کہ ہاں میں وہیں پڑھتا تھا۔ اسکا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔

''کیا آپ نے مجھے پہچانا؟''

''آپ وہی اداکار ہیں جو وارث ڈرامے میں آتے ہیں۔''

''وہ تو سارا لاہور جانتا ہے۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

اٹھارہ بیس سال کے بعد میں آغا سکندر کو تقریباً بھول چکا تھا۔

''کیا یہ خاتون آپکی والدہ ہیں؟'' اس نے میری والدہ کو دیکھ کر پوچھا۔

میں نے کہا کہ ہاں یہی میری والدہ ہیں۔

''یہ مجھے ضرور پہچانیں گی۔''

اس نے آگے بڑھ کر میری والدہ محترمہ کو سلام کیا اور پوچھا۔

''خالہ جی آپ نے مجھے پہچانا؟''

میری والدہ نے اسے دیکھا اور مجھے کہا کہ ''یہ تو وہی لڑکا ہے جو تمہیں اسکول لے جانے آیا کرتا تھا۔''

پھر مجھے یاد آیا کہ یہ تو میرے بچپن کا دوست آغا سکندر ہے۔ میں نے فوراً آگے بڑھ کر اسے گلے لگایا۔ اور کہا۔

''معاف کرنا یار! میں تمہیں پہچان نہیں سکا۔''

''مگر میں تمہیں نہیں بھولا۔ تم مجھے ہر پل یاد رہتے ہو۔''

''تم پانچویں کلاس کے بعد اسکول سے غائب ہوگئے تھے؟''

''ہاں یار میرے ماں باپ انگلینڈ چلے گئے تھے، میں نے وہاں ہی اپنی تعلیم مکمل کی۔ اب بتاؤ تمہیں کیا چاہیے؟ میں اس دکان کا منیجر ہوں۔'' میرے یار نے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے

کہا۔

''ہاں یار گھر کے لیے ایک روم کولر خریدنا ہے۔''

اس نے ایک نہایت عمدہ روم کولر اسٹور روم سے نکال کر دکھایا۔ جسے میں نے اور میری والدہ محترمہ نے پسند کرلیا۔ میں نے جلدی سے روم کولر کی رقم ادا کر کے باہر کسی گاڑی کا بندوبست کرنے آیا تو آغا سکندر نے مجھے روک لیا۔ اور کہا کہ۔

''چوئن لائی کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے ۔روم کولر میں چھوڑ آتا ہوں۔''

لہذا اس نے دکان کی گاڑی روم کولر رکھا اور مجھے اور میری والدہ کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر گھر چھوڑ آیا۔

اور جاتے ہوئے کہا ''چوئن لائی ہم اب ملتے رہیں گے۔''

وہ اکثر اوقات میرے گھر آتا جاتا رہتا تھا۔ ایک دفعہ وہ مجھے ٹی وی اسٹیشن لے کر گیا اور وہاں اس نے مجھے وارث ڈرامے کی شوٹنگ بھی دکھائی۔ وہاں دوسرے اداکاروں سے میرا تعارف کروایا کہ یہ میرے بچپن کا دوست ہے۔ سب اداکاروں کے ساتھ تصویریں بھی بنوائیں۔ وہ تصویریں یادگار کے طور پر آج بھی میرے پاس ہیں۔

پھر ایک دن آغا سکندر اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اور میرے لیے اپنی یادیں چھوڑ گیا۔ میں اسے بہت یاد کرتا ہوں خاص طور پر اسکی شرارتوں کو۔ اللہ پاک اسے جنت میں جگہ دے۔ آغا سکندر کے دو بیٹے علی سکندر اور علی آغا کراچی میں رہائش پذیر ہیں اور ٹی وی پر اداکاری کرتے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ انہیں اپنے حفظ وامان میں رکھے۔

☆☆......☆☆

ربڑ کی ناک والا

مصلحت آمیز جھوٹ کی بات چلی تو ہمیں ایک پرانے اور دلچسپ رفیقِ کار میجر ''ج'' یاد آگئے جنہیں دروغ گوئی اور وہ بھی یکسر بے مصلحت! میں بے پناہ ملکہ حاصل تھا۔ آپ کو جھوٹ کی ضرورت اکثر بڑ مارنے کے سلسلے میں پیش آتی تھی اور بڑ وہ ضرور مارتے تھے خواہ اپنی پرائمری تعلیم کا ہی ذکر ہو' چنانچہ ایک دفعہ تعلیمی بڑ مارتے ہوئے فرمانے لگے:

''جب میں ڈیرہ دون میں کرنل براؤن کے کیمبرج اسکول میں زیرِ تعلیم تھا تو......''

پیشتر اس کے کہ میجر صاحب جملہ مکمل فرماتے' ہمارے ایک ستم ظریف دوست نے جو شریکِ محفل تھے اور جانتے تھے کہ میجر صحب کالا شاہ کاکو سے آگے ڈیرہ دون کی سمت میں نہیں بڑھے' میجر ج سے پوچھنے لگے۔

''میجر صاحب' قطع کلام معاف' آپ کے کرنل براؤن نے ربڑ کی ناک کیوں لگوا رکھی تھی؟''

اب کرنل براؤن کی ناک بالکل اصلی گوشت کی ناک تھی جیسی ہم سب کی ہوتی ہے لیکن میجر صاحب نے کبھی کرنل براؤن کو دیکھا ہو تو تردید فرماتے' چنانچہ یہ سمجھتے ہوئے کہ ناک ربڑ ہی کی ہوگی' دھڑلے سے وضاحت فرمائی:

''اچھا وہ ناک۔ جی ہاں' تو وہ اس لیے لگوائی تھی کہ اصلی ناک پولو کھیلتے ہوئے ضائع ہو گئی تھی۔'' اور یہ سوچتے ہوئے کہ جھوٹ میں کوئی کسر نہ رہ گئی ہو' مزید فرمایا: ''میں خود اس پولو میچ میں موجود تھا۔ اچانک گھوڑا بدک گیا اور کرنل براؤن ناک کے بل دور جا گرے۔'' OH WHAT A PITY!''

(کرنل محمد خان کی بجنگ آمد سے اقتباس)

مرسلہ: شازیہ طارق۔ لاہور

سرگودھا کی یخ بستہ ہواؤں سے ارسال کردہ تحریر

دین محمد

دین محمد دہشت گرد نہیں تھا' اصل دہشت گرد تو غربت اور افلاس ہے جو انسانوں سے مرنے کے بعد اُن سے اُن کی شناخت بھی چھین لیتی ہے......

مریم شاہ بخاری

میرا تعلق شعبہ صحافت سے تھا۔ مختلف لوگوں کے حالات کا جائزہ لینا اور ان پر رپورٹ بنانا میرا کام تھا ایسا کام جو دیکھنے میں بہت آسان لگتا تھا مگر اس کو کرنے کے بعد اس کی باریکیوں کا اندازہ ہوتا تھا۔ میرے اس پیشے کے لیے میرے گھر والے ہرگز راضی نہ تھے مگر چونکہ میں تین بھائیوں کی اکلوتی تھی اور لاڈلی بھی تو میری روتی اور سوجی آنکھوں کے ساتھ بارہا دہرائی گئی ایک ہی خواہش کے آگے انہیں ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اور یوں میں صحافت کے پیشے سے جڑ گئی۔ مجھے اس پیشے سے جڑے چھ مہینے ہی ہوئے تھے جب ایک رپورٹ کے تحت میری ملاقات دین محمد عرف دینو کے گھر والوں سے ہوئی۔ دینو کون تھا؟ اور میں اس کے والدین کے پاس کیوں گئی تھی؟ ان سوالوں کا جواب اس کہانی میں جو میں دکھی اور افسوس سے بھرے دل کے ساتھ رقم کر رہی ہوں۔

دین محمد عرف دینو کہنے کو تو ایک فقیر گھرانے میں پیدا ہوا تھا اس لیکن اسے اپنے آبائی پیشے 'بھیک مانگنے' سے سخت چڑ تھی۔ وہ اپنے ماں باپ کی گیارہویں اولاد تھا باقی دس بہن بھائی اس سے بڑے تھے اور ماں باپ کی طرح بھیک مانگتے تھے۔ لیکن دینو اس معاملے میں انتہائی اکھڑ اور بدمزاج واقع ہوا تھا۔ اس نے بھیک مانگنے سے صاف انکار کر دیا تھا مگر چونکہ وہ چھوٹا تھا اس لیے اس کو یہ سوچ کر چھوٹ دے دی گئی کہ وقت کے ساتھ ساتھ سمجھ جائے گا۔ اس نرمی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ یا تو سارا دن گھر میں رہتا یا پوری بستی کی خاک چھاننے نکل پڑتا۔ جب وہ اپنی بستی کی سیر سیاحت سے اکتا جاتا تو اس نے آس پاس کے علاقوں میں جانا شروع کر دیا۔ باہر کے صاف ستھرے علاقے' اونچی اونچی عمارتیں' رنگ برنگے مسکراتے چہرے اس کو بہت بھائے۔ اس کا ٹھکانہ اکثر وہ گلی ہوتی جہاں ایک بہت بڑے سرکاری اسکول کی عمارت تھی۔ اس عمارت کے سامنے ایک بہت بڑا برگد کا درخت تھا۔ جس کے تنے سے ٹیک لگا کر وہ صاف ستھرے یونیفارم

میں ملبوس ہنستے مسکراتے زندگی کی فکروں سے بے نیاز معصوم بچوں کو دیکھتا رہتا۔ ایک فقیروں کی بستی سے تعلق رکھنے کے باوجود بھی دینو کا ذہن الگ انداز میں یہ سوچتا تھا۔ آٹھ سالہ دینو اپنا اور ان بے فکرے بچوں کی زندگیوں کا موازنہ کرتا تو اس کا دل بجھ جاتا' بہت جلد اس کے دل میں علم حاصل کرنے کی خواہش کروٹ لینے لگی۔ ایک روز اس نے موقع دیکھ کر ماں باپ سے اسکول جانے کی فرمائش کردی۔ اس کے ماں باپ نے اس کی یہ خواہش سنی تو باقاعدہ اپنا سر پیٹ ڈالا۔

''یہ نہیں ہوسکتا' یہ ناممکن ہے' اسکول اور تم ...... ہرگز نہیں۔'' اس انکار نے اس کے دل پر بڑی چوٹ لگائی تھی۔ دینو کے بہن بھائی اس پر خوب ہنسے۔ مگر وہ بھی اپنے ارادے کا پکا ثابت ہوا۔ اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا اور چند دن میں ہی بیمار ہوکر بستر سے لگ گیا۔ تو آخر اس کے ماں باپ نے اس کی اس خواہش کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔

وہ دن اس کی زندگی کا یادگار اور بہت خوبصورت دن تھا۔ سستے سے صابن سے خوب مل مل کر نہایا اس نے کسی کا دیا ہوا مگر صاف ستھرا یونیفارم پہنا' پیروں میں گھسے ہوئے جوتے ڈالے' سر پر تیل لگا کر خوب کنگھا کیا اور بالوں کو اپنی پیشانی پر کسی پرانے زمانے کے ہیرو کی طرح جمایا' گلے میں کپڑے سے بنا ہوا بستہ ڈالا اور ہاتھ میں تختی تھامے دینو اسکول کی جانب روانہ ہوگیا۔ اس کے سانولے چہرے پر ایک انوکھی سی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ اس کے لبوں پر ایک



فاتحانہ مسکراہٹ جگمگا رہی تھی۔ اس کی چال میں تمکنت تھی' گردن فخر سے اکڑی ہوئی تھی۔ ساری فقیر برادری نے حیرت سے اس کو سر سے پاؤں تک گھورا' اس کے ہم عمر لڑکوں اور لڑکیوں کی آنکھوں میں اس کے لیے رشک تھا۔ اس کے قدم نہایت اعتماد سے پرنسپل صاحب کے دروازے کے سامنے رُکے' ہاتھ اٹھائے اور دروازے پر دستک دے کر دروازہ کھولا۔

''میں اندر آسکتا ہوں صاحب؟'' اس کی کھنکتی ہوئی آواز نے فائلوں میں سر دیے پرنسپل صاحب کو چونک کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ دین محمد پر نظر پڑتے ہی ان کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے اور لبوں پر شفقت بھری مسکراہٹ ابھر آئی۔

''آؤ...... آؤ دین محمد......'' انہوں نے سر کے اشارے سے اُسے اندر بلایا تو وہ ان کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

پرنسپل صاحب اسے اچھی طرح پہچانتے تھے۔ انہوں نے اسے اسکول کے گیٹ کے باہر کھڑا دیکھا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں چھپی حسرت اور خواب اچھی طرح پہچانتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ وہ ایک دن ضرور اسکول آئے گا اور آج وہ ان کے سامنے تھا۔ دین محمد کو اسکول میں داخلہ کیا ملا اسے لگا کہ جیسے دونوں جہاں اس کی ملکیت ہو گئے ہیں۔ ہر آنے والا دن اس کے لیے ایک نیا دن ہوا۔ اس کی آنکھوں میں خواب بڑا آدمی بننے کا خواب وہ اپنی دنیا میں مست و مگن تھا' اسے نہیں خبر تھی کہ خواب تعبیر پانے سے پہلے ہی مر جائیں گے۔ اس دن موسم بے حد خوشگوار تھا' ٹھنڈی ٹھنڈی دل فریب سی ہوا بدن کو گدگدا رہی تھی۔ نیلے آسمان کو سرمئی بادلوں نے ڈھک لیا تھا۔ دین محمد بڑی ترنگ میں اسکول کی جانب قدم بڑھا رہا تھا۔ اس کے لب وطن کی محبت کا نغمہ گنگنا رہے تھے۔

وہ اپنے گلے کے سر فضا میں بکھیرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ راستے میں آنے والے لوگ ٹھٹک کر رُکتے' اسے دیکھتے پھر مسکرا کر آگے بڑھ جاتے' اسے لوگوں کی نظروں کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ آج اس کے اسکول میں بزم ادب تھی۔ جس میں اس نے یہ ترانہ پیش کرنا تھا۔ اسے امید واثق تھی کہ وہ پہلا انعام ضرور حاصل کرلے گا۔ اسی امید اور شوق نے اس کے گلے میں مزید لے پیدا کر دی تھی اب وہ گا رہا تھا۔

میرا دل تیری محبت کا ہے جاں بخش دیار
میرا سینہ ہے تیری حرمت کا ہے سنگین حصار
میرے محبوب وطن تجھ پہ اگر جاں ہو نثار
میں یہ سمجھوں گا ٹھکانے لگا سرمایۂ تن
اے میرے وطن پیارے وطن پاک وطن
پاک وطن اے میرے پیارے وطن

وہ مسکرا رہا تھا۔ تبھی کانوں میں ایک آواز پڑی۔

''ماسک لے لو' پیارے پیارے کپڑے لے لو' اپنی پسند کے کارٹونز کے ماسک لے لو۔'' دین محمد نے چونک کر مڑ کر دیکھا تو ایک شخص بے شمار ماسک اور رنگ برنگے غبارے اٹھائے اس کے پیچھے چلا آرہا تھا۔ دین محمد کے چلتے ہوئے قدم بے اختیار رک گئے وہ ٹھہر گیا۔ وہ شخص پاس آیا تو دین محمد بولا۔

''السلام علیکم انکل......!''

''وعلیکم السلام بیٹا' جیتے رہو۔'' اس شخص کے بولوں میں مٹھاس تھی۔

''انکل آپ کے پاس پاکستانی پرچم اور بیج ہوں گے؟'' دین محمد نے جوش سے بھرپور لہجے

میں دریافت کیا۔

"نہیں بیٹا......! میرے پاس نہیں ہیں۔"

اس کے انکار پر دین محمد بجھ گیا۔

"اوہ اچھا......!" وہ بوجھل دل لیے واپسی کے لیے مڑا تو اس شخص نے اسے روکا۔

"سنو تم یہ ماسک لے لو بچے تو یہ بہت پسند کرتے ہیں۔"

"نہیں مجھے یہ اچھے نہیں لگتے۔" دین محمد کے پاس تھوڑے پیسے ہی تھے جو وہ بیج اور پرچم کے لیے روک کر رکھنا چاہتا تھا۔

"اچھا تم اسپائیڈر مین بنو گے؟" اس نے اس کا دل للچایا۔

"اسپائیڈر مین؟" وہ اس شخص کا منہ تکنے لگا جواب اپنے کندھے سے لٹکے تھیلے میں سے کچھ نکال رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں اس کے ہاتھ میں سرخ اور نیلے رنگ کا لباس تھا جو بالکل اسپائیڈر مین کے لباس کی طرح تھا۔

"واؤ! مگر یہ تو بہت مہنگا ہوگا نا؟" اس کی آنکھوں میں ستائش تھی۔

"نہیں زیادہ نہیں...... صرف سو روپے کا ہے۔"

"سو روپے؟ میرے پاس تو صرف پچاس روپے ہیں۔" وہ مایوس سا ہو کر پلٹا تو وہ شخص فوراً آگے بڑھا۔

"چلو تم پچاس ہی دے دو۔" دین محمد نے پیسے نکالے اور بیج اور پرچم لینے کا ارادہ ٹال دیا۔

اس نے اسپائیڈر مین کا لباس خرید لیا۔ اس آدمی نے ساتھ ہی اسے ایک جیکٹ بھی دی تھی جو بالکل اس کے سائز کی تھی وہ یہ لینا چاہتا تھا۔

"میرا بیٹا بھی تمہاری عمر کا تھا جب اس کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ اور آج تمہیں دیکھ کر دل چاہ رہا ہے کہ تمہیں یہ جیکٹ دے دوں۔" ان کی آنکھوں کے آنسو نے دین محمد کو موم کر دیا تو اس نے جیکٹ لے لی اور اس ادھیڑ عمر کے اصرار پر اسے پہن بھی لیا۔

وہ خدا حافظ کہہ کر اسکول روانہ ہو گیا۔ اسکول میں گہما گہمی عروج پر تھی۔ تمام اسٹوڈنٹس رنگ برنگے لباس پہنے گھوم رہے تھے۔ دین محمد کا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔ اسمبلی کے بعد فنکشن شروع ہو جانا تھا۔ گھنٹی بجی تو سب طالب علم قطار در قطار اسمبلی ہال میں جمع ہو گئے۔ پرنسپل صاحب نے اسمبلی کا آغاز کرنے کا کہا تو ایک طالب علم قطار سے نکل کر سامنے جا کھڑا ہوا اور نہایت پُرسوز آواز میں تلاوتِ قرآن پاک کرنے لگا۔ دین محمد نظریں جھکائے کھڑا تھا جب ہی اسے اپنی جیکٹ میں کچھ چبھن کا احساس ہوا۔ تو اس نے زپ کھول کر اندر ہاتھ ڈالا تو اندرونی حصے میں ایک بٹن جیسی کوئی چیز تھی اس نے حیرت سے اس بٹن کی نوعیت کو محسوس کرنا چاہا۔ وہ بٹن جیکٹ کے اندر کچھ تاروں سے جڑا ہوا تھا۔

اس کے اندر تجسس ابھرا کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا اس نے کھینچ کر وہ بٹن نکالنا چاہا مگر اس دوران بٹن دب گیا۔ ایک زوردار دھماکا ہوا اور اس نے خود کو ہوا میں اڑتا ہوا محسوس کیا۔

☆......☆......☆

نیوز چینل پر اس وقت زبردست قسم کی رپورٹنگ جاری تھی جو میں نے دین محمد کے بارے میں انہیں فراہم کی تھی۔ میرے ذہن میں اس وقت پرنسپل صاحب کی شکل گھوم گئی جب میں دین محمد کے حوالے سے معلومات لینے ان کے پاس ہسپتال گئی تھی۔ ان کی آنکھیں دین محمد کے ذکر پر نم ہو گئی تھیں۔

”میں نے اسے وہ جیکٹ پہنے دیکھا تھا۔ اور میں اس سے اس بارے میں پوچھنا چاہتا تھا مگر اس وقت موقع نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ میں مزید کوئی بات سوچتا‘ وہ جیکٹ کے بٹن کو دبا چکا تھا۔“

”آپ کے خیال میں وہ دہشت گرد گروہ کا حصہ تھا؟“ میں نے مائیک ان کے سامنے کیے سوال کیا۔

”دین محمد کی آنکھوں میں ڈھیروں خواب تھے اور جذبوں کی امنگ تھی‘ وہ کہتا تھا کہ صاحب میں پڑھوں گا محنت کروں گا۔ اور بڑا آدمی بن کر اپنے ملک کی خدمت کروں گا۔ غربت کا خاتمہ کرکے خوشحالی لاؤں گا۔ غداروں کو کڑی سے کڑی سزا دلواؤں گا۔ اس کے خواب اٹل تھے‘ اس کے جذبے سچے تھے۔ وہ دہشت گرد نہیں تھا وہ دہشت گرد نہیں ہوسکتا۔ میں اسے پہچاننے میں غلطی نہیں کرسکتا۔ وہ شہید تھا کوئی اسے دہشت گرد کے روپ میں نہ پیش کرے وہ سازش کا شکار ہوا تھا۔“

اور پرنسپل صاحب صحیح کہہ رہے تھے۔ دین محمد کے بارے میں جاننے کے بعد میں بھی اتنا جان گئی تھی کہ وہ دہشت گرد نہیں تھا۔ اس کے خوابوں میں لگن تھی۔ مگر اس کے سب خواب ادھورے رہ گئے تھے۔ وہ اپنے سارے خوابوں سمیت منوں مٹی تلے جاسویا تھا۔ اس کے سارے خواب بھی خاک کی چادر اوڑھ کر سوگئے تھے۔ صرف دین محمد کے نہیں بلکہ اس کے ساتھیوں کے بھی اور ہر اس بچے کے جو اس اسکول میں ایک عزم لے کر آیا تھا اور اب اپنے ادھورے خوابوں کے ساتھ اس قوم کے مستقبل کو ویران کرگیا تھا۔

☆☆......☆☆



نازیہ بتول رضا کی شاعری کی کتاب ’میری تکمیل تم سے ہے‘ شائع ہوگئی ہے۔

قیمت 200

کالے جادو کی بھیانک دنیا میں ایک خدارسیدہ عامل کی داستان

عامل کامل

کالی دنیا، جادو، جنات، ٹونے ٹوٹکوں، سیاہ دل لوگوں کی کالی دنیا، جہاں دوشیزاؤں کو جادو کی بھینٹ چڑھانا، شیطان کو خوش کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ تھا اس دنیا میں ایک دین اور ایمان والے نے کس طرح ٹکرلی، اور اس ٹکراؤ کے نتیجے میں پیش آنیوالے دلچسپ، عبرت ناک، سبق آموز واقعات......

دین وایمان کی کشمکش کی داستان

چھٹی قسط

پیر شاہ محمد قادری

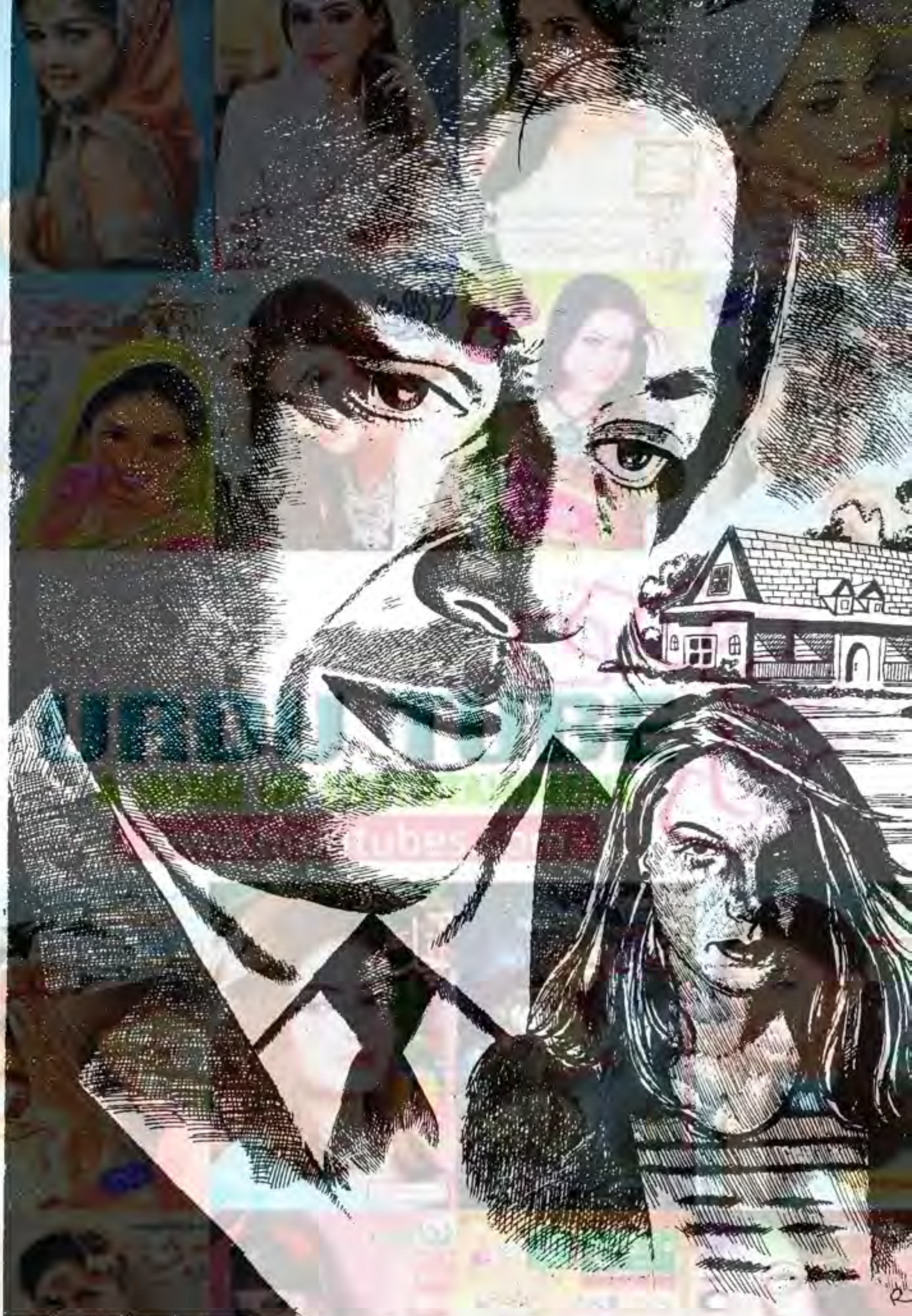
بگولہ جیسے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ میرے چہرے کے بالکل قریب آکر رک گیا' میں نے اپنی آنکھیں اس کی شدت سے بند کرلیں اور خود کو ہر قسم کی صورت حال کے دھارے پر چھوڑ دیا۔ لیکن پھر اچانک ہی بگولہ پیچھے ہٹنے لگا اور مجھ سے دور ہوتا چلا گیا۔ اس بات کو محسوس کر کے میں نے اپنی آنکھیں بھی کھول لیں' واقعی بگولہ پیچھے سرک رہا تھا...... دم بہ دم میرے اور اس کے درمیان فاصلہ بڑھتا چلا گیا...... پھر وہ اچانک ہی میری نظروں سے اوجھل ہو گیا...... اب چاروں طرف وہی سکوت اور خاموشی طاری تھی' جیسے تھوڑی دیر قبل میں نے کوئی خواب دیکھا ہو۔

اس وقت آسمان پر صبح کی سپیدی نمودار ہونے لگی تھی' اب میرا وظیفہ بھی اپنے اختتام کو پہنچ رہا تھا' چنانچہ جیسے ہی چاروں طرف اجالا پھیلا میں اٹھ کھڑا ہوا...... وظیفہ مکمل ہو چکا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھوں اور ٹانگوں کو مخصوص جھٹکے دیئے اور ان پر پڑھ پڑھ کر پھونکتا رہا۔ رات بھر کی مشقت کے بعد مجھے اپنا پورا جسم شل ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

اب میں اسی پتھر کی طرف بڑھا اور بلند آواز میں بولا

''صبح بخیر......! اصومانہ......!!''

''اوہ...... سلمان......! تم...... تم اپنے کام سے فارغ ہو گئے؟''



"ہاں...... اور اب میں اس پتھر کو ہٹا رہا ہوں......" میں نے جواب دیا۔ "دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔

میں نے ایک مخصوص وظیفہ پڑھا اور پتھر پر اپنے بازوؤں کا زور صرف کرنے لگا...... مجھے احساس تھا کہ بہ ظاہر بھی یہ پتھر ویسے ہی بھاری تھا اور باطنی طور پر اسے ایک جنوں کے سردار نے یہاں مسلط کیا تھا' یہ اس پتھر کی اضافی قوت اور خصوصیت تھی...... لیکن مجھے لگا جیسے میں نے کسی ہلکی سی شے کو دھکیل دیا ہو۔ میری ذرا سی قوت سے ہی وہ اپنی جگہ سے سرکا اور کافی فاصلے تک لڑھکتا چلا گیا۔ فوراً ہی ایک چھوٹا سا گڑھا میرے سامنے آ گیا اور کسی نے اپنا سر باہر نکالا۔ بلاشبہ یہ ایک حسین و جمیل چہرہ تھا...... گھنی زلفیں' بڑی بڑی آنکھیں' دودھ اور گلاب جیسے امتزاج سے بنی ہوئی رنگت اور انار کی قاشوں کی طرح تراشیدہ ہونٹ میں اسے مبہوت سا ہو کر دیکھتا ہی رہ گیا۔

فوراً ہی ان ہونٹوں پر ایک دلکش سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے گڑھے سے اپنا نرم و ملائم سا ہاتھ نکال کر میری طرف بڑھایا:

"اب...... باہر بھی نکالو سلمان......!"

"آں...... ہاں......!!" میں چونک کر آگے بڑھا۔

"کیا ہوا......؟ کہاں کھو گئے تھے......؟"

"میں...... میں......" میں ہکلایا: "تم بے حد خوبصورت ہو......!"

"اوہ......" وہ ہنسی: "یہ تو صرف دکھاوا ہے...... میں تو نہ جانے کتنے روپ بدل سکتی ہوں' میرا اصل روپ تو کچھ اور ہی ہے......اس جسم کا تحفہ مجھے سردار کی طرف سے ملا تھا......! اور مجھے تا زندگی اسی قید میں گزارنی تھی......!"

"اوہ......" میرے منہ سے نکلا: "کیا سردار کو علم نہیں ہوگا کہ تم کو رہائی مل گئی ہے؟"

"ہو سکتا ہے۔" اس نے سر ہلایا: "لیکن ایسا تب ہوگا کہ جب اسے اپنے طلسم کے ٹوٹ جانے کا خیال آئے گا' ورنہ تو وہ سوچ بھی نہ سکے گا کہ کوئی انسان اس کے بنائے ہوئے حصار کو توڑنے کی طاقت رکھتا ہوگا......!"

"خیر......!" میں نے سر ہلایا: "اگر وہ میرے مقابل آئے گا' تو میں بھی اس سے مقابلے کیلئے ذہنی طور پر تیار ہوں۔"

"اور...... جسمانی طور پر......!" اس نے غور سے مجھے دیکھا' پھر چونک کر بولی: "ارے......! کیا تم مجھے باہر نہیں نکالو گے......؟"

"اوہ ہاں...... میں تو بھول ہی گیا......!" میں بھی چونکا تھا' پھر میں نے اس کا ہاتھ تھاما اور اسے باہر کی طرف کھینچا' اس نے اپنا دوسرا ہاتھ گڑھے کے سرے پر رکھا اور چھلانگ مار کر باہر نکل آئی...... اب وہ پوری طرح میرے سامنے تھی' میرے ذہن میں اس وقت چودھویں کے مکمل چاند کے علاوہ اور کوئی تشبیہ نہیں آ رہی تھی کہ جس سے صومانہ کو مماثل کروں...... بلاشبہ وہ ایک حسین ترین پیکر تھا...... تمام خوب صورتیوں اور رعنائیوں سے مزین......!! اس کی آنکھوں میں ایک شوخ سی مسکراہٹ تھی' پھر اس نے قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا:

"میں بھی ایک بات کہوں......!"

"ہاں...... بولو......!!"

"تم بھی بہت خوبصورت ہو......" اس نے آہستہ سے کہا: "میرے محسن...... میرے ہمدرد......!!"

میں خاموش ہی رہا' پھر تھوڑی دیر بعد میں نے اس سے کہا:

''اب کیا کرنا ہے......! تم کہاں جاؤ گی......؟''

''اس وقت تم میرے آقا ہو......'' اس کے انداز میں ادب تھا: ''جو حکم دو گے' میں وہی کروں گی......!''

''میں تو مستقل سفر میں ہوں۔'' میں نے جواب دیا: ''آج یہاں تو کل کہیں اور......بس یوں سمجھو کہ جہاں میری ضرورت ہوگی میں وہاں پہنچ جاؤں گا...... میرا بھی یہی مشن ہے کہ میں دکھی انسانیت کی خدمت کروں اور بے چارے پریشان حال مظلوموں کو ظالم اور جابر لوگوں سے نجات دلاؤں......!''

''ہوں......'' اس نے خوش دلی سے کہا: ''راستہ تمہارا بھی وہی ہے' جو میرا ہے' بس فرق صرف منزل کا ہے' میرا کام صرف عورتوں تک محدود ہے...... کیونکہ میرے خیال میں عورت ذات سے زیادہ مشکلوں اور پریشانیوں میں کوئی بھی گرفتار نہیں ہے۔ تم چاروں طرف نظر ڈالو اور غور کرو......! تقریباً ہر دوسرے گھر میں عورت پر ظلم کے پہاڑ توڑے جاتے ہیں...... سب سے بڑی مثال یہی لے لو کہ اکثر جگہوں پر عورت کی خوبصورتی ہی اس کیلئے مصیبت بن جاتی ہے۔ لالچی اور ہوس کے مارے مرد پھر کس طرح اس کی آبرو سے کھیلتے ہیں اور اس کی عزت کا جنازہ نکالتے ہیں......! کیا تم اس بات سے واقف نہیں ہو؟''

''تمہاری یہ بات درست ہے۔'' میں نے اتفاق کیا: ''مجھے واقعی ان باتوں کا اتنا علم نہیں ہے' میں تو بس اپنے گھر سے اس لئے نکلا ہوں کہ جو کچھ میں نے حاصل کیا ہے اور جو روحانی قوتیں مجھے ملی ہیں' میں انہیں پوری طرح استعمال کروں اور لوگوں کے مسائل حل کروں......!''

''تمہارے ارادے بہت اچھے اور نیک ہیں......'' صومانہ نے سر ہلایا: ''اور مجھے معلوم ہے کہ جب میں تمہیں کسی عورت کے ساتھ ہونے والی ناانصافی اور ظلم سے تمہیں آگاہ کروں گی' تو تم برداشت نہیں کر سکو گے اور تمہارا دل چاہے گا کہ فوراً ہی اس کے مسئلے کو حل کر گزرو......اور اسے مصیبت سے نجات دلانے کیلئے بے چین ہو جاؤ گے......!!''

''میں تمہاری بات کو رد نہیں کروں گا......'' میں نے آہستہ سے کہا: ''میں نے کہا نا کہ میں مظلوم کی مدد کیلئے اپنے گھر سے نکلا ہوں۔''

''بس تو پھر میں ثابت کر دوں گی کہ عورت ہی تمہاری دنیا کی سب سے مظلوم ہستی ہے......'' صومانہ کے لہجے میں عزم تھا۔

''کیا ہم صحرا میں کھڑے رہیں گے......؟'' میں نے سوال کیا' کیونکہ عین اسی وقت بس احساس ہوا تھا کہ میں رات سے بھوکا ہوں۔

''نہیں آقا......!'' وہ فوراً ہی بولی: ''آپ جہاں کہیں گے میں وہاں آپ کو پہنچا دوں گی......''

''پھر تم خود کہاں جاؤ گی......؟'' میرا سوال تھا۔

''اس بارے میں بس آپ ہی فیصلہ کریں۔'' اس نے کندھے اچکائے: ''میری رائے تو یہ ہے کہ آپ مجھے اپنے ساتھ ہی رکھیں' میں قدم قدم پر آپ کی راہنمائی کروں گی اور اپنی صلاحیتوں سے بھی آپ کے کام آؤں گی......اس طرح مجھے بھی آپ کا ساتھ مل جائے گا اور......میری زندگی کے دن اچھے گزر جائیں گے......!''

''تمہاری باتوں سے مجھے گلنار یاد آ گئی۔'' میں نے کہا: ''اس کی بھی یہی عادت تھی' کبھی وہ مجھے تم سے مخاطب کرتی تھی اور کبھی آپ جناب کرنے لگتی تھی......!''

"کون ہے یہ گلنار......!" صومانہ کا لہجہ عجیب تھا' وہ غور سے مجھے دیکھنے لگی۔ "کیا آپ کی بیوی ہے......؟"

"ارے نہیں......" میں ہنسا: "اس کے بارے میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال تو بھوک کے مارے برا حال ہو رہا ہے!"

"کیا یہیں کچھ منگوا دوں......؟" اس نے بڑے ادب سے پوچھا۔

"ارے نہیں......!!" میں نے سر ہلایا: "یہاں تو چاروں طرف دھول اور مٹی کا راج ہے...... آؤ...... کہیں چلیں......!"

"آپ قدم بڑھائیں......" صومانہ بولی: "میں آپ کو جلد سے جلد کسی ایسی جگہ پہنچا دوں گی' جہاں آپ کھا پی سکیں......!"

"اور تم خود......!"

"میں بھی کھاؤں گی......" وہ ہنسی: "لیکن میں صرف آپ کو ہی دکھائی دوں گی' دوسروں کی نظروں سے میرا وجود مخفی ہوگا' مجھ میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ میں جسے چاہوں اس پر خود کو ظاہر کر دوں......"

"بہت خوب......" میرے منہ سے نکلا: "یہ تو بڑی اچھی بات ہے......"

"ابھی تو آگے آگے دیکھئے گا کہ مجھ میں کیا کیا کمال موجود ہیں......" اس نے مسکرا کر سر ہلایا: "اب میں آپ کو کس اچھے سے ہوٹل میں پہنچا دوں......"

اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی میری آنکھوں کے آگے دھند سی چھا گئی اور جب یہ دھند ہٹی تو میں نے دیکھا کہ میں ایک گنجان آباد علاقے میں کھڑا ہوا' اسی وقت صومانہ نے کہا:

"سامنے ہوٹل موجود ہے...... میں آپ کو میلوں کا سفر لمحوں میں طے کروا سکتی ہوں' لیکن اس کی شرط صرف یہ ہے کہ جہاں سے سفر شروع ہو' وہ علاقہ ویران اور بے آباد ہو...... انسانی آبادی کی حدود میں داخل ہونے کے بعد یہ میرے لئے ممکن نہ ہوگا...... میرا مطلب یہ ہے کہ اگر اب آپ کو سفر کرنا ہوگا' تو عام ہی طریقہ استعمال ہو سکے گا......"

"کوئی بات نہیں' تم نے یہاں تک پہنچا دیا...... یہی بہت ہے' یوں بھی کسی سفر کا مزا ماحول میں ہی آتا ہے' اگر میں اس طرح سفر کرتا رہا تو پھر مزا کیا آئے گا......!" معلوم ہی نہیں ہوگا کہ کوئی مسافت طے ہوئی ہے......!"

"چلیں...... میں آئندہ اس بات کا خیال رکھوں گی۔" وہ مسکرائی اور پھر اس نے مجھے ہوٹل میں داخل ہونے کا اشارہ کیا۔ میں نے قدم آگے بڑھا دیئے اور پوچھا: "یہ کون سا علاقہ ہے؟"

"ہم اس وقت اس صحرا سے کوسوں دور ہیں......!"

"اوہ...... ناقابل یقین ہے......!!" میرے منہ سے نکلا۔

"آپ کو ہم جنوں کی صلاحیتوں کا اندازہ نہیں ہے...... ہم لوگ وہ کام کر سکتے ہیں کہ جس کا گمان بھی ہونا انسان کیلئے مشکل ہے......!"

"یہ تو ہے......" میں نے سر ہلایا: "لیکن بعض جگہوں پر تمہارے لوگ بھی انسانوں کی بہت سی صلاحیوں پر ششدر رہ جاتے ہوں گے......؟ کیا خیال ہے......؟"

"واقعی...... اس میں کوئی شک نہیں ہے......" اس نے سر ہلایا: "ہماری قوم میں اکثریت ایسی بھی ہے جو انسانوں سے بہت متاثر ہے...... اور ان کی خصوصیات کا لوہا مانتی ہے۔"

"یہ جان کر خوشی ہوئی......" میں نے جواب دیا: "سب ہی اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی مخلوقات ہیں

اور خیر و شر سب میں ہی ہوتا ہے......"

"ہاں...... لیکن بعض لوگوں کو...... میرا مطلب ہے کہ کچھ مخلوق ایسی بھی ہے، جسے انسان کو اشرف المخلوقات بنائے جانے پر اعتراض ہے اور وہ اپنے ان خیالات کا اظہار مختلف صورتوں سے کرتے رہتے ہیں۔"

"لیکن اس معاملے پر اعتراض کرنا تو سخت گناہ اور جرم ہے۔" میں نے حیرت کا اظہار کیا: "خالق کائنات کے فیصلے اٹل اور برحق ہیں...... کسی میں یہ طاقت نہیں کہ ان سے انحراف کر سکے......"

"یہ باتیں ختم کرنے کو دل نہیں چاہ رہا۔" صومانہ مسکرا کر بولی: "لیکن پہلے آپ اپنی بھوک مٹا لیں...... پھر باتیں ہوں گی......!"

میں پھر خاموشی سے ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ صومانہ اب میری نظروں سے بھی اوجھل تھی۔ میں نے ایک میز منتخب کی اور کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا، ہال میں بڑی اسکرین پر ٹی وی بھی چل رہا تھا:

"تم کیا کھاؤ گی......؟" میں نے صومانہ سے پوچھا۔

"آپ میری فکر مت کریں......" میرے کان میں سرگوشی ہوئی: "میری خوراک یہ سب نہیں ہے، ہاں البتہ اگر کہیں مجبوراً کھانا پڑا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے...... بہرحال یہ غذا میری بھوک نہیں مٹا سکے گی......!"

یہ سن کر میں نے سر ہلایا اور پھر ایک ویٹر کو اشارہ کیا...... تھوڑی دیر بعد ہی میں کھانا کھانے میں مصروف ہو چکا تھا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میری نظر میز پر پڑی تو مجھے گلاس کے نیچے کچھ نوٹ رکھے ہوئے دکھائی دیے...... میں حیرت سے انہیں دیکھنے لگا:

"یہ رقم آپ کیلئے ہے۔" صومانہ کی آواز آئی:

"اس میں سے کھانے کے پیسے دیں اور باقی اپنے پاس رکھ لیں......!"

میں کچھ بولنے ہی والا تھا کہ عین اسی وقت ویٹر میری طرف بڑھا:

"جناب......! اور کیا خدمت کروں آپ کی......!"

"نہیں بس...... شکریہ......!" میں نے جواب دیا۔

ویٹر نے سر ہلایا اور میں نے اس سے رقم پوچھی، وہ کاؤنٹر کی طرف گیا اور اس نے مجھے بل بتایا، میں نے اسے پیسے دیئے اور بقایا لئے بغیر باہر نکل آیا۔ صومانہ نے ہی مجھے ایسا کرنے کی ہدایت کی تھی...... پھر ہم دونوں ایک کھلی جگہ پر آ پہنچے تھے، سامنے ہی چھوٹا اور خوبصورت سا ایک پارک موجود تھا۔ صومانہ نے مجھے اس پارک میں بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ میں پارک میں داخل ہوا اور درخت کے سائے میں بچھی ہوئی ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ فوراً ہی صومانہ نمودار ہو گئی اب وہ ایک مختلف قسم کے لباس میں نظر آ رہی تھی اور اس گلابی رنگ کے سوٹ میں وہ اور بھی دلکش نظر آ رہی تھی۔ وہ بھی میرے برابر میں ہی بیٹھ گئی:

"اب آپ کا جو بھی پروگرام ہو، اس سے مجھے آگاہ کر دیں......" صومانہ بولی اور میں چونک سا گیا، میں تو اب تک اس کے حسن میں کھویا ہوا تھا۔

"آں...... ہاں......" میں نے جلدی سے سر ہلایا اور اس کے ہونٹوں پر ایک دلآویز مسکراہٹ نمودار ہو گئی، البتہ وہ خاموش ہی رہی تھی: "میرا پروگرام یہ ہے کہ اب میں واپس سردار پچل کے گاؤں جانا چاہتا ہوں......" جہاں گلنار میرا انتظار کر رہی ہو گی......"

"ٹھیک ہے......" اس نے طویل سانس لے کر سر ہلایا اور خاموش سی ہو گئی۔

میں اس شہر سے ہرگز واقف نہیں تھا، لیکن یہ بے حد بارونق تھا، جس پارک میں اس وقت ہم دونوں موجود تھے، یہاں بھی کافی لوگوں کی آمدورفت تھی اور بہت سے لوگ پارک میں آرام سے بیٹھے ہوئے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

''کیا ہوا صومانہ......! تم بالکل ہی چپ ہوگئی......!'' تھوڑی دیر بعد میں نے کہا، پھر مجھے یاد آیا:

''وہ پیسے تمہارے پاس کہاں سے آئے تھے......؟''

''ان باتوں کے بارے میں آپ مجھ سے کوئی سوال نہ کریں،'' اس نے کہا: ''آپ میرے آقا ہیں اور آپ کی ہر ضرورت پوری کرنا میرے فرائض میں شامل ہے......!''

''اچھا...... لیکن میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا اور وہ یہ کہ کبھی کسی غلط طریقے سے میرے لئے کوئی آسانی فراہم نہ کرنا......!''

''میں خود بھی اس بات کو سمجھتی ہوں۔'' اس نے جواب دیا: ''میں ہر ممکن اس بات کا خیال رکھوں گی......!''

جواباً میں نے سر ہلایا دیا۔ تھوڑی دیر بعد صومانہ نے مجھ سے کہا:

''میرا خیال ہے کہ اب شام کا وقت تو ہوگیا ہے، آپ اپنے سفر کا آغاز اب کل صبح ہی کریں، تاکہ شام تک اپنی منزل تک پہنچ سکیں......!''

''ٹھیک ہے...... لیکن پھر رات کہاں گزرے گی......؟''

''وہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' اس نے کہا: ''آپ یہاں کسی ہوٹل میں قیام کر لیجئے گا...... رات کا کھانا کھانے کے بعد جب ہم کمرے میں بیٹھیں گے تو آپ مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتائیے گا...... خاص طور پر گلنار کے بارے میں......!''

''کیا بات ہے...... تم اس کے بارے میں کیوں اتنی فکر مند ہو......؟''

''بات یہ ہے آقا......! کہ میں عورتوں کی ہمدرد ہوں اور ان ہی کے بارے میں سوچتے ہوئے میرے دن رات گزرتے ہیں...... میں اس سے ملنے کی خواہشمند ہوں...... بس......!!!''

میں نے سر ہلا دیا اور پھر خاموش ہی رہا۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر ہم نے باہر نکلنے کے بعد اسی ہوٹل کا رخ کیا تھا۔ جہاں میں دوپہر کے وقت کھانا کھا چکا تھا۔ وہ رہائشی ہوٹل بھی تھا...... میں نے وہاں ایک کمرہ کرائے پر لیا اور اپنا سفری بیگ لے کر کمرے میں آ گیا۔ میرے اس بیگ میں وہ سامان تھا، جو وظیفے کے سلسلے میں میرے لئے کار آمد تھا...... اس کے علاوہ کوئی بھی چیز ایسی نہیں تھی جو میری ضرورت کے مطابق نہ ہو......

جب میں نے کمرے میں بیگ رکھا، تو صومانہ نے مجھ سے کہا:

''کمرہ تو آپ نے لے لیا ہے، اس کام سے تو فراغت ہوگئی، اب میرے ساتھ مارکیٹ بھی چلے چلیں، تاکہ اپنے لئے کچھ لباس وغیرہ خرید لیں...... میں خود بھی آپ کیلئے یہ چیزیں فراہم کر سکتی ہوں، لیکن آپ اپنی پسند سے ہی لیں تو زیادہ اچھا ہے۔''

''میرے مقابلے میں تم زمانے بھر میں گھومی ہوئی ہو۔'' میں مسکرایا: ''اس لئے مجھ سے بہتر انداز میں تم خریداری کر سکتی ہو۔''

''ایک دفعہ آپ کی پسند دیکھ لوں، پھر میں خود ہی لے آیا کروں گی۔'' وہ بھی مسکرائی تھی۔

آخرکار مارکیٹ جانے کا فیصلہ ہوا، شام اب ڈھلنے ہی والی تھی ور چاروں طرف روشنیوں کا بسیرا ہو چکا تھا، میں نے قریب سے گزرنے والی ایک خالی ٹیکسی کو روکا اور ڈرائیور کو قریبی مارکیٹ چلنے کیلئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد ہی میں ایک جگمگاتی ہوئی سڑک پر کھڑا تھا۔ جہاں لائن سے دکانوں کی قطار تھی۔

''آئیں......!'' صومانہ نے میرے کان میں سرگوشی کی: ''ذرا اس مارکیٹ میں گھومتے ہیں' پھر بعد میں خریداری کیجئے گا۔''

دل تو میرا بھی یہی چاہ رہا تھا' چنانچہ میں نے اس بازار میں قدم رکھ دیئے اور بے مقصد ہی ادھر ادھر ڈولنے لگا۔

میں سامان سے مزین دکانوں کا بھی جائزہ لے رہا تھا اور شوکیسوں میں سجے ہوئے دیدہ زیب ملبوسات کا بھی معائنہ کر رہا تھا۔ بلاشبہ یہ انواع اقسام کے ملبوسات کی بہت وسیع مارکیٹ تھی۔

چنانچہ وقت کا اندازہ ہی نہ ہو سکا' آخر کار صومانہ نے مجھے اشارہ کیا کہ اب میں کسی دکان میں پہنچ کر اپنا کام شروع کر دوں...... چنانچہ میں فوراً ہی ایک دکان میں جا گھسا......

دکان میں دو افراد موجود تھے۔ میں جیسے ہی اندر داخل ہوا' ان دونوں کی نظریں دیوار گیر گھڑی پر پڑیں اور پھر وہ فوراً ہی مجھ سے بولے:

''جی جناب......! فرمائیں......!!''

''مجھے چند سوٹ خریدنے ہیں......''

''جی بالکل بالکل......!'' ان میں سے ایک نے کہا: ''لیکن ذرا جلدی کر لیں...... آپ کو معلوم ہی ہے کہ دس منٹ رہ گئے ہیں...... اور ان دس منٹ کے اندر ہی ہمیں دکان بند کر کے گھر پہنچنا ہے......''

عین اسی وقت آس پاس کی دکانیں بند ہونے لگیں۔ خریدار بھی اب شاذ و نادر ہی دکھائی دے رہے تھے۔ یہ سب اچانک ہی ہوا تھا اور میں اس افراتفری کو قطعی سمجھ نہ سکا تھا......

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا......!'' میں جلدی سے بولا۔

''انہوں نے مجھے دیکھا اور پھر ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے' آخر ان میں سے ایک نے پوچھا۔

''کیا آپ اس شہر میں اجنبی ہیں......؟''

''ہاں بھائی...... میں آج ہی یہاں وارد ہوا ہوں......''

''اوہ...... پھر تو آپ کو سمجھانا ذرا مشکل ہوگا......'' اس نے تاسف سے کہا: ''یہ بتائیں کہ آپ کی اس وقت کہاں رہائش ہے...... میرا مطلب ہے کہ آپ کا قیام کہاں ہے......''

''میں ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوں......''

''اور آپ کی واپسی کب ہو گی یہاں سے......؟''

''میں کل صبح روانہ ہو جاؤں گا۔''

''بس تو پھر آپ ابھی خریداری کا ارادہ ترک کر دیں اور صبح روانہ ہو جائیں...... میری دعا ہے کہ آپ خیریت سے اپنے ہوٹل پہنچ جائیں......''

''لیکن...... میری خریداری کرنا بہت ضروری ہے......!''

''ہمیں افسوس ہے...... ہم اس وقت آپ کی خدمت کرنے سے قاصر ہیں...... بہت بہت معذرت......!!!''

یہ کہہ کر انہوں نے مجھے حیران و پریشان ہی چھوڑا اور برق رفتاری سے اپنی دکان سمیٹنے لگے۔ پھر ایک منٹ کے اندر ہی اندر انہوں نے اپنی دکان کے شٹر گرائے اور یہ جا وہ جا......!

اب میں نے دیکھا کہ ہر طرف ہو کا سا عالم ہو چکا تھا۔ جب میں اس مارکیٹ میں داخل ہوا تھا' تو ہر طرف رونقوں اور روشنیوں کی جگمگاہٹیں دکھائی دی تھیں' لیکن اس وقت یہاں سوائے اندھیروں اور چاروں طرف چھائے ہوئے سناٹے کے سوا کچھ

نہیں تھا۔
"یہ آخر کیا ماجرا ہے صومانہ......؟" میں نے اپنی غائبانہ دوست کو مخاطب کیا۔ لیکن اس کی طرف سے مجھے کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ لیکن مجھے صومانہ کہیں نہ دکھائی دی۔ کیا وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی......؟؟
اب میں نے اپنے مؤکلوں سے رجوع کیا۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ ان کی جانب سے بھی خاموشی تھی۔ آخرکار میں جھلا اٹھا اور اس مارکیٹ سے نکل آیا۔
یہاں آنے کے بعد میری حیرت میں اور بھی اضافہ ہو گیا' ہر طرف ہی سناٹا اور اندھیرا تھا۔ روڈ سنسان دکھائی دے رہے تھے' یک بیک کسی جانب سے ایک گاڑی والا کافی تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے میرے قریب سے گزرا' میں نے اسے ہاتھ دیا تو اس نے فوراً ہی بریک لگائے......اور تھوڑے فاصلے پر جا کر گاڑی رک گئی۔
میں اس کی طرف لپکا' یہ بھی ٹیکسی ہی تھی' ڈرائیور نے فوراً ہی دروازہ کھولا اور میں بیٹھ گیا:
"صاحب...... آپ کہاں پھنس گئے تھے......؟" ڈرائیور نے مجھ سے پوچھا: "میں تو خیر آج اتفاق سے لیٹ ہو گیا......!"
"وہ...... میں...... مجھے مارکیٹ میں دیر ہو گئی......!"
"اوہ......کیا آپ کو ٹائم کا خیال نہیں رہا' نو بجنے میں صرف تین منٹ رہ گئے ہیں......جانا کہاں ہے آپ کو......؟"
"ہوٹل......ریجن......ہاں......"
"چلیں......وہ میرے راستے میں ہی پڑے گا......!" یہ کہہ کر اس نے آندھی اور طوفان کی طرح اپنی ٹیکسی بھگائی اور دو منٹ کے اندر ہی اندر مجھے ہوٹل کے سامنے اتار دیا۔ میں نے کرایہ دینے کیلئے جیب میں ہاتھ ڈالا لیکن وہ رکا نہیں اور آگے بڑھتا چلا گیا۔ میں اس کی ٹیکسی کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ پھر میں نے کندھے اچکا دیئے......راستے میں بھی ہر طرف موت جیسا سناٹا طاری رہا تھا......صرف سڑکوں کے کھمبوں پر روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔
اس کے علاوہ ہر جگہ تاریکی کا راج تھا......یوں جیسے کسی نے پورے شہر پر اپنا سحر پھونک دیا ہو۔
یہ سب آخر کیا چکر تھا......؟ اسی الجھن میں میں نے ہوٹل کا رخ کیا' یہاں بھی اندھیرا تھا اور ہوٹل کا مین گیٹ بند ہو چکا تھا' میں نے دستک دی تو فوراً ہی اندر سے پوچھا گیا:
"کون ہے......؟"
"میں سلمان ہوں...... میں نے یہاں کمرہ کرائے پر لیا ہے......!"
فوراً ہی گیٹ کھول دیا گیا:
"جلدی سے اندر آ جائیں......" مجھ سے کہا گیا۔ یہاں بھی اندھیرا دکھائی دے رہا تھا۔ میں اندر آیا تو گیٹ بند کر دیا گیا۔
"یہاں......اتنا اندھیرا کیوں ہے......؟ بلکہ مجھے تو پورا شہر ہی تاریکی میں ڈوبا ہوا دکھائی دے رہا ہے......؟ آخر......اس کی کیا وجہ ہے......؟"
"کیا آپ کو معلوم نہیں ہے......؟"
"نہیں......!"
"اوہ......کیا آپ اجنبی ہیں......؟"
"ہاں...... میں آج ہی اس شہر میں آیا ہوں......!"
"اچھا......آئیں میں آپ کو منیجر صاحب کے کمرے میں لے چلوں......وہ آپ کو تفصیل سے آگاہ کر دیں گے......!!"
پھر اس نے میرا ہاتھ تھاما تھا' اب میں اس

اندھیرے میں کسی حد تک دیکھنے کے قابل ہو چکا تھا...... اس لئے کسی قسم کی ٹھوکر کھائے بغیر آرام سے آگے بڑھتا رہا۔ جلد ہی اس آدمی نے مجھے ایک دروازے تک پہنچایا اور دستک دے کر وہاں سے چلا گیا:

''کون ہے......؟'' اندر سے آواز آئی' میں نے جواب میں اپنا تعارف کروایا تو دروازہ کھلا اور مجھ سے کہا گیا:

''اندر آ جائیں آپ......!!'' میں کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کمرے میں ایک کونے میں نہایت مدھم سی روشنی دکھائی دے رہی تھی' اتنی مدھم کہ مجھے اس شخص کے خدوخال بھی واضح دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ بہرحال وہ دروازہ بند کر کے واپس مڑا اور مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی میرے سامنے براجمان ہو گیا:

''آپ یہاں کیوں آئے ہیں......؟ یہ تو بلاؤں کا شہر ہے......!!''

گو کہ اس کا چہرہ مجھے صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا' اس کے باوجود میں اسے تکتا ہی رہ گیا:

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا......!''

''اس شہر میں نہ جانے کتنے دنوں سے روز ہی ایک عجیب و غریب قسم کی مصیبت نازل ہو رہی ہے۔ جہاں روشنی دکھائی دیتی ہے...... وہ بلائیں وہیں پر حملہ آور ہوتی ہیں اور وہاں موجود انسانوں کو بھنبھوڑ کر رکھ دیتی ہے...... وہ...... وہ خون آشام ہیں' انسانی گوشت کی رسیا ہیں......!!''

''لیکن...... ایسا کیوں......؟ اور وہ بلائیں کس قسم کی ہیں......؟ کہاں سے آتی ہیں......؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''اس بارے میں جاننے کیلئے سر توڑ کوشش کی جا رہی ہے' لیکن کوئی سراغ نہیں مل رہا......''

''کیا انہیں کسی نے نمودار ہوتے دیکھا ہے......؟''

''ہاں...... اور ان کی فلمیں بھی بنائی گئی ہیں' تصاویر بھی لی گئی ہیں...... حکومت کی طرف سے چند اہم اقدامات بھی کیے گئے ہیں' لیکن ان کی مشینری بھی اس معاملے میں ناکام ہو چکی ہے...... سب ہی اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہیں کہ یہ کون سا المیہ ہے اور اس کا سدباب کیا ہے۔''

''کیا میں وہ فلمیں دیکھ سکتا ہوں!'' میں نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

''ضرور...... لیکن دن کے وقت......'' اس نے جواب دیا اور پھر طویل سانس لے کر بولا: ''آپ نے دیکھا ہی ہوگا کہ یہ کتنا بارونق اور خوبصورت شہر ہے۔ لیکن رات کے نو بجتے ہی اس کی حالت قبرستان سے بھی زیادہ ویران ہو جاتی ہے...... کافی تعداد میں تو لوگ یہاں سے نقل مکانی ہی کر گئے ہیں......!!''

''ہوں...... ظاہر ہے کہ ان حالات میں لوگ مجبور ہو گئے ہیں' ورنہ کون اپنی سکونت کو ترک کرتا ہے......''

''اب میں آپ کی تعریف معلوم کرنا چاہوں گا......!''

''میرا نام سلمان احمد ہے اور تم مجھے ایک شہر شہر گاؤں گاؤں بسیرا کرنے والا مسافر کہہ سکتے ہو......'' میں نے بتایا: ''یہاں آنے سے قبل مجھے قطعی ان حالات کا اندازہ نہیں تھا......!''

''کوئی مسئلہ نہیں ہے جناب......!'' اس نے سر ہلایا: ''آپ کل صبح سویرے ہی یہاں سے روانہ ہو جائے گا...... ہم لوگوں کا کیا ہے......! ہماری زندگی تو گزر رہی ہے۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' میں نے جواب

دیا: ''میں اب اس خونی کھیل کو دیکھ کر ہی یہاں سے جاؤں گا...... ہوسکتا ہے کہ...... خیر...... میں یہاں مزید رکنا چاہتا ہوں......''

منیجر نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا اور تھوڑی دیر بعد بولا:

''میرا خیال ہے کہ آپ میری بات کو مذاق سمجھ رہے ہیں یا پھر شاید معاملے کی سنگینی کا آپ کو اندازہ نہیں ہو رہا......''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے...... میں کچھ اسی قسم کا آدمی ہوں' اگر میں یہاں سے یونہی رخصت ہو گیا تو ہمیشہ میرے دل میں یہی خلش رہے گی کہ نہ جانے اس شہر میں کیا ہو رہا تھا...... اس لئے میں چند دن اور یہاں گزاروں گا' پھر اپنے سفر پر روانہ ہو جاؤں گا۔''

''ہم مصیبت زدہ لوگوں کی پریشانی دیکھ کر آپ کو کیا حاصل ہوگا' بہتر تو یہ ہے کہ آپ کل صبح یہاں سے روانہ ہو جائیں۔''

اس نے مجھے مشورہ دیا۔

''نہیں...... اب ایسا نہیں ہوسکتا۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا: ''میں صبح مزید دو دن کیلئے کمرہ کرائے پر لوں گا...... پھر کل تم مجھے بلاؤں سے آگاہ کرنا......''

''آپ کو کرایہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے کہا: ''اگر آپ اس شہر کے ہمدرد بن کر دو دن رہنا چاہتے ہیں تو آپ کی رہائش اور کھانے پینے کا اہتمام میرے ہوٹل کی طرف سے ہوگا...... اب میں آپ کو کمرے تک بھجوا دیتا ہوں...... صبح میں ضرور آپ سے ملاقات کروں گا......''

میں سر ہلا کر اٹھ کھڑا ہوا' منیجر نے اپنے ایک ملازم کو بلا کر مجھے میرے کمرے تک بھجوا دیا۔ مجھے بھی اپنے کمرے میں اندھیرا ہی رکھنا پڑا تھا۔ اب مجھے صومانہ کی طرف سے تشویش ہو رہی تھی' وہ اچانک ہی غائب ہوئی تھی...... میں نے اپنے مؤکلوں سے بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی' لیکن ان کی طرف سے بھی جواب نہ ملا تھا...... تھک ہار کر میں نے بستر کا رخ کیا اور سو رہا۔

دوسرے دن صبح مجھے اٹھانے والی صومانہ ہی تھی' اس کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے' میں نے بے ساختہ پوچھا:

''تم کہاں غائب ہو گئی تھیں......!''

''میں الجھن کا شکار ہو گئی تھی آقا......!'' اس نے بتایا: ''مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے سردار جنات کو میرے بارے میں اطلاع مل گئی ہے' کیونکہ میں نے ان کے چند مخصوص کارندوں کو دیکھا تھا' پھر میں نے وقتی طور پر اس شہر کو چھوڑ دینا ہی مناسب سمجھا اور اس کیلئے میں آپ کو بھی مطلع نہ کر سکی' میں آپ سے سخت شرمندہ ہوں۔''

''میں پریشان ہو گیا تھا...... کہ نہ جانے تمہارے ساتھ کیا حادثہ پیش آ گیا۔''

''سب کچھ بڑی عجلت میں ہوا تھا' بس یوں سمجھیں کہ میں گھبرا گئی تھی' چنانچہ فوراً ہی وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔'' اس کے لہجے میں شرمندگی تھی۔

''تمہارے اس مسئلے کو حل کرنا بھی بہت ضروری ہے۔'' میں نے کہا: ''اور اس سلسلے میں مجھے تمہارے سردار سے بات چیت کرنا ہوگی۔''

''ارے کیا کہہ رہے ہیں؟'' وہ اچھل پڑی: ''اگر آپ نے ایسا کوئی قدم اٹھایا تو ہم دونوں ہی ان کے عتاب کا شکار ہو جائیں گے...... ایسا تو آپ سوچیں بھی نہیں تو اچھا ہے۔''

''یہ تو وقت بتائے گا کہ کیا انجام ہوتا ہے۔'' میں نے جواب دیا: ''لیکن وہ مسئلہ بعد میں دیکھیں گے' ابھی فی الحال تو تم یہ بتاؤ کہ کیا اب تم خطرے سے باہر ہو؟''

''میں خطرے میں نہیں تھی آقا......!'' وہ سر جھکا کر بولی: ''غلط فہمی کا شکار ہوگئی تھی۔ سردار جنات کے کارندے کسی اور ہی مقصد کے تحت وہاں پہنچے تھے' وہ میری موجودگی سے قطعی لاعلم تھے۔''

''اوہ......تو یہ بات تھی......اور تم نے بے وجہ خود کو بھی پریشان کیا اور اپنے ساتھ مجھے بھی الجھن میں ڈالا......خیر......بات یہ ہے کہ اس شہر کے لوگ ایک عجیب وغریب مصیبت کا شکار ہیں......ہمیں ان کی مدد کرنا ہوگی......انہیں اس پریشانی سے نجات دلانا ہوگی۔''

''اوہ......تو آپ کو اس بارے میں معلوم ہو گیا۔'' وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی: ''میں دراصل آپ کو اسی مقصد کے تحت یہاں لائی تھی کہ اگر آپ اس بارے میں غور کریں اور کوئی قدم اٹھائیں تو میں بھی آپ کا ساتھ دوں اور اس موقع پر آپ کی معاون بن سکوں......!''

''لیکن مجھے یہ بتاؤ کہ چکر کیا ہے؟ یہ کس قسم کی بلائیں ہیں' جو اندھیرے میں شہر کا رخ کرتی ہیں اور جہاں روشنی دکھائی دے جائے' اسی مرکز پر حملہ آور ہوتی ہیں!''

''ابھی مجھے بھی اس بارے میں اتنی معلومات حاصل نہیں ہیں......'' اس نے بتایا: ''میں ایک دن اس شہر سے گزر رہی تھی' تو یہاں کے لوگوں کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ یہ سب کسی بڑی پریشانی کا شکار ہیں اور ان کی زندگیاں اجیرن ہو کر رہ گئی ہیں......اب آپ اتفاق سے میرے ساتھ تھے تو میں نے سوچا کہ آپ کے قیام کا بندوبست بھی یہیں کردوں۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کے ساتھ مل کر میں انہیں اس مصیبت سے نجات دلاسکوں......!''

''تم نے اس وقت خود اپنے طور پر اس معاملے کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی!''

''مجھے اس بارے میں قبل از وقت ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ میں کوئی کام کرسکوں گی یا نہیں......بہت کچھ میری دسترس میں ہوتا ہے اور بہت کچھ نہیں بھی......!''

''ہوں......اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے خود ہی اس بارے میں معلومات حاصل کرنا ہوں گی۔''

''آپ تنہا نہیں ہوں گے' میں بھی آپ کے ساتھ ساتھ رہوں گی۔'' صومانہ نے سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے......کیا تم ناشتہ کروگی......؟''

اس نے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا' پھر بولی: ''آپ ناشتہ وغیرہ کرلیں' پھر کل والا ادھورا کام بھی پورا کرنا ہے' میرا مطلب ہے کہ مارکیٹ بھی چلنا ہے......''

''اوہ ہاں......'' میں نے چونک کر کہا۔

پھر میں نے ناشتہ کیا اور صومانہ کی بات پر عمل کرنے کیلئے ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ اس کا کہنا ٹھیک ہی تھا' مجھے چند کپڑوں کی شدید ضرورت تھی......چنانچہ میں ایک بار پھر مارکیٹ میں داخل ہوگیا۔

اس وقت رونقیں اور شور شرابے اپنے عروج پر تھے' کون کہہ سکتا تھا کہ رات کے وقت اس شہر کا عالم کس بیابان اور ویران دشت کی مانند ہو جاتا ہوگا......جہاں اندھیرے اور سناٹے کا راج ہوتا ہے......

چند سوٹ وغیرہ خریدنے کے بعد میں دوبارہ ہوٹل کی طرف روانہ ہوگیا ہال سے گزرتے ہوئے ایک ویٹر میری طرف لپکا اور بولا:

''آپ کو منیجر صاحب یاد کررہے ہیں......''

''اچھا......'' میں نے سر ہلایا: ''میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں......''

''جی ٹھیک ہے......'' اس نے سر کو خم کیا۔

''اب میرا رخ اپنے کمرے کی طرف تھا'

صومانہ نے تمام سوٹوں میں سے ایک کا انتخاب کیا اور مجھ سے بولی:

''آپ نہا دھو کر یہ سوٹ پہن لیں' اچھا لگے گا...... پھر آپ جائیے گا منیجر کے پاس......!''

میں نے وہی سوٹ اٹھایا اور باتھ روم میں گھسا' پھر میں نے اطمینان سے غسل کیا اور لباس پہن کر باہر نکل آیا' صومانہ سامنے ہی موجود تھی' اس نے ستائشی نظروں سے مجھے دیکھا اور بولی:

''بہت خوب...... اب آپ ان بلاؤں کے متعلق معلومات حاصل کریں...... میں بھی آپ کے ساتھ ہوں۔''

میں نے منیجر کے کمرے کا رخ کیا' وہ مجھے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ ملاتے ہوئے بولا:

''تشریف رکھیں' کچھ قدرتی سی بات ہے کہ آپ کو دیکھ کر دل کو ایک عجیب سی طمانیت کا احساس ہوتا ہے...... میں کل رات میں بھی کافی دیر تک آپ کے بارے میں سوچتا رہا۔''

''شکریہ......'' میں مسکرایا' پھر میں اصل موضوع کی طرف آ گیا: ''اب مجھے ان بلاؤں کے بارے میں بتاؤ......!''

یہ سن کر منیجر نے اپنی میز کی دراز میں سے چند تصویریں نکال کر میری طرف بڑھا دیں' میں نے ان پر نظر ڈالی اور حیران رہ گیا...... ان تصویروں میں چمگادڑ کی مانند چھوٹے پرندے دکھائی دے رہے تھے' جو ایک غول کی شکل میں تھے......

''یہ ہے وہ عجیب وغریب مخلوق' جو ہمارے اس شہر کیلئے مصیبت بنی ہوئی ہے...... رات کے وقت شہر میں ان کا بسیرا ہو جاتا ہے اور پھر جہاں بھی انہیں روشنی کا دائرہ دکھائی دیتا ہے' یہ وہاں حملہ آور ہو جاتی ہیں اور چند لمحوں میں ہی انسانوں کو بھنبھوڑ کر انہیں کھا جاتی ہیں۔''

''اوہ......'' میرے منہ سے نکلا: ''دن کے وقت یہ کہاں ہوتی ہیں؟''

''یہ کسی کو معلوم نہیں ہو سکا' اس بارے میں کئی طرح سے سر توڑ کوششیں کی جا چکی ہیں' لیکن ان کا ٹھکانہ کبھی معلوم نہ ہو سکا...... آخر کار تھک ہار کر یہی فیصلہ کیا گیا کہ رات کے وقت پورے شہر کو سیل کر دیا جائے اور ہر قسم کی روشنیوں سے پرہیز کیا جائے...... اور اب تو یہاں کا بچہ بچہ اس صورتحال سے واقف ہے' اس لئے لوگوں کی عادت بن چکی ہے...... بس ایک مشینی زندگی ہے کہ رات کے نو بجتے ہی سب کو اپنے اپنے گھروں کا رخ کرنا ہے...... تا کہ اس اندھیرے کا حصہ بن سکیں' جو ہم پر مسلط ہے......!!

''کافی سنگین صورتحال ہے......'' میں نے تاسف سے سر ہلایا: ''واقعی اس شہر کے مکینوں کا ہی دل گردہ ہے کہ وہ اس مصیبت کو جھیل رہے ہیں......!''

''جی...... جی...... کیا کریں......! زندگی ہے' گزر ہی جائے گی......!''

''میں ایک تجربہ کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا: ''اور اس سلسلے میں مجھے شاید تمہاری مدد کی ضرورت پڑے۔''

''تجربہ......!!'' اس کے منہ سے نکلا: ''کیا تجربہ......؟''

''کوئی ایسا عمل کہ جس کے ذریعے یہ ان خونی پرندوں کا ٹھکانہ معلوم ہو سکے......''

''کیا بات کر رہے ہیں......!'' وہ دھیرے سے مسکرایا: ''اگر یہیں معلوم ہو جاتا' تو ان کے خاتمے کی کوئی صورت نکل سکتی تھی۔ لیکن ان کی رفتار اور پھر ہر طرف موجود ہونے والے اندھیرے کی وجہ سے یہ قطعی ناممکن ہے......!''

''ہوں......'' میں نے سر ہلا دیا' لیکن میں کسی سوچ میں ہی گم تھا' تھوڑی دیر بعد میں نے اس سے کہا: ''تم نے اپنا نام ابھی تک نہیں بتایا......!''

''میرا نام فہد ہے......!''

''ہاں......تو فہد...... میں شام کے وقت تم سے ملوں گا...... یاد رکھنا' یہ ملاقات بہت ضروری ہو گی......!''

''جی...... ٹھیک ہے......'' وہ حیران و پریشان سا تھا اور میری باتوں کا مقصد سمجھنے سے قاصر تھا...... وہ یقیناً یہ سوچ رہا ہوگا کہ میں بھلا اس سلسلے میں کیا کر پاؤں گا...... بر حال میں اس کے پاس سے اٹھ کر دوبارہ اپنے کمرے میں آ گیا' جہاں صومانہ موجود تھی میں نے اسے فہد سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کیا۔ میں اپنے ساتھ ایک تصویر بھی لایا تھا' صومانہ نے اسے غور دیکھا تھا۔

''اب تم اس سلسلے میں کیا کہتی ہو؟'' تھوڑی دیر بعد میں نے پوچھا۔

''آپ جو بھی قدم اٹھائیں گے' میں آپ کے ساتھ رہوں گی۔'' اس نے کہا: ''عقل و شعور میں انسان ہی دانا ہے اور میں عملی طور پر اپنی صلاحیتوں کا اظہار کر سکتی ہوں...... میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ اس معاملے میں نہ جانے کیوں مجھے کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی اور میں اپنے طور پر کوئی بھی قدم اٹھانے سے قاصر ہوں۔''

''اچھا......'' میں نے سر ہلایا اور سوچ میں ڈوب گیا' وہ غور سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر میں نے اس کی طرف دیکھا اور بولا:

''اس معاملے کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ اس مخلوق کی کمین گاہ کا پتہ لگایا جائے' پھر اس کے بعد ہی کوئی اور قدم اٹھایا جا سکتا ہے' لیکن یہی کام سب سے زیادہ مشکل ہے...... کیا کیا جائے......؟''

''میں اس سلسلے میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں آقا......'' صومانہ جلدی سے بولی: ''کیونکہ میں اندھیرے میں بھی بصیرت کی طاقت رکھتی ہوں اور آپ رفتار کی بھی پرواہ نہ کریں...... ان کا ٹھکانہ معلوم کرنا میرے لئے اس لحاظ سے آسان ہے' لیکن مسئلہ یہ ہے کہ انہیں شکار ملے گا' تب ہی وہ ادھر کا رخ کریں گی......''

''چلو تم نے اتنی امید تو دی ہے۔'' میں مسکرایا: ''فی الحال تو ہم رات جیسے ہی اندھیرے میں کھڑے تھے' لیکن تم نے روشنی کی ایک کرن دکھا دی......''

''روشنی کی کرن......!'' صومانہ چونکی: ''روشنی میں تو وہ مخلوق حملہ کرتی ہے۔''

''اوہ معاف کرنا......امید کی کرن......!'' میں جلدی سے بولا: ''میں نیجر فہد سے اس بارے میں رائے لیتا ہوں......دیکھتے ہیں کہ وہ کیا کہتا ہے۔''

اتفاق سے دوپہر کے کھانے کے سے پہلے فہد خود ہی میرے کمرے میں چلا آیا' اس کے ہونٹوں پر ایک اداس سی مسکراہٹ تھی۔ وہ میرے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا:

''میں کافی بے چینی محسوس کر رہا تھا' اسی لئے یونہی آپ کے پاس چلا آیا' کیا بتاؤں......بس ہر وقت رات کا ہی دھڑکا لگا رہتا ہے اور ایک میں ہی کیا' پورے شہر کے لوگوں کا یہی عالم ہے۔''

''واقعی...... یہ مسئلہ ہی ایسا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''آپ سے مل کر نہ جانے کیوں دل کو ایک حوصلہ سا ملتا ہے یا یوں کہنا چاہئے کہ دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے......''

''یہ تو بڑی اچھی بات ہے......اچھا اب مجھے ایک بات بتاؤ......!''

"جی...... پوچھیں......!!"

"کیا ایسا کچھ ہو سکتا ہے کہ وہ بلائیں کس جگہ پر آ جائیں' تاکہ کس طرح سے ان کا پیچھا کر سکے ان کے اڈے کے بارے میں معلوم کیا جا سکے وہ جہاں سے آتی ہیں' اس جگہ کا پتہ لگ سکے؟"

"یہی تو ناممکن ہے جناب......!" اس نے جواب دیا: "ایک دفعہ ایسا موقع ملا تھا اور ان کا تعاقب کرنے کی کوشش بھی کی گئی تھی' لیکن ان کی رفتار اتنی حیرت انگیز ہے کہ......!"

عین اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ منیجر نے میری طرف دیکھا اور میں نے آواز لگائی:

"کون ہے......؟"

"سر میں ویٹر ہوں' فہد صاحب سے ملنا ہے۔"

"اندر آ جاؤ......" میں نے کہا۔ فوراً ہی دروازہ کھلا اور مخصوص یونیفارم میں وہ شخص اندر داخل ہو گیا۔ فہد نے اسے دیکھتے ہی پوچھا:

"کیا ہوا شکیل......! کوئی مسئلہ ہے......؟"

"منیجر صاحب......! ٹی وی پر کسی شخص کی طرف سے اعلان ہو رہا ہے......!"

"کیا اعلان......؟"

"وہ کہہ رہا ہے کہ ان خونی پرندوں سے نجات حاصل کرنے کیلئے مجھ سے رابطہ کریں......!"

"اوہ...... کون ہے بھئی وہ......!" منیجر جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا' پھر مجھ سے بولا: "آپ بھی آئیں' دیکھتے ہیں۔"

ہم لوگ جلدی جلدی قدم اٹھاتے ہوئے ہال میں پہنچ گئے' جہاں ٹی وی پر ایک اناؤنسر بار بار کوئی اعلان کر رہی تھی:

"ناظرین......! توجہ فرمائیے......! پروفیسر زیڈ ایک گھنٹے بعد آپ لوگوں سے مخاطب ہوں گے۔ برائے مہربانی اپنے ٹی وی سیٹس آن رکھیں' پروفیسر زیڈ کا دعویٰ ہے کہ وہ اس شہر کو پھر سے خوشیوں کا گہوارہ بنا دیں گے اور آپ لوگوں کو ان خونی بلاؤں سے نجات دلائیں گے...... آپ لوگ انتظار کریں' وہ جلد ہی آپ لوگوں سے رابطہ کریں گے......!"

یہ اعلان بار بار دہرایا جا رہا تھا' ہر طرف ایک ہلچل سی مچ گئی' جن لوگوں میں مایوسی پھیل چکی تھی اور جن کے ذہنوں میں اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کا تصور بھی نہیں تھا' آج ان کے کانوں میں یہ جملے گویا شہد گھول رہے تھے...... اس اعلان نے ان میں ایک نئی زندگی پھونک دی تھی۔

اس بات کا کافی اثر ہوا' ہر کوئی اپنی گھڑیوں پر نظر ڈال رہا تھا اور اس اجنبی پروفیسر زیڈ کو دیکھنے کا خواہاں تھا...... میں نے فہد سے دریافت کیا تھا:

"یہ پروفیسر زیڈ صاحب کون ہیں بھئی......؟"

"معلوم نہیں جناب...... یہ نام صرف میرے لئے نہیں بلکہ شاید اس شہر کے تمام لوگوں کیلئے اجنبی ہے......"

"اوہ...... اچھا......!" میں نے کہا۔ "اب تو لازمی ہے کہ اس بندے کی گفتگو سنی جائے۔ آخر وہ کس طرح اتنا بڑا دعویٰ کر رہا ہے......!"

"ہو سکتا ہے کہ وہ خواہ مخواہ اپنی مشہوری کر رہا ہو۔" فہد نے خیال ظاہر کیا: "اب اس کی تقریر سنیں گے تو تب ہی حقیقت کا علم ہوگا......!"

میں نے سر ہلا دیا۔ پھر فہد کو نہ جانے کیا سوجھی کہ وہ مجھے اپنے کمرے میں لے آیا اور پھر اس نے کمرے میں موجود ٹی وی آن کر دیا:

"ہم لوگ یہاں پر بیٹھ کر آرام سے پروگرام دیکھیں گے...... میں چائے منگواتا ہوں......!"

اور پھر تھوڑی دیر بعد ہی چائے آ گئی۔ اسی دوران ٹی وی پر اناؤنسر بھی نمودار ہو گئی اور اپنے مخصوص انداز میں مسکرا کر بولی:

''انتظار کی گھڑیاں ختم ہونے والی ہیں۔ جلد ہی آپ کے سامنے وہ شخصیت نمودار ہونے والی ہے۔ جنہوں نے اپنے صرف چند ہی جملوں سے پورے شہر میں تہلکہ مچا دیا ہے...... اور ہمیں پورا یقین ہے کہ آپ لوگوں نے ان لمحات کا شدت سے انتظار کیا ہوگا...... اب صرف چند لمحے باقی ہیں...... لیجئے...... پروفیسر زیڈ سے ملاقات کیجئے......!''

ان الفاظ کے ساتھ ہی اسکرین تاریک ہوگئی۔ چند لمحے تک وہاں مکھیاں سی جھلملاتی رہیں اور پھر ایک منحنی سی شکل وصورت کا آدمی دکھائی دیا۔ وہ انتہائی دبلا پتلا اور کمزور سا دکھائی دے رہا تھا' اس کی آنکھیں گویا گڑھوں میں اتری ہوئی تھیں اور گال پچکے ہوئے تھے' لیکن اس کے باوجود اس کے چہرے پر ایک عجیب سی توانائی تھی...... آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی...... اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس کی آواز گونجی:

''اس شہر کے باسیوں......! پروفیسر زیڈ کا سلام قبول ہو۔ یہ سلام اس شہر کی خوش نصیبی اور خوشحالی کی نوید سنا رہا ہے' یہ سلام پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اے پریشان حال لوگوں...... پروفیسر زیڈ کا خیر مقدم کرو' کیونکہ وہ تمہیں اس ناگہانی مصیبت سے چھٹکارا دلوانے آیا ہے۔ جس میں اس وقت تم لوگ مبتلا ہو' میں اس شہر کا باسی نہیں ہوں...... اور میں سیاحت کی غرض سے یہاں آیا تھا...... اور جب مجھے تم لوگوں کی پریشانی کا علم ہوا تو میرا دل بھر آیا...... چنانچہ میں نے رات دن ایک کر دیئے اور اب ان آسمانی بلاؤں کا توڑ میرے پاس موجود ہے...... آج رات کو دس بجے میں ملونا پارک میں آپ لوگوں کو دعوت دے رہا ہوں اور یہ دعوت اس بات کی ہے کہ میں آپ لوگوں کے سامنے اپنے گرد روشنی کا حالہ بناؤں گا اور فوراً ہی وہ بلائیں مجھ پر حملہ کریں گی...... لیکن انجام کیا ہوگا......؟ یہ سب کچھ جاننے کیلئے آپ لوگ رات کے اندھیرے میں ضرور نکلیں اور ملونا پارک تشریف لائیں...... یاد رکھیں آج رات دس بجے...... سلام بخیر......!! آپ کا پروفیسر زیڈ۔

ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ شخص اسکرین سے غائب ہوگیا' میں نے فہد کی طرف سے سوالیہ نظروں سے دیکھا اور بولا:

''یہ کون ہے؟ کیا اس کے بارے میں معلومات ہوسکیں گی......!''

''ہاں...... میرا ایک دوست اعلیٰ افسران میں شامل ہے' اس سے معلوم ہوجائے گا...... میں خود بھی اس شخص سے ناواقف ہوں۔''

''اسے دیکھ کر میرے دل میں کچھ عجیب سا تاثر ابھرا ہے۔'' میں بڑبڑایا جسے فہد سن نہ سکا۔ پھر فہد نے کہا تھا:

''ابھی تو شہر میں کہرام مچا ہوگا...... لوگ دیوانے ہو رہے ہوں گے...... ہوسکتا ہے کہ یہ شخص واقعی کوئی کارنامہ انجام دے ڈالے...... آئیں باہر چل کر دیکھتے ہیں۔''

فہد کا خیال درست ثابت ہوا تھا' ہال اس وقت کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور چاروں طرف صرف اور صرف پروفیسر زیڈ ہی موضوع بنا ہوا تھا...... ہم دونوں نے پھر ہوٹل سے باہر کا رخ کیا تھا' یہاں بھی یہی عالم تھا:

''میں ملونا پارک جاؤں گا......'' فہد نے کہا: ''کیا آپ چلیں گے......؟''

''ہاں ضرور...... ذرا دیکھیں تو سہی کہ یہ شخص کیا کرتا ہے......!'' میں نے سر ہلایا۔

اب شہر میں مختلف قسم کی افواہیں گردش کر رہی تھیں' کوئی پروفیسر زیڈ کو جادوگر کہہ رہا تھا اور کوئی

خدائی فوجدار' کوئی تو ایسا بھی تھا جو خود کو پروفیسر زیڈ کا قریبی رشتے دار ثابت کرنے کے درپے تھا اور وہ اس کی تعریفوں میں زمین اور آسمان کے قلابے ملا رہا تھا' غرض کہ بھانت بھانت کی بولیاں تھیں' ذرا ہی سی دیر میں اس شخص سے اتنی شہرت حاصل کر لی تھی کہ بچے بچے کی زبان پر اسی کا نام تھا۔

اور پھر رات کو دس بجے سے پہلے ہی لوگ جوق در جوق ملونا پارک کیلئے روانہ ہو گئے' فہد کی اپنی گاڑی تھی' جس میں ہم روانہ ہوئے تھے۔ لیکن ملونا پارک تک پہنچنا کافی دشوار گزار ثابت ہو رہا تھا۔ کیونکہ لوگوں کا اور گاڑیوں کا اتنا ہجوم تھا کہ آمدو رفت ہی معطل ہو کر رہ گئی تھی اور مزے کی بات یہ تھی کہ تمام راستہ بھی گھپ اندھیرے میں طے کرنا پڑا تھا۔ بہر حال بڑی مشکلوں سے آخر کار ملونا پارک میں داخلہ ممکن ہوا' فہد نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا تھا' تاکہ اندھیرے اور رش میں الگ ہو جانے کا خدشہ نہ رہے۔ اس وقت میں نے اپنی چند روحانی قوتوں کا استعمال کرنا مناسب خیال کیا اور اب مجھے اس اندھیرے میں بھی کافی واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا اور پھر میں فہد کے ساتھ جلد ہی اس پارک کے عین سرے پر جا پہنچا۔ جہاں ایک چھوٹا سا کیمپ لگا ہوا تھا اور یقیناً اس کیمپ کے اندر پروفیسر زیڈ موجود تھا۔ خود فہد کو حیرت تھی کہ اتنے رش میں' ہم لوگ کس طرح آسانی سے اس جگہ آ پہنچے تھے' میں نے اس کی باتوں کو قطعاً نظر انداز کر دیا۔

اور پھر ٹھیک دس بجے اس کیمپ کے اندر سے پروفیسر زیڈ برآمد ہوا' تھوڑی دیر پہلے تک چاروں طرف بھانت بھانت کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ لیکن پروفیسر کے سامنے آتے ہی چاروں طرف موت کا سناٹا طاری ہو گیا۔ پروفیسر نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور اپنی مخصوص بھرائی ہوئی آواز میں بولا:

''آپ لوگ اپنے وعدے کے پابند رہے۔ اب میں بھی اپنا وعدہ پورا کر رہا ہوں۔ جو کچھ رونما ہوگا' اگر اس کا انجام پسند آئے تو کل شام کو سرکس گراؤنڈ میں مجھ سے ضرور رابطہ کیجئے گا......'' یہ کہہ کر وہ دوبارہ کیمپ کے اندر چلا گیا' چند ہی لمحوں بعد اس کی واپسی ہوئی تو اس کے ہاتھوں میں کوئی ڈبہ سا دکھائی دے رہا تھا' وہ پھر بولا:

''اب میں روشنی کرنے والا ہوں' جن لوگوں کے دل بہت زیادہ کمزور ہیں' برائے مہربانی وہ یہاں سے چلے جائیں' انہیں شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے...... آپ کے جذبات آپ کو یہاں لے آئے ہیں' لیکن مجھے آپ کا بھی پورا پورا خیال ہے۔''

میں نے محسوس کیا کہ یہ بات سنتے ہی بہت سے لوگ پیچھے ہٹ گئے تھے...... بہر حال یہ صورتحال بڑی دلچسپی تھی' نہ جانے اب کیا ہونے والا تھا۔ دفعتاً مجھے صومانہ کا خیال آیا' میں نے سرگوشی میں اسے آواز دی:

''صومانہ......!''

''جی آقا......! میں بھی آپ کے ساتھ ہوں۔'' اس کی سرگوشی میرے کان میں ہی اتر گئی۔ میں نے ایک طویل سانس لی اور خاموشی اختیار کر لی۔

سب ہی کی نظریں پروفیسر زیڈ پر جمی تھی' اچانک ہی اس کے گرد ایک تیز روشنی کا ہالہ بن گیا۔ سارے ہی دم بخود تھے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر یہ منظر دیکھ رہے تھے اور پھر واقعی لوگوں کی چیخیں نکل گئیں' کیونکہ تھوڑی دیر بعد ہی وہی پرندے پروفیسر زیڈ کے گرد منڈلانے لگے' جن کو میں نے تصویروں میں دیکھا تھا۔ یہ چمگادڑوں سے ملتے جلتے تھے اور

ان کی رنگت بھی سیاہی مائل تھی...... وہ نمودار ہوتے ہی پروفیسر زیڈ کی طرف لپکے تھے' لیکن پھر اس پر جھپٹنے کی بجائے وہ بھڑک کر پیچھے ہٹے اور چند منٹوں تک اس کے گرد منڈلانے کے بعد غائب ہو گئے' پروفیسر زیڈ کسی بت کی طرح ساکت کھڑا ہوا تھا۔ خونی پرندے اب غائب ہو چکے تھے' اسی وقت مجھے صومانہ کی بات یاد آئی اور میں نے اسے آواز دی۔ لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔

''پتا نہیں کہاں چلی گئی'' میں نے دل میں سوچا: ''ان پرندوں کا ٹھکانہ معلوم کرنے کا یہ بہترین موقع تھا۔''

بہرحال اب میں دوبارہ پروفیسر زیڈ کی طرف متوجہ ہو گیا' جو ایک بار پھر حیرت میں ڈوبے ہوئے لوگوں سے مخاطب ہو رہا تھا:

''دیکھا تم نے میرے دوستوں......! میرے مہربانوں......! ان خونی پرندوں نے مجھے چھوا تک نہیں' بلکہ بھڑک کر بھاگ کھڑے ہوئے...... ان کا انجام تمہارے سامنے ہے اور میں نے یہ سب کچھ اس لئے کیا ہے کہ زبانی جمع خرچ سے کوئی بھی متاثر نہیں ہوتا۔ اگر سب کے سامنے عملی طور پر کوئی بات پیش کی جائے تو اس کی قدر و قیمت ہی الگ ہوتی ہے...... اب میں جا رہا ہوں...... آپ لوگ بھی اپنے گھروں کو لوٹ جائیں اور کل سرکس گراؤنڈ میں آ کر مجھ سے ملاقات کریں' شب بخیر......!''

یہ کہہ کر پروفیسر زیڈ دوبارہ خیمے میں داخل ہو گیا...... اسی وقت کسی جوشیلے نے پروفیسر زیڈ کے حق میں نعرہ بلند کر دیا' بس پھر کیا تھا' کانوں میں گویا دھماکے ہونے لگے...... اس وقت فہد نے مجھے واپس چلنے کا اشارہ کیا۔

ادھر ہم لوگ وہاں سے نکل آئے' واپسی میں بھی کافی دیر لگی تھی۔ ہوٹل میں داخل ہونے کے بعد فہد نے مجھے میرے کمرے تک رخصت کیا تھا اور بولا:

''اب تھکن بھی کافی ہو گئی ہے' آپ بھی آرام کریں...... پھر صبح ملاقات کرتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے فہد......!'' میں نے جواب دیا: ''یوں بھی اب ہم لوگ اندھیرے کے قیدی ہیں۔''

فہد نے سر ہلایا اور چلا گیا۔ میں نے کپڑے تبدیل کیئے اور پھر بستر پر دراز ہو گیا' میں نے ایک بار پھر صومانہ کو آوازیں دیں لیکن جواب نہ دیا...... پھر میں سونے کی کوشش کرنے لگا اور جلد ہی نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

صبح مجھے اٹھانے والی خود صومانہ ہی تھی' اس کا چہرہ کافی دمک رہا تھا' وہ فوراً ہی بولی:

''مجھے رات میں کافی دیر ہو گئی اور جب میں واپس آئی تو آپ سو چکے تھے آقا......! اس لئے میں نے آپ کو جگانا مناسب نہیں سمجھا......!''

''تم کہاں چلی گئی تھیں......؟'' میں نے بستر سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

''ان خونی بلاؤں کے تعاقب میں۔'' اس نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا: ''میں ان کا ٹھکانہ دیکھ آئی ہوں آقا......!!''

☆......☆......☆

جو کچھ مجھے صومانہ کے ذریعے معلوم ہوا تھا۔ اس کی روشنی میں مجھے مددگاروں کی ضرورت تھی اور اس کیلئے میرا فہد سے ملنا بہت ضروری تھا' لیکن اس سے قبل میں پروفیسر زیڈ کی حکمت عملی کے بارے میں جاننا چاہتا تھا...... کہ وہ کس طریقے سے اس شہر کے لوگوں کو بچاؤ کا راستہ دکھاتا ہے۔

چنانچہ میں شام کا انتظار کرنے لگا۔ آج میں خود ہی پروفیسر زیڈ کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچنا چاہتا تھا۔ چنانچہ شام کے وقت میں خود بھی سرکس گراؤنڈ

کیلئے نکل کھڑا ہوا۔ یہ واقعی اس شہر کا ایک وسیع میدان تھا' جہاں شاید بڑے ٹورنامنٹ وغیرہ منعقد ہوتے تھے...... لیکن یہ گراؤنڈ اتنا وسیع اور کشادہ ہونے کے باوجود بھی عام لوگوں سے اس طرح بھرا ہوا تھا کہ تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی' یہاں بھی پروفیسر زیڈ نے اپنا کیمپ لگایا ہوا تھا اور باری باری سے لوگ اس خیمے میں داخل ہو رہے تھے۔

یہاں بھی ضرورت کے تحت میں نے اپنی مہارت آزمائی اور جلد ہی میں بھی اس جگہ کھڑا ہوا تھا کہ اندر سے آنے والے شخص کے بعد میری باری تھی' تھوڑی دیر بعد ہی اندر والا شخص باہر نکلا اور میں جھپاک سے کیمپ میں گھس گیا۔

یہاں ایک میز کے گرد چند کرسیاں رکھی ہوئی تھیں' سامنے ہی پروفیسر زیڈ خود بھی ایک کرسی پر براجمان تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کے باریک سے ہونٹ حرکت میں آئے۔

''نام......!''

''سلمان احمد......!'' میں نے جواب دیا۔

''ہوں......'' اس نے ہنکارا بھرا: ''کیا تمہیں روشنیاں پسند ہیں......؟ یا اندھیرے کے حامی ہو......؟''

''میں ہر طرح سے گزارا کر لیتا ہوں۔'' میرا جواب تھا۔

''تو پھر میرے پاس کیوں آئے ہو......!'' اس نے اندر دھنسی ہوئی آنکھوں سے مجھے گھورا۔

''ملاقات کا متمنی تھا......سو ہو گئی......''

''بہت خوب......'' اس نے سر ہلایا' ایک عجیب سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر نمودار ہو گئی تھی' پھر یہ مسکراہٹ فوراً ہی معدوم ہو گئی اور وہ بولا۔

''یہ لو...... یہ اپنے پاس رکھ لو' یہ تمہیں ان بلاؤں سے محفوظ رکھے گا...... جب پورا شہر اس آفت سے محفوظ ہو جائے گا تو میں اس شہر کے لوگوں سے خطاب کروں گا......اور پھر میں جو بھی کہوں گا وہ میرا حکم ہو گا......اور میرا حکم ماننے والے اسی طرح فائدے میں رہیں گے کہ جس طرح میں ابھی سب کو فائدہ پہنچا رہا ہوں......بس اب جاؤ......!''

یہ کہہ کر اس نے ایک مربع نما چھوٹے سے کاغذ کی بنی ہوئی ٹکیہ میرے حوالے کر دی...... میں نے اسے مٹھی میں دبایا اور باہر نکل گیا' جہاں اگلا خواہش مند میرے باہر نکلنے کا منتظر تھا۔

میں اب وہاں رکا نہیں تھا' فوراً ہی میں نے ایک ٹیکسی پکڑی اور اپنے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا' راستے میں میں نے صومانہ سے دبے لہجے میں کہا۔

''یہ چکر کیا ہے صومانہ......! اگر اس بڑیا کے نتائج حیرت انگیز نکلے تو پوری قوم اس شخص کی گرویدہ ہو جائے گی...... پاگل ہو جائیں گے لوگ اس کے پیچھے......!''

''آپ کا خیال بالکل درست ہے۔'' وہ بولی۔ ''اس شخص نے اگر ان پرندوں کا توڑ نکال لیا ہے' تو اب یہ ضرور اپنی محنت وصول کرے گا......نہ جانے اس کے کیا ارادے ہیں......!''

''میرے خیال میں ان پرندوں کا خاتمہ ضروری ہے تاکہ پروفیسر زیڈ کا حربہ ناکام ہو جائے' مجھے یہ شخص ایک آنکھ بھی نہیں بھایا ہے......''

''کیا آپ نے مجھ سے کچھ کہا......؟'' اچانک ہی ڈرائیور مجھ سے مخاطب ہوا' بے خیالی میں میری آواز بلند ہو گئی تھی۔

''نن......نہیں......'' میں گڑبڑا گیا: ''میں نے تم سے تو کچھ نہیں کہا۔''

''اوہ اچھا......اچھا......'' ڈرائیور نے یوں سر ہلایا جیسے وہ کچھ سمجھ گیا ہو۔ ''میرا ایک چچازاد بھائی ہے' اسے بھی اپنے آپ سے باتیں کرنے کی عادت

ہے......ہاں......!!“

جواباً میں نے اسے گھور کر دیکھا' بولتا کیا......؟ صومانہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ پھر میں نے راستے بھر خاموش ہی رہنا مناسب سمجھا...... صومانہ بار بار مجھے چھیڑتی رہی۔

ہوٹل میں آنے کے بعد میں نے فوری طور پر فہد سے رابطہ کیا' اس نے مجھے اطلاع بھجوائی کہ وہ میرے کمرے میں ہی آ رہا ہے...... چنانچہ میں نے اپنے کمرے کا رخ کیا' تھوڑی دیر بعد ہی فہد میرے پاس آ پہنچا:

”آپ کو معلوم ہے...... پورے شہر کو پروفیسر زیڈ نے دیوانہ بنایا ہوا ہے......“

”میں خود بھی ان ہی دیوانوں کی لسٹ میں شامل ہوں......“ میں نے مسکرا کر کہا اور اپنی مٹھی کھول دی' جس میں پروفیسر کا دیا ہوا ”تحفہ“ موجود تھا۔

”ارے......!!“ آپ تو کافی تیز رفتار انسان نکلے......!“ وہ حیرت سے بولا: ”حالانکہ میں خود بھی وہاں پہنچا تھا' لیکن لوگوں کی قطاروں نے واپس آنے پر مجبور کر دیا۔“

”میں نے اس وقت تمہیں ایک ضروری کام کے سلسلے میں بلایا ہے۔“ میں اصل موضوع کی طرف آ گیا۔

”جی...... بولیں......!!“

”ان خونی پرندوں کا ٹھکانہ معلوم ہو چکا ہے۔“ میں نے انکشاف کیا۔

”جی......!! کیا مطلب ہے......؟!“ وہ اچھل پڑا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا۔

”ہاں...... میں ٹھیک کہہ رہا ہوں...... ان پرندوں نے ملوتا پارک سے نکلنے کے بعد شہر کی حدود کے پاس موجود ایک پرانی حویلی کا رخ کیا ہے...... اب تمہیں یہ معلوم ہوگا کہ پرانی حویلی کہاں واقع ہے......!“

”پرانی حویلی......!“ وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں بولا: ”وہ حویلی تو کئی سالوں سے اجاڑ پڑی ہوئی ہے اور وہ آسیب زدہ ہے' اسی لئے لوگ اس کا بھول کر بھی رخ نہیں کرتے......“

”اب یہاں آسیب ہو یا بھوت پریت......“ میں نے جواب دیا: ”لیکن یہ بات حتمی ہے کہ وہ پرندے ادھر ہی پہنچے ہیں۔“

”لیکن یہ بات آپ کو کیسے معلوم ہوئی......“ اس کے لہجے میں حیرت تھی: ”ایک تو یہ ہے بھی مشکل کام اور دوسری بات یہ ہے کہ آپ تو اس وقت میرے ساتھ تھے......؟“

وہ بال کی کھال اتارنے کے چکر میں تھا' چنانچہ میں نے ذرا لہجے کو بدلا اور بولا:

”یہ بتاؤ کہ کیا تم اپنے شہر کو نجات دلانا چاہتے ہو......؟“

”آں...... ہاں......!“ وہ بے ساختہ بولا۔

”بس تو پھر جو میں کہہ رہا ہوں' اس پر غور دو...... تم جو پوچھ رہے ہو یہ سب بعد کیلئے اٹھا رکھو...... کیونکہ پروفیسر زیڈ نے ان پرندوں کا توڑ ضرور نکال لیا ہے' لیکن میرا خیال ہے کہ اس حربے کے پیچھے اس کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہے...... یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی اس صلاحیت کے ذریعے پورے شہر پہ ہی قابض ہو جائے اور اپنی حق اور ناحق خواہشوں اور ارادوں کو پورا کرے...... اس معاملے میں ہم ابھی اندھیرے میں ہیں' لیکن مجھے اس بارے میں بھی اندازہ ہو رہا ہے...... باقی تم خود ہی فیصلہ کر لو...... میں تو چلا جاؤں گا' لیکن یہ تمہارا شہر ہے اور اس کی اچھائی اور برائی میں تم بھی ملوث ہوگے......“

(اس دلچسپ داستان کے بقایا واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ کیجئے)

ٹوبہ ٹیک سنگھ سے ارسال کردہ انہونی تحریر

ہم شکل

اس کی بیٹی بہت بدشکل تھی مگر باپ اس کو یقین دلاتا رہتا تھا کہ وہ گڑیا کی طرح حسین ہے اور پھر ایک دن وہ بیٹی کے لیے ہم شکل گڑیا لے ہی آیا......

غلام مرتضیٰ علوی

پھولوں جیسی پیاری بیٹی کی فرمائش آج بھی پوری ہوتی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اِس وجہ سے باپ کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ صبح کے وقت جب وہ روزگار کے سلسلے میں گھر سے جاتا تھا اِس وقت اِس کا سامنا اپنی بیٹی سے نہ ہو۔ وہ چپکے چپکے گھر سے نکل جاتا تھا۔ بات دراصل یہ تھی کہ کچھ دن ہوئے اِس نے اپنی لاڈلی بیٹی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اِس کے لیے ایک پیاری سی گڑیا خرید کر لائے گا جو کہ اس کی طرح ہی خوبصورت ہوگی۔

تب معصوم لڑکی نے پوچھا۔

''ابو کیا میں بہت خوب صورت ہوں۔'' تب اس نے جواب دیتے ہوئے کہا تھا۔

''ہاں بیٹا تم بہت خوب صورت ہو۔''

درحقیقت یہ بالکل جھوٹ تھا جو باپ نے اپنی لاڈلی بیٹی سے بولا تھا۔ اِس کی لڑکی خاصی بدصورت تھی۔ آنکھیں بہت چھوٹی چھوٹی ناک پکوڑے کی طرح پھیلی ہوئی ہونٹ موٹے اور ٹھوڑی ٹیڑھی میڑھی سی' ماں باپ کا خیال تھا ہو سکتا ہے کہ لڑکی کی عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ اِس کی بدصورتی ختم ہو جائے مگر معاملہ اس کے اُلٹ ہوا۔ لڑکی کی عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ اب اِس کا رنگ بھی کالا ہوتا چلا جا رہا تھا۔ لڑکی کے باپ نے اپنی بیوی کو سمجھا دیا تھا کہ وہ پوری کوشش کرے کہ گھر میں لڑکی کو کبھی بھی اپنی بدصورتی کا احساس نہ ہو۔

روزگار کا سلسلہ بھی آج کل بدقسمتی سے مندا میں جا رہا تھا۔ اس کی فیکٹری کے مالک نے بجلی گیس کی لوڈشیڈنگ سے فیکٹری کو ہونے والے نقصان کی وجہ سے پر بہت سارے ورکرز اور کچھ انجینئرز کو نکال دیا تھا۔ کیونکہ فیکٹری بہت تھوڑا وقت چلتی' زیادہ وقت بند ہی رہتی تھی۔ ان حالات کی وجہ سے وہ پکی نوکری ختم ہونے پر بہت پریشان تھا اور اب وہ بھی ڈیلی مزدوروں کی طرح کبھی کسی جگہ دیہاڑی پر مزدوری کرتا' کبھی کسی جگہ' ان مشکل حالات میں اِن کی چھ سالہ اکلوتی بچی نے اِس سے اپنی زندگی کی پہلی فرمائش کر دی۔

لڑکی دراصل محلے میں کسی کے پاس خوب

صورت گڑیا دیکھ آئی تھی اور اب اِس نے اِس جیسی گڑیا کی فرمائش اپنے ابو سے کردی تھی۔ بدھ والے دن تو لڑکی ایک بات سے وہ دہل گیا۔ جب لڑکی نے اِس سے یہ پوچھا۔

''ابو آپ کو میں نے اپنے جیسی گڑیا لانے کے لیے کہا ہوا ہے؟ تو کیا میں خوبصورت ہوں؟'' کیا لڑکی کو یہ احساس ہوگیا تھا کہ وہ بہت بدصورت ہے؟

اس دن کے بعد سے وہ ہر روز صبح ہی صبح کام پر نکل جاتا (جب لڑکی سوئی ہوئی ہوتی) اور واپسی پر بھی وہ بہت لیٹ آتا تاکہ لڑکی کے سوالات سے بچ سکے۔

ہفتے والے دن وہ خاصا پُرجوش تھا کیونکہ آج کل وہ جس جگہ مزدوری کررہا تھا وہ چونکہ ہفتہ وار اکٹھی مزدوری دیتے تھے تو آج اِس کو مزدوری ملنی تھی۔ شام کے وقت جب اِس کو روپے ملے تو خوشی کے مارے اِس کے ہاتھ کانپ رہے تھے مزدوری پکڑتے ہوئے روپے جیب میں ڈال کر وہ جلدی سے بازار کی جانب روانہ ہوگیا۔

آج اس کا دل خوشی کے مارے اچھل رہا تھا کہ وہ بیٹی کی دو ہفتے پرانی فرمائش پوری کرنے جارہا ہے۔ بازار میں داخل ہوتے ہی وہ کھلونوں کی دکان کی طرف تیزی سے چلا۔ دکان میں داخل ہوکر اِس نے کتنی ہی قسم کی گڑیا دیکھیں۔ بے شمار گڑیاؤں میں سے اِس کو ایک گڑیا پسند آئی جو کہ خوب صورت بھی تھی اور مناسب قیمت پر بھی مل رہی تھی۔ ورنہ گڑیا کی قیمتیں تو دس ہزار تک بھی تھیں۔

مگر اِس نے اپنے بجٹ کے حساب سے



900 روپے کی گڑیا خرید لی۔ گڑیا والا شاپر وہ بڑے احتیاط سے پکڑے بازار میں دوسری خریداری میں مصروف ہوگیا۔ جب سب شاپنگ مکمل ہوگئی تو اس نے بازار کی نکڑ سے کپڑے کا ایک تھیلا لیا جس میں آٹا' دال' سبزی والے شاپر رکھ کر ان کے اوپر گڑیا والا شاپر رکھ کر کپڑے والا تھیلے کو احتیاط سے زپ لگا کر بند کر دیا اور تھیلا اپنے کندھے پر رکھ کر بس اسٹاپ کی جانب روانہ ہوگیا۔ اس کے محلے کی طرف جانے والی بس آئی تو وہ بھری ہوئی تھی۔ بڑی مشکل سے اِس کو کھڑا ہونے کو جگہ ملی۔ جب وہ اپنے محلے کے اسٹاپ سے دو اسٹاپ دور تھا تو بس مسافروں کو اتارنے کے لیے اچانک رکی۔

زوردار بریک لگنے سے سب لوگوں کو دھکا لگا تو گڑیا والا تھیلا اس کے ایک ہاتھ سے چھوٹ گیا اور دروازے کے قریب جا گرا۔ اس اسٹاپ پر اترنے کے لیے بے تاب لوگ اِس کے تھیلے کو روند کر بس سے اترنے لگے۔ وہ بے قراری سے دروازے کی جانب بھاگا جب تھیلا اس کے ہاتھ آیا تو کئی لوگ اِس کو روند چکے تھے۔ تھیلا پکڑ کر وہ دروازے میں ہی کھڑا ہوگیا۔ اب اِس کو یہ سوچ کر چین نہیں آرہا تھا کہ کیا اِس تھیلے میں (جو کہ کپڑے کا ہونے کی وجہ سے پھٹا تو نہ تھا پر مسل گیا تھا) گھر کی چیزیں اور میری دو ہفتوں کی محنت میری بچی کی گڑیا سلامت ہوگی؟ جلد ہی اِس کا اسٹاپ آگیا وہ بس سے اترا اور جلدی جلدی قدم اٹھاتا گھر کی جانب چلا۔

اِس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ تھیلا سڑک پر ہی کھول لیتا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی وہ پکارنے لگا۔

''بیٹی بیٹی دیکھو میں گڑیا لے آیا ہوں۔'' لڑکی چھت پر تھی وہ اور اس کی ماں لپک کر آئیں۔ لڑکی اور اس کی ماں نے تھیلا کھولا' مگر یہ کیا؟

تھیلے میں چاول اور آٹے کے لفافے پھٹ کر آپس میں مکس ہوگئے تھے۔ آٹا اور چاول' سبزی اور پھلوں کے لوگوں کے دباؤ سے کئی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے شاپروں میں ہی ہوگئے تھے۔

دھڑکتے دل کے ساتھ باپ نے گڑیا والا پلاسٹک کا لفافہ کھولا تو......

ایک لمحے کے لیے جیسے باپ کی دل کی دھڑکن ہی رک گئی ہو۔

گڑیا بھی دباؤ تلے آکر کچلی جا چکی تھی۔ اِس کا منہ ٹیڑھا اور ناک پکوڑے کی طرح پھیل چکی تھی۔ آنکھیں اندر کو دھنس چکی تھیں۔ ہفتوں کی محنت کا حال اِس کے سامنے تھا۔

غریب باپ بھاری دل اور نم آنکھوں کے ساتھ گڑیا پکڑے کھڑا تھا کہ اچانک اِس کی لڑکی ہنسی اور کہنے لگی۔

''ابو ابو آپ تو کہتے تھے کہ ایک خوب صورت گڑیا لائیں گے۔ یہ گڑیا تو بالکل میری جیسی ہے ٹیڑھی بدشکل' جس کی ناک بھی میرے جیسی پھیلی ہوئی ہے اور ہونٹ بھی موٹے......''

لڑکی پھر سے بولی۔

''ابو مجھے تو پتا تھا کہ میں خوب صورت نہیں ہوں۔ پھر بھلا میرے جیسی گڑیا جو ہوگی وہ بھلا خوب صورت کیسے ہوسکتی ہے۔ ابو آپ بالکل ٹھیک گڑیا لائے ہیں جو بالکل میرے جیسی ٹیڑھی' بھدری' موٹے ناک و ہونٹ والی بدشکل ہے۔''

بچی یہ کہہ کر گڑیا اپنے باپ کے ہاتھ سے پکڑ کر روتی ہوئی اپنے کمرے کی جانب بھاگ گئی۔ اسی لمحے غریب اور مجبور باپ کی آنکھوں سے کچھ آنسو نکلے اور زمین پر گر کر جذب ہوگئے۔

☆☆......☆☆

ڈسکہ سے ارسال کردہ تحریر

کھوٹہ سکہ

تین بیٹوں کی ماں ہونے کے باوجود وہ دکھ اٹھارہی

تھی،بوجھ بنی ہوئی تھی،ترستی نگاہوں سے بیٹوں کو تکا کرتی......

راکن ولسن

سردار اور اس کی بیگم حمیدہ گہری سوچ و بچار میں تھے کہ اُدھر سے شہباز آ گیا۔ اور آتے ہی لاپرواہی سے بولا۔

''کیا بات ہے......خیر تو ہے ابا......حقے کا کش لگا کر کہیں کھو جاتے ہو۔''

''بیٹا بیٹھو آپ کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا کہ وقت بہت تبدیل ہو چکا ہے آپ ہو کہ آپ کو کچھ سمجھ ہی نہیں آتی۔''

''اچھا بھلا پڑھتے تھے مگر آج کل بس یار دوستوں کے ساتھ پھرتے رہتے ہو،بیٹا کوئی نوکری وغیرہ ڈھونڈو۔''

''اس طرح کیسے کام چلے گا اپنی آنے والی زندگی کے بارے میں سوچ کوئی دو وقت کی روٹی نہیں دے تمہیں،اور تم ہو کہ کچھ سمجھ نہیں پا رہے۔''

''تمہارے دوسرے دونوں بھائی بھی تو ہیں جو دن رات محنت کرتے ہیں انہیں اپنی اور گھر کی کتنی فکر ہے ایک تم ہو کہ ہوش ہی نہیں کہ وقت کتنی تیزی کے ساتھ گزر رہا ہے۔''

''شہباز کے ابا آپ فکر نہ کریں سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' حمیدہ بولی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ باپ بیٹا آمنے سامنے آئیں یوں بحث کسی نتیجے پر پہنچنے سے قبل ہی ختم ہو گئی۔

☆......☆......☆

''شہباز کے ابا میں نے آپ کو بتانا تھا کہ کل ماسی بشیراں آئی تھی۔'' حمیدہ بولی۔

''بشیراں......کون سی بشیراں؟''

''ارے وہی رشتے کروانے والی......!''

''اوہ......اچھا......تو کیا کہتی تھی؟''

''وہ بتا رہی تھی کہ ہمارے بڑے بیٹے رقیب کے لیے ایک بہت اچھی لڑکی کا رشتہ ہے......اور وہ اُن لوگوں کو لے کر آنا چاہتی ہے۔''

''اچھا تو تم نے کیا کہا اُس کو......؟'' سردار نے حقے کا کش لیتے ہوئے جواب دیا۔

''ارے بھئی کہنا کیا تھا میں نے اسے بول دیا تھا کہ تم آج ہی اُن لوگوں کو ساتھ لے کر آ جاؤ۔''

''تو وہ لوگ آج پچھلے پہر آ رہے ہیں اسی لیے

آپ کو بتایا ہے کہ باہر دوستوں میں جاکر نہ بیٹھ جانا اور تب تک رقیب بھی خیر سے گھر آجائے گا۔"

"اری نیک بخت میں نے کہاں جانا ہے۔ تم فکر نہ کرو...... خدا نے چاہا تو ہمارا رقیب بیٹا اُن کو ضرور پسند آئے گا۔"

☆......☆......☆

پچھلے پہر ماسی بشیراں لڑکی ماں اور باپ کو لے کر آگئی۔ رقیب گھر آچکا تھا۔ سردار اور حمیدہ کی خوش مزاجی اور شرافت کے وہ پہلے ہی ماسی سے سن کر معترف ہوچکے تھے۔ رقیب کو دیکھتے ہی وہ رضامند ہوگئے۔ وہ لوگ شادی جلد از جلد کرنا چاہتے تھے۔

اُن کا موقف تھا کہ جوان بیٹی ہے اس لیے وہ زیادہ لمبا انتظار نہیں کرنا چاہتے۔

حمیدہ نے انہیں بتایا کہ وہ لوگ بھی زیادہ دیر نہیں کریں گے بس دوسرے بیٹے ساجد کا رشتہ دیکھ کر دونوں بیٹوں کی ایک ساتھ شادی کرنا چاہتے ہیں۔

ماسی بشیراں نے حامی بھری کہ وہ جلد ساجد کا رشتہ بھی دکھا دے گی۔ اس طرح رقیب اور شازیہ کا رشتہ طے ہوگیا۔

اگلے روز حمیدہ اور سردار جاکر شازیہ کو پسند کر آئے تھے۔

شام کو شہباز حسب معمول آوارہ گردی کرتا واپس آیا تو باپ نے پاس بلایا اور بتایا۔

"تمہارے بڑے بھائی کا رشتہ طے ہوگیا ہے۔ یہ لو مٹھائی کھاؤ۔" تو اس نے برفی کا ٹکڑا اٹھایا اور اندر چلا گیا۔ اور یہ تک نہ پوچھا کہ کہاں ہوا ہے...... کس



کے ساتھ ہوا ہے۔

رقیب نے ماں سے کہا۔

''دیکھ اماں...... آج یہ اس طرح کررہا ہے کل کلاں کو اس کے کاموں میں ہم بھی دخل اندازی نہ کریں گے۔ اکیلا کرتا پھرے یہ اپنا کام......''

سردار نے تینوں بیٹوں کو حکم دیا کہ برابر برابر رقم کا بندوبست کرو سب لوگ مل کر کام کریں گے تب ہی شادی ہوگی۔ وگرنہ اکیلا کوئی بھی کامیاب نہیں ہوسکے گا۔ ساجد اور رقیب دونوں کام کررہے تھے جبکہ شہباز کو سب کھوٹا سکہ ہی سمجھتے تھے۔

☆......☆......☆

ماں باپ بھائیوں نے لاکھ سمجھایا مگر شہباز نہ سمجھ سکا۔ آخر وقت آگیا۔ رقیب کی شازیہ اور ساجد کی سمیرا کے ساتھ شادی ہوگئی۔ گھر میں رونق ہوگئی دن رات اچھے گزررہے تھے۔

سردار زیادہ تر وقت گھر کے ایک کونے میں بیٹھ کر حقہ پینے میں گزارتا۔ جبکہ حمیدہ گھر کے چھوٹے موٹے کاموں میں وقت گزار رہی تھی۔ شہباز اپنی مرضی سے جاتا اپنی مرضی سے گھر لوٹ آتا اب حمیدہ کے سوا کوئی بھی اسے روکتا نہ تھا۔

ایک رات وہ لیٹ گھر لوٹا اور اماں کو آواز دی۔

''مجھے بھوک لگی ہے جلدی کھانا دو۔'' ماں نے اُسے کہا۔

''بیٹا اپنی بھابی سے کہہ دو میری طبیعت ٹھیک نہیں۔'' یہ بات سنتے ہی وہ بھابی کے کمرے کی جانب بڑھا تو دروازے پر پہنچا تو سنا۔ بھابی شازیہ بھائی سے بول رہی تھیں۔

''آگیا آپ کا نکما بھائی کام کا نہ کاج کا...... دشمن اناج کا' میں کہتی ہوں کب تک یہ آپ کے ٹکڑوں پر پلتا رہے گا۔ اس کو کب تک ہم پکا پکا کر کھلائیں گے۔ بھئی مجھے تو معاف ہی رکھیں اور علیحدہ گھر لے کر دیں میں نہیں مفت کی روٹیاں کھلا سکتی کسی کو......'' شہباز نے یہ سب سنا تو بنا دستک دیے اپنے کمرے کی جانب چلا گیا۔

اِس کو آج بہت کچھ سمجھ آچکا تھا اور آج رات اُس نے ایک بہت بڑا فیصلہ کرلیا تھا۔

☆......☆......☆

صبح وہ بنا کسی کو بتائے گھر چھوڑ کر نامعلوم منزل کی طرف نکل کھڑا ہوا۔

سب نے اس بات کو ایزی لیا کہ خود ہی لوٹ آئے گا جہاں بھی گیا ہوگا ایک ماں حمیدہ تھی جس کو کسی پل چین نہ تھا کیونکہ اس کا جوان بیٹا نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ بھائی اور بھابیوں نے تو شکر کیا کہ چلو جان چھوٹی خس کم جہاں پاک۔

☆......☆......☆

جب کافی دن تک شہباز واپس نہ لوٹا تو سردار کو بھی تشویش لاحق ہوئی کہ جوان بیٹا ہے نہ جانے کہاں دھکے کھا رہا ہوگا۔

سردار کی طبیعت خراب ہوگئی ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے تو پتہ چلا کہ بلڈ پریشر کافی بڑھ گیا ہے۔

''لگتا ہے بابا جی نے کوئی گہرا صدمہ لیا ہے۔'' ڈاکٹر صاحب نے سختی سے منع کیا کہ انہیں زیادہ پریشانی والی بات نہ بتائی جائے ورنہ دماغ کی نس پھٹ سکتی ہے انہیں خوش رکھیں۔''

ڈاکٹر نے ایک ہفتہ علاج جاری رکھنے کا بولا اس کے بعد وہ سردار کو گھر لے آئے۔

☆......☆......☆

رقیب بہت پریشان تھا اوپر سے شازیہ مزید اس کو پریشان کرتی کہ تم نے پورے گھر کا ٹھیکہ اٹھا رکھا ہے اب اتنی مہنگی دوائیں کہاں سے لے کر دو گے۔''

''یہ نکما اگر یہاں تھا تو بھی ہمیں ہی مصیبت تھی اور اگر گھر سے چلا گیا ہے تو بھی ہم مزید ذلیل

ہو رہے ہیں۔"
"جہاں گیا تھا بڈھے کو بھی ساتھ ہی لے جاتا۔"
الغرض کہ شازیہ نے بہت اول فول بکا مگر رقیب نے ایک ذرا برابر بھی اس کی سرزنش نہ کی۔ اس کی دیکھا دیکھی سمیرا اور ساجد بھی کچھ اسی طرح کا ذہن بنانے لگے تھے۔

☆......☆......☆

ایک روز سردار نے پانی مانگا تو شازیہ نے اچھی خاصی جھاڑ پلا دی۔
"ایک میں ہی رہ گئی ہوں سب کا کام کرنے کے لیے آپ پر اتنے پیسے خرچ ہو چکے ہیں اب کچھ تو دوائیوں کا اثر ہو ہی گیا ہوگا آپ کم از کم پانی ہی اٹھ کر پی لیں۔"
اتنے میں رقیب آ گیا اور پھر آج شازیہ نے حتمی انداز میں کہہ دیا۔
"میں یہاں نہیں رہنا چاہتی مجھے شہر میں علیحدہ مکان لے کر دیا جائے۔" شازیہ ان دنوں امید سے تھی۔ حمیدہ اسے روکتی رہی۔ بیٹا ایسا نہ کرو ہم تمہارا خیال رکھیں گے آئندہ تم آرام کرنا سارے کام میں خود کرلوں گی۔" مگر شازیہ نے کوئی بھی بات نہ سننے کی قسم کھائی تھی۔

☆......☆......☆

شازیہ رقیب کو بہت سی جھوٹی باتیں بتاتی۔
"باندی بن کر رہنے لگتی ہوں اتنی کمزوری ہو گئی ہے۔" رقیب اماں کو برا بھلا بولتا۔
"آپ کو پتہ بھی ہے کہ ڈاکٹر نے شازیہ کو آرام کا مشورہ دیا ہے آپ پھر بھی اس سے گھر کے سارے کام لیتی ہیں۔" اتنے میں شازیہ اپنے بھائی کو فون کرتی۔
"مجھے آ کر لے جاؤ میری طبیعت بہت خراب ہے۔" ابا کی طبیعت مزید بگڑ جاتی۔ ساجد بہت روکتا۔ "بھائی نہ جاؤ اماں ابا کی طبیعت زیادہ خراب ہو جاتی ہے ٹینشن لینے سے۔" مگر وہ نہیں رکتی اور تو اور رقیب بھی شازیہ کے ہمراہ چلا جاتا۔
ساجد کی بیوی کچھ حد تک اماں ابا کا خیال رکھنے لگی۔ سمیرا ابھی امید سے تھی اور پھر خدا نے اُسے بیٹی سے نوازا۔
حمیدہ بہت خوش تھی اور دن رات کام کرتی رہتی، جس سے اس کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ اسے اکثر بخار رہنے لگا مگر وہ کسی کو نہیں بتاتی تھی۔
آخر بتاتی بھی کس کو...... سر کا سائیں...... خود بسترِ مرگ پر تھا ایک بیٹا نجانے کس دیس جا بسا تھا۔ دوسرا گھر چھوڑ کر بیوی کے ساتھ چلا گیا۔ تیسرا ساتھ تھا اگر اس سے شکایت کرتی ہوں یا دوا دارو مانگتی ہوں تو کہیں وہ مجھے ہی گھر سے نہ نکال دے۔
یہ سب سوچتے سوچتے وہ زندگی کے دن اس امید و آس پر گزار رہی تھی کہ ہوسکتا ہے اس کا شہباز کہیں سے آ جائے۔

☆......☆......☆

رقیب اور شازیہ کو خدا نے بیٹا عطا کیا مگر اس نے ابھی تک اماں باپ کو نہیں بتایا تھا۔
شازیہ کے میکے والے سب لوگ پاس تھے مگر رقیب کے گھر کسی کو کچھ خبر نہ تھی۔

☆......☆......☆

شہباز جب گھر چھوڑ کر گیا تو اس کے ذہن میں ہزار سوچیں تھیں آج در بدر رُلتے ہوئے اسے خیال آ رہا تھا کہ گھر میں کتنا سکون ہوتا ہے انسان بے خبر سو جاتا ہے کھانا وقت پر ملتا ہے۔ میرے ماں باپ میرا کتنا خیال رکھتے تھے۔ میں نے زندگی میں اُن کو کبھی سکھ نہیں دیا۔
اسی لیے آج خدا نے میرے سر سے چھت بھی چھین لی ہے۔ مگر اس نے عہد کیا کہ وہ محنت کرے گا

اور ماں باپ کی خدمت کر کے ان کے سارے گلے شکوے ختم کر دے گا۔

وہ سڑک کنارے چل رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اُس کے گھر سے آ جانے کے بعد گھر میں تو سکون ہو گیا ہوگا' وہ یہی باتیں سوچتا ہوا چل رہا تھا کہ پیچھے سے آنے والی گاڑی نے اُس کو ٹکر ماردی اور وہ وہیں گر گیا۔ گاڑی جو لڑکی چلا رہی تھی گھبرا گئی اور اُسے فوری طور پر اسپتال لے گئی۔

اسے ایک اچھے پرائیویٹ اسپتال میں داخل کروا دیا اور سارا خرچہ خود اٹھایا گیا وہ ہر روز اُسے دیکھنے آتی تھی۔

ایک ہفتہ ٹریٹمنٹ کے بعد شہباز بالکل فٹ ہو گیا۔ تو لڑکی نے اس سے پوچھا۔

''آپ کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟'' شہباز نے کہا۔

''میں گاؤں سے آیا ہوں پڑھا لکھا ہوں اور نوکری کی تلاش میں پریشان پھر رہا تھا کہ چکرا گیا اور آپ کی گاڑی سے ٹکرا گیا۔''

☆......☆......☆

ملائکہ نے اُسے یقین دلایا کہ آپ بالکل فکر مت کریں' میں آپ کے لیے نوکری کی پوری کوشش کرتی ہوں۔ پھر ملائکہ نے اپنے والد سے سفارش کر کے شہباز کو نوکری دلوا دی شہباز نے خوب دل لگا کر کام کیا اور جلد ہی سپروائزر کے عہدے تک جا پہنچا۔

ملائکہ کے والد کو شہباز بطور داماد بہت پسند آیا انہوں نے اپنی خواہش کا اظہار شہباز سے کیا۔

شہباز بھی چاہتا تھا کہ ملائکہ جیسی اچھی لڑکی اُس کی بیوی بن جائے۔

مگر اس نے ملائکہ کے والد سے گزارش کی کہ آپ مجھے کچھ وقت دیں میں اپنے والدین کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں وہ میرے پاس آ جائیں تو پھر شادی کی کریں گے۔ ملائکہ کے والد کو اس کی بات اچھی لگی۔ ٹھیک ہے شہباز بیٹے تم اپنے والدین کو لے آؤ اور گھر سیٹ کرنے میں تمہیں جو بھی مدد درکار ہوگی وہ میں کروں گا بے فکر رہو' شہباز نے انہیں ممنون نظروں سے دیکھا۔

☆......☆......☆

موسم بہت سہانا تھا فروری کے دن تھے رات کو ٹھنڈک اور دن کو موسم اچھا ہوتا تھا آج شہباز گاؤں جانے کے لیے نکلا جب وہ گاؤں پہنچا تو بہت خوش تھا کیونکہ وہ آج بہت دنوں بعد اپنے ماں باپ سے ملنے والا تھا۔

اسے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ وہ ماں باپ کی نظر میں نکما اور نکھٹو تھا اور آج وہ اس قابل ہو چکا تھا کہ وہ اچھے طریقے سے ماں باپ کی خدمت کر سکے۔

شہباز جب گھر پہنچا تو اسے اپنے بوڑھے والدین کی حالت دیکھ کر بہت صدمہ پہنچا مگر وہ کسی سے بھی شکوہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے خاموشی سے والدین کو ہمراہ لیا بھائیوں کے گلے لگ کر رخصت چاہی۔ کیونکہ وہ اپنی غلطیوں کا کفارہ کرنے نکلا تھا اور گناہ گار کسی سے شکوہ شکایت نہیں کرتا۔

☆......☆......☆

آج شہباز اپنے گھر میں بہت خوش ہے۔ ملائکہ بہت اچھی اور سلجھی ہوئی بیوی ثابت ہوئی۔ وہ اُس کے والدین کی خوب خدمت کرتی ہے۔ حالانکہ جلد ہی ماں کے رتبے پر فائز ہونے والی ہے مگر پھر بھی دل و جان سے اپنے ساس سسر کی خدمت کرتی ہے کیونکہ وہ مانتی ہے کہ والدین سے برا کرنے والوں کا انجام برا ہوتا ہے۔

☆☆......☆☆

وہاڑی سے ارسال کردہ تحریر

شریک حیات

اچھے معاشرے کے لیے ضروری ہے کہ اس معاشرے میں بسنے والے لوگ اچھے ہوں...... اپنے ہر رشتے سے مخلص، پھر چاہے وہ والدین ہوں' اولاد یا نصف بہتر......

ایم عاصم مجاہد

ہم بہت دور نکل جاتے ہیں بہت دور بے تکی راہوں پر بے تکان چلتے چلتے گرم اور ریتیلے راستوں پر بھٹکتے اور ڈگمگاتے کسی کم ظرف منزل کی طرف کسی ناآشنا مسکن کی جانب اور اس ساری جدوجہد میں راستے کی دھول ہمارے نتھنوں میں چلی جائے ہمیں کوئی پرواہ نہیں ہوتی گرد اور مٹی ہمارے سر کے بالوں سے لے کر ہمارے پاؤں تک کو آلودہ کر ڈالے ہمیں شعور اور احساس تک نہیں ہوتا کہ یہ تو سراب راہیں ہیں جو زندگی میں عذاب ہی عذاب گھول ڈالے گی اور پھر جب افق کے پار حیات کا سورج غروب ہونے لگتا ہے ہماری سانسوں کی بے ترتیبی بد نظمی اور تھکاوٹ ہمارے بدن کی بناوٹ کو بگاڑ کر رکھ دیتی ہے۔ پھر اچانک یہ احساس ہمیں جکڑ لیتا ہے کہ سامنے تو منزل ہے نہ راستہ اور نہ سفر کرنے کی مزید مہلت تمام راستے مسدود اور تمام مہلتیں مغلوب کر کے وقت اپنی بساط سمیٹنے والا ہے۔

عمر بھر دھیان کہیں باہر بھٹکتا رہا خیالات باہر کسی نامحرم کے تعاقب میں لگے رہے نگاہیں اپنے اردگرد اپنی منزل کو چھوڑ کر کسی اور سمت جا نکلیں اور پھر لوٹ کر کبھی اپنے پہلو میں آ ہی نہ سکی جو گھر کے برتن مانجھ مانجھ کر اپنے ہاتھوں کو کھردرا کروا چکی ہوں وہ گھر کے فرش پر جھاڑو اور پوچا مار مار کر بڑھاپے کی چوکھٹ پر آن بیٹھی۔

وہ جو دن رات بچوں کو پال پوس کر اپنے وجود کو مٹانے پر تلی ہے تمہاری متلاشی نگاہیں اس عورت کی طرف کیوں نہ اٹھ سکی وہ جسے دنیا بیوی کہتی ہے جو عمر بھر کی ساتھی کہلاتی ہے وہ جس کے بارے میں نبی کریمؐ نے فرمایا ہے کہ ان کے بارے میں اللہ سے ڈرو وہ ہی عورت جس کے بارے میں نبی کریمؐ نے فرمایا ہے کہ تم میں سے سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے اہل و عیال کے لیے بہتر ہو اور اللہ کے تقویٰ کے بعد مومن کے لیے نیک بیوی سے بہتر کوئی چیز نہیں وہ ہی عورت جس پر نبی کریمؐ نے اپنی پوری زندگی میں کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔

چشم فلک تو نے یہ محبت آفرین سماں بھی دیکھا ہے کہ جب حبشیوں کا کھیل دکھانے کے لیے اللہ

کے سب سے محبوب انسان نے اپنے کندھے مبارک نیچے کیے اور حضرت عائشہؓ نے نبی کریمؐ کے شانہ مبارک پر اپنا چہرہ رکھ کر وہ کھیل دیکھا آج ہم بھی غور کریں کہ کیا کبھی اپنی بیویوں کی اس طرح دل جوئی کرنے کی سنت ادا کی ہے محبتوں کا یہ منظر ہم نے بھی اپنے گھروں میں پیدا کیا ہے۔

چاہتوں کا وہ جذبہ کتنا شدید تھا کہ دنیا سے رخصتی کے وقت عائشہؓ کی چبائی ہوئی مسواک منہ میں لے کر نبی کریمؐ نے اپنے دانت مبارک صاف کیے داعیان حب رسولؐ غور کریں کبھی ہم نے بھی اپنی بیویوں کی چبائی ہوئی مسواک استعمال کی ہے۔

اپنی زندگی کو انتہائی خشکی اور سکری میں مبتلا کر دینے والو سنو کہ نبی کریمؐ نے اپنی زوجہ مطہرہ حضرت عائشہؓ کے ساتھ دوڑ بھی لگائی لیکن ہم کسی اور سمت نکل گئے وہ اسوہ جو ہمارے لیے نمونہ تھا اس کے کسی ایک پہلو کسی ایک حصے کی بھی ہم سے تکمیل نہ ہو سکی معمولی سی غلطی اور چپقلش پر ہم نے اپنی ساری زندگی کا حسن وار دینا گوارا کر لیا مگر سبب تلاش کرنے کی زحمت گوارہ نہ کی ہو سکے تو سبب تلاش کرو۔

یوں ہی کوئی خفا نہیں ہوتا ہم نے اپنے جیون ساتھی کی محبت سے ایسی پہلوتہی برتی کہ اسے سرے سے ہی زندگی سے نکال ڈالا وہ ایک ایسا ہی جنون تھا جو خود لڑ جھگڑ کر بیوی کو بس میں بیٹھا کر لوٹ آیا اور سالوں بیت جانے کے بعد بھی بیوی نہ آئی نہ وہ لینے گیا۔ وہ اب بھی بس میں بیٹھی سسک رہی ہوگی۔ میں اپنا ہاتھ ہوا میں لہرا کر لوٹ آیا۔

وہ جو آپ کے گھر کی ملکہ اور رانی ہے اسے وہ توجہ نہ دی جا سکی جس کی وہ حقدار تھی اور خود کسی اور کے تعاقب میں مارا مارا پھر رہا ہے میں مانتا ہوں کہ بعض عورتوں کی زبان صرف چلتی ہی نہیں بلکہ سرپٹ بھاگتی ہے مگر محض اس غلطی پر اپنے جیون ساتھی سے سرمو اغراض برت لینا بھی تو ازدواجی رشتے کی توہین



کے مترادف ہے اور اس بات کو جواز بنا کر کسی نامعلوم منزل کی طرف نکل پڑنا بھی خود فریبی کے سوا کچھ نہیں۔

محبت کی بہار آئی اور خالی گئی آ کر
حصار بدگمانی سے تم نکلے نہ ہم نکلے

یہ ہم کہاں نکل آئے ہیں ہماری حقیقی محبت کا ڈیل ڈول تن وتوش بالکل بھدا ہو کر بے رواکاری کا شکار کیوں ہو گیا ہم جانتے ہوئے کسی عذاب نگری کے مسافر کیوں بن رہے ہیں اس سے پہلے کہ زندگی کا سورج آخری سانس بھرے اس سے پہلے کہ سانسوں کی آمد رک جائے اس سے پہلے کہ زندگی کا آفتاب ڈوبنے لگے۔ اپنی گمراہ محبتوں کو روک لیجیے خدا کے لیے اگر آپ کا اپنا جیون ساتھی آپ سے روٹھ چلا ہے تو پلیز اسے ایک بار کہہ دیجیے۔

بن تمہارے تو حل نہیں ہوں گے
ہم سے یہ مسئلے محبت کے

کتنے ہی لوگوں کی اس روش اور ڈگر پر چلتے چلتے زندگیاں ختم ہو گئیں انہوں نے شریک حیات کو کبھی اہمیت دی نہ محبت ان کی زندگیوں میں کبھی ایسے پارسا جذبات اُگ بھی آئے تو انہوں نے اندر ہی اندر اپنے جذبات کا گلا دبا کر اُن کو اپنے وجود میں دفن کر لیا۔
اور کسی غیر محرم کے پیچھے اپنی زندگی کو برباد کر لیا خدا کے لیے اپنے مثبت جذبات پر قابو مت رکھیں آج میری بات مان لیجیے چاہے آپ کا ہمسفر آپ کی زندگی کا ساتھی آپ سے ناراض ہے یا خوش آپ ایک تحفہ لیجیے اور اپنی بیوی کے نام کر دیجیے ایک بے کراں محبتوں کا سمندر آپ کے دل میں ٹھاٹھیں مارے گا اور آپ کو اپنی بیوی کی وہ تمام خوبیاں نظر آئیں گی جو آپ کے خیال نگر سے گزری نہیں۔

اس قدر بھی تو نہ جذبات پر قابو رکھو عاصم
تھک گئے ہو تو میرے کندھے پر سر رکھو

☆☆......☆☆



غزل

جو مرے ساتھ چل نہیں سکتا
میں بھی اس سے بہل نہیں سکتا

میری عادت ہے چاہ کر بھی میں
اپنی عادت بدل نہیں سکتا

صرف کہنے کی ہیں یہ سب باتیں
کوئی گر کر سنبھل نہیں سکتا

اس خرابے میں زندگی کا چراغ
بجھ تو سکتا ہے، جل نہیں سکتا

ہے حقیقت کہ وقت سے فرخ
کوئی آگے نکل نہیں سکتا

فرخ اظہار

میاں چنوں سے ارسال کردہ تحریر

مات

مشہور ہونے کے شوقین لوگوں کے لیے لمحہ فکریہ..... ٹھگ آس پاس ہی ہوتے ہیں اور موقع سے خوب فائدہ بھی اٹھاتے ہیں

مہر پرویز احمد دولو

دنیا کا جتنا مشکل ترین کام اسے کہا جاتا' لمحوں میں وہ دو چار حل بتا دیتا۔

ملازمت کا حصول ہو' تھانے کچہری میں تفتیش چل رہی ہو' کسی ادارے میں انکوائری ہو' کوئی بل پاس کروانا ہو' کسی چیز یا ہتھیار کا لائسنس بنوانا ہو' پرمٹ جاری کروانا ہو' دوست آفیسروں کی ایک لمبی فہرست سائل کے سامنے رکھ دیتا۔ ''ڈوبتے کو تنکے کا سہارا اور ویسے بھی غرض مند دیوانہ ہوتا ہے' وہ ہر صورت اپنا کام نکلوانا چاہتا ہے' روپے پیسے کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔

اس چھلاوے اور بین الاقوامی سفیر کی باتوں میں لوگ یوں پھنس جاتے' جیسے دانہ چگنے والے بھوکے پرندے جال میں پھنس جاتے ہیں۔

کام کے عوض لمبا ہاتھ مار کر ہزاروں کی مد میں روپے بٹور کر یوں غائب ہو جاتا جیسے گرمی کے موسم میں ٹرانسفارمر سے بجلی غائب ہو جاتی ہے۔ کوئی بھی کام اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوتا وہ بھی صرف باتوں کی حد تک......

یورپی ممالک کے ویزے دینے کے دعوے کرتا' جیسے ریلوے اسٹیشن سے سیٹ بمعہ برتھ بک کروانی ہو۔

سیاسی پناہ دلوانا بھی اس کے لیے معمولی کام تھا۔

کسی بھی ادارے' دفتر یا محکمے میں چکر لگا لگا کر تھک جانے والا سائل اس کی باتوں میں آ کر لمبی چوڑی رقم دے کر مسئلہ حل کروانے کی کوشش کرتا۔

وہ باتوں کے محلات تعمیر کر کے ایسے سپنے دکھاتا کہ سائل اندھا اعتماد کرنے پر مجبور ہو جاتا۔

پیسے اینٹھتے ہی یا تو غائب ہو جاتا یا پھر وعدوں پر ٹرخاتا رہتا۔

اگر کوئی تھک ہار کر یا اس کے جھوٹ سے واقف ہو کر زور زبردستی کی کوشش کرتا تو تھانے کچہری کی دھمکی دیتا۔

بہت تیز ہوشیار نوسرباز تھا' پولیس والوں سے دوستی رکھتا اکثر سائلین کو جھوٹی ایف آئی آر میں بند کروا دیتا۔ اس لیے عام سادہ لوگ اُلٹا اُس سے

معافی مانگ کر جان چھڑواتے بڑا مشہور مقولہ ہے کہ چوروں کو پڑ گئے مور......

جب چور پھنس جاتا ہے تو بیچ چوراہے جوتے پالش کرنے والے اور امرود بیچنے والے سے لے کر معزز شہری تک ہر شخص دو چار تھپڑ مارنا عین کار ثواب سمجھتا ہے۔

لوگوں کو تگنی کا ناچ نچانے والے خود وقت کی ڈگڈگی پر بندر کی طرح ناچتے ہیں چکنی چپڑی باتوں سے گھیرنے کا فن وہ خوب جانتا تھا۔

جس طرح ایک بھکاری کو بزرگ استاد بھکاری کی یہ نصیحت ہوتی ہے۔

''بیٹا...... ہر جگہ مانگنا' ہر کسی سے مانگنا' ہر چیز مانگنا اور ہر وقت مانگنا۔'' اس کو بھی دادا استاد نے یہ نصیحت کی تھی۔

''بیٹا ہر جگہ فراڈ کرنا' ہر وقت فراڈ کرنا' ہر کسی سے فراڈ کرنا اور ہر چیز کا فراڈ کرنا۔'' روپے دینے والی پارٹی نہ ملی تو ایک زمیندار کو باتوں کے چنگل میں پھنسا کر دس ایکڑ کنو کا باغ ادھار لے لیا' چار لاکھ میں سودا طے ہو گیا۔ کچا پکا کنو توڑ کر کراچی بھیجنا شروع کر دیا۔

جس دن آخری گاڑی بھرنی تھی اس سے ایک دن قبل ایک مزدور نے ٹھیکیدار کے ارادوں سے





زمیندار کو آگاہ کیا۔
زمیندار نے سمجھداری کا مظاہرہ کیا اور عین اسی دن اس کی الوداعی پارٹی کر ڈالی ٹھیکیدار کو بھاگنے کی جلدی تھی زمیندار کو مطمئن کرنے کے لیے پارٹی کھانے کی حامی بھرلی۔
پارٹی سے فارغ ہونے کے بعد زمیندار نے روپوں کا مطالبہ کیا لیکن اس کے پاس تو پھوٹی کوڑی نہ تھی۔
"کل گاڑی منڈی بھیج رہا ہوں مال پہنچتے ہی آڑھتی سے پیسے لے کر آپ کو دے جاؤں گا۔" اس نے باتوں سے مطمئن کرنے کی کوشش کی لیکن زمیندار اس کے فراڈ سے آگاہ ہو چکا تھا۔ اس نے نوکر کو بلوا کر رسہ منگوایا اور ٹرانسفارمر کے ساتھ باندھ دیا پھر اس کے گھر والوں کو پیغام بھجوایا۔
"اگر چھڑوانا ہے تو چار لاکھ روپے دے جاؤ اور اس کو لے جاؤ اگر بدمعاشی کی تو اسے تھانے بند کروادوں گا میرا بھائی صوبائی وزیر ہے۔" پیغام پہنچنے کی دیر تھی کہ ڈھور ڈنگر' اور خواتین کے زیورات وغیرہ بیچ کر رقم پوری کی اور ادائیگی کے بعد اسے چھڑوا کر لے گئے۔
شرمندگی کی وجہ سے کچھ دن تو گھر میں مقید رہا بات پرانی ہوتے ہی دور کے علاقے کو ہدف بنایا ایک دوست کی معرفت بند پڑا پیٹرول پمپ ٹھیکے پر لے لیا۔
تزئین و آرائش پر خوب پیسہ لگایا۔
مقامی لوگوں کے بارے میں معلومات اکٹھی کیں اور ان کے نام لمبے چوڑے القابات کے ساتھ دیواروں پر لکھوائے۔
مقامی لوگوں نے جب اپنے نام پیٹرول پمپ کی دیواروں پر دیکھے تو فخر سے ان کی گردنیں اکڑ گئیں۔
ایک پیٹرول پمپ کے مالک کا پروٹوکول دیکھ کر ہواؤں میں اڑنے لگے مقامی لوگوں کے شیشے میں اترنے کی دیر تھی کہ نادر کے سپنے حقیقت کا رنگ بھرنے لگے نودولتیے اور لفنگے پیٹرول ڈلوانے کے بہانے راہ و رسم بڑھانے لگے۔
اس دوران نادر نے لمبی چوڑی جائیداد' عزیز رشتے دار آفیسروں کے جھوٹے افسانے سنانے شروع کر دیے۔
جو بھی اس کی کہانی سنتا اس کے بچھائے جال میں پھنسنے کو اعزاز سمجھتا۔ مقامی لوگ بھی ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے نادر کے آگے پیچھے پھرنے لگے۔
اس کے شاندار دفتر میں شراب' کباب کے دور چلنے لگے مقامی لوگ باری باری اس کی آشیر باد حاصل کرنے لگے۔
ہر شخص کی کوشش ہوتی کہ مخالف اس کو دفتر میں آرام دہ صوفے میں دھنسا دیکھے جہاں اس کے آگے مشروب کی بوتلیں اور گولڈ لیف کے پیکٹ نادر رکھتا۔
نادر کا مقصد باری باری ان تمام پنچھیوں کو دانہ دنکا ڈال کر پھانستا تھا اور پھر مرضی کی شرائط منوا کر ان کو آزاد کرنا تھا۔

☆......☆......☆

پمپ پر آئے روز مقامی لوگوں کی دعوتیں ہونے لگیں۔ جس طرح ہیروئن کے عادی پہلے اپنی جیب سے خرچ کر کے سگریٹ نئے لوگوں کو پلاتے ہیں پھر ساری زندگی ان سے نشہ پورا کرتے ہیں۔ اسی طرح نادر بھی پہلے جیب سے بے دریغ خرچ کرتا بعد میں سود سمیت وصول کرتا اس وقت مرغ پلاؤ اڑانے والوں کو پتہ چلتا کہ وہ کھانا کتنا مہنگا تھا۔

☆......☆......☆

یوسف اور حمید اونچے شملے کے شوقین تھے عزت کے جھوٹے تاج کو پہننے کی خاطر بہت کچھ گنوا چکے تھے' لیکن ایک دوسرے کو نیچا نہ دکھا سکے۔ نادر سے ایک سے بڑھ کر تعلقات بنا کر ہمدردی سمیٹنے لگے۔

حمید بلاوجہ روز شہر جانے کے بہانے پمپ پر آ کر بائیک میں پیٹرول ڈلواتا نادر کی شکاری نگاہوں نے اُسے تاڑ لیا۔

دفتر میں بٹھا کر خوب آؤ بھگت کرتا مرغن کھانے کھلاتا کبھی بکرے کی کڑاہی تو کبھی مرغ پکوڑے کھانے کو ملتے۔

حمید نادر کی اس دریادلی پر بہت خوش تھا اب تو وہ بھی وقتاً فوقتاً کھانا پکوا کر لانے لگا۔

جب حمید اچھی طرح عقیدت مند بن گیا تو نادر نے وصولی کا فیصلہ کیا۔

''تمہارے گھر کے کھانے کھا کر آپ کی محبتوں کا مقروض ہوں' آپ کے احسانوں سے سرنگوں ہو چکا ہوں' میں کچھ حساب چکانا چاہتا ہوں' میرا ایک دوست جعلی نوٹوں کا کاروبار کرتا ہے لاکھ کے دو لاکھ دیتا ہے' بالکل اصلی کے مشابہہ نوٹ ہوتے ہیں' اگر آپ تین لاکھ دے دیں تو وہ آٹھ لاکھ روپے دے گا۔''

''یہ نوٹ میں استعمال کروں گا اور آپ کو اصل آٹھ لاکھ دوں گا' یا پھر خود استعمال کر لینا' میں تو پمپ کی آڑ میں کاروبار لمبے عرصے سے کر رہا ہوں۔''

حمید تو دنوں میں لکھ پتی بننے کے خواب کی بجائے حقیقت کے سپنے دیکھنے لگا۔

گھر میں موجود قیمتی اشیاء اور زیورات وغیرہ بیچ کر تین لاکھ جمع کیے اور ایک دن نادر کے حوالے کیے۔

نادر نے ان پیسوں سے قسطوں پر گاڑی خریدی' فرنٹ سیٹ پر حمید کو بٹھاتا' کبھی شہر' کبھی اردگرد کے گاؤں کی سیر ہونے لگی۔ شام کو حمید کو گھر ڈراپ کرتا ساتھ ہی کبھی مٹھائی کا ڈبہ' کبھی پھلوں کی ٹوکری اس کے گھر پہنچاتا۔

حمید کے گاڑی میں سیر سپاٹے' روز مٹھائی کے ڈبے اور نادر سے گہری دوستی دیکھ کر یوسف حسد کی آگ میں جلنے لگا۔

حمید کو نیچا دکھانے کے لیے کڑاہی گوشت اور مرغ پلاؤ پکوا کر ایک دن یوسف پمپ پہنچ گیا' یوسف کی محبت اور چاہت نے نادر کو ایک اور شکار بغیر محنت کے فراہم کر دیا۔

اس چاہت اور دوستی کے بندھن کو حمید نے بڑی مشکل سے برداشت کیا اور اگلے دن روپوں کا مطالبہ کر دیا۔

پہلے تو نادر ٹال مٹول سے کام چلاتا رہا' لیکن یوسف کی رقابت نے حمید سپنے بکھیر دیے۔ اس کے علاوہ ساتھ چلنے پھرنے سے وہ نادر کی عادات سے آگاہ ہو گیا کہ یہ ایک فراڈیا ہے۔

باتوں کے جال میں پھنسا کر لوٹنے والا شکاری ہے۔ یوسف کے ہاتھ آنے پر نادر بھی حمید سے کھچا کھچا رہنے لگا۔

روز کے وعدوں سے تنگ آ کر حمید نے ایک دن پنچائیت بلالی اور رقم کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ اس پنچائیت میں نادر کی بجائے یوسف ہاتھ نچا نچا کر بات کرنے لگا۔

نادر کی مکمل حمایت کی دوسری بار پنچائیت کے اکٹھا ہونے پر یوسف نادر کا ضامن بن گیا اور رقم کی ادائیگی کا دو ماہ بعد کا وعدہ کیا۔

جس ٹیوٹا کرولا کی فرنٹ سیٹ پر کبھی حمید بیٹھتا تھا اب اس سیٹ پر یوسف بیٹھتا' حمید کے دروازے کے سامنے بلاوجہ ہارن بجا کر گاڑی کا رعب جھاڑتا اور اس کو دکھاتا کہ اب تمہارے والی سیٹ میرے

قبضے میں ہے۔

☆......☆......☆

میٹرک پاس کرنے کے بعد یوسف کا بیٹا امجد آوارہ لڑکوں کا سربراہ بن گیا۔ بات چوری سے شروع ہوئی اور ڈکیتی تک جا پہنچی۔

آئے روز پولیس کے چھاپوں نے ان کی زندگی اجیرن کردی۔ اس دوران نادر رحمت کے فرشتے کی طرح اس پر سایہ فگن ہوتا۔

کئی بار پولیس والوں سے مک مکا کروا کے امجد کو تھانے سے چھڑوالایا۔ یوسف کو مصائب میں گھرا دیکھ کر نادر نے اپنے منصوبے پر عمل درآمد شروع کردیا۔

''جان میں میرے بڑے بھائی کا گاڑیوں کا کاروبار ہے' دفتر کے لیے اسے منیجر کی ضرورت ہے ویسے تو ویزے کی کل قیمت پندرہ لاکھ روپے ہے لیکن آپ کی دوستی کو مدنظر رکھتے ہوئے دس لاکھ میں امجد کا ویزہ آجائے گا۔''

''ایک لاکھ روپے پاکستانی تنخواہ اور ہر بکنے والی گاڑی پر کمیشن الگ سے ملے گا۔ ہر ماہ تقریباً دو لاکھ روپے کمائے گا۔''

''آپ کے مجھ پر بہت احسان ہیں میں ان کا بدلہ چکانا چاہتا ہوں۔''

دو لاکھ ماہانہ کمائی کی بات سنتے ہی یہ پورا خاندان راتوں رات ڈالروں میں کھیلنے کا خواب دیکھنے لگا۔ دس لاکھ اکٹھے کرنے کے لیے سب لوگ مورچہ زن ہوگئے۔

خواتین کے زیورات اور جانور فروخت کیے گئے' زمین کو ٹھیکے پر دیا' رشتے داروں سے امداد لی' یوں ایک ماہ کے اندر اندر دس لاکھ روپے اکٹھے کرکے نادر کے حوالے کردیے۔

☆......☆......☆

دس لاکھ روپے ہاتھ آتے ہی نادر یہاں سے اڑان بھرنے کے لیے پر تولنے لگا۔ پمپ کے ٹھیکے میں دو ماہ باقی تھے اس لیے تحمل سے چیزوں کو سمیٹنے لگا۔ امجد جاپان جارہا تھا' ماں نے سوچا پتہ نہیں کب واپس آئے گا۔

کیوں نہ میں اس کی شادی کرکے فرض کی ادائیگی کے ساتھ بیٹے کی خوشیاں بھی دیکھ لوں۔ ایک جگہ رشتہ طے کردیا گیا' شادی کے تمام انتظامات نادر نے اپنے ہاتھ لے لیے مرضی کے سنار سے زیورات بنوائے گئے تقریباً چار لاکھ روپے بل بنا۔ یوسف نے ادائیگی کی بل نادر نے اپنے نام بنوایا تمام رسیدیں اپنے پاس محفوظ رکھیں۔

لڑکی والوں کو جہیز خرید کردیا' بیڈ' سوٹ' بریف کیس' بستر چارپائیاں' صندوق اور لوہے کی پیٹیاں خریدی گئیں۔

تقریباً تین لاکھ ادائیگی یوسف نے کی جبکہ تمام رسیدیں اور بل نادر نے اپنے نام کے بنوائے۔

شادی ہال بک کروایا گیا۔

بل تین لاکھ روپے بنا جس کی ادائیگی یوسف نے کی جبکہ بل نادر نے اپنے نام بنوایا۔

شادی سے فراغت پاتے ہی یوسف ویزے کے لیے زور دینے لگا۔

جبکہ نادر کل اور پرسوں کے وعدوں پر ٹرخانے لگا۔ روز کے وعدوں سے میاں بیوی کو شک ہونے لگا۔ حمید ضمانت کی یاددہانی کے لیے ایک شام یوسف کے گھر پہنچ گیا۔

باتوں باتوں میں اس کی بیوی کو اپنے لٹنے کی داستان سنائی' ٹھوس دلائل سے وہ دونوں میاں بیوی کو یہ باور کروانے میں کامیاب ہوگیا کہ نادر ایک شاطر اور فراڈیا شخص ہے یہ لوگوں کی سادہ لوحی دیکھ کر باتوں کے چنگل میں پھنسا کر لوٹتا ہے۔

ماضی انتہائی مکروہ ہے کئی جگہوں پر ذلیل ورسوا ہو چکا ہے۔

یہاں بھی حمید اور یوسف کو لوٹ چکا ہے اور اب بھاگنے کے منصوبے بنا رہا ہے' اپنے علاقے میں بدنام ہو کر اس نے اِدھر کا رخ کیا ہے۔

حقیقت حال سے آگاہ ہوتے ہی میاں بیوی کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ وہ اپنے ہاتھوں بری طرح سب کچھ لٹوا کر تہی دامن ہو چکے تھے۔

لیکن اب کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت......

اگلی صبح یوسف پیٹرول پمپ پر گیا تو اس کے تیور ہی بدلے ہوئے تھے۔

نادر انسانوں کا شکاری تھا' ساری بات بھانپ گیا اس نے بھی آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں سخت غصے کے عالم میں یوسف اول فول بک کر اور دھمکیاں دے کر چلا آیا اگلے دن یوسف نے علاقے کے معززین پر مشتمل پنچائیت اکٹھی کی۔

پمپ پر ایک دفعہ پھر عدالت لگ گئی' ملزم سابقہ تھا مدعی بدل گیا۔

یوسف نے رو رو کر گریہ زاری کی اور اپنے لٹنے کی داستان پنچائیت کو سنائی ویزے کے لیے دیے گئے دس لاکھ روپے کی واپسی کا مطالبہ کیا عدم ادائیگی کی صورت میں مارنے یا مر جانے کا فیصلہ پنچائیت پر واضح کیا۔

یوسف کی گریہ زاری' الزام تراشی اور دھمکیوں کو سننے کے بعد نادر دفتر گیا اور ایک فائل اٹھا کر لایا۔

پنچائیت خدا کی قسم' یوسف کی سب باتیں درست ہیں میں نے اس کے گھر کا نمک کھایا ویزا دلوانے کی مد میں دس لاکھ روپے لیے۔

انہوں نے بیٹے کو بیرون ملک بھیجنے سے قبل شادی کا پروگرام بنایا۔ تمام انتظامات میرے حوالے کیے گئے۔

''اپنا بیٹا اور بھائی سمجھ کر میں نے شادی پر بہترین انتظامات کیے۔''

''اخراجات کی پرواہ نہ کی جتنا بھی خرچہ تھا میں نے دل کھول کر کیا اپنی جمع پونجی کے علاوہ لوگوں سے قرض لے کر بھی تمام امور نبٹائے۔''

''چار لاکھ روپے کے سونے کے زیورات بنوائے ادائیگی میں نے کی یہ ہیں زیورات کی رسیدیں' جہیز کا سامان خریدا تین لاکھ روپے خرچ ہوئے یہ ہیں ادائیگی کی رسیدیں' تین لاکھ روپے میں شادی ہال بک کروایا اس کی ادائیگی کی رسید آپ کے سامنے ہے۔'' نادر نے پنچائیت کے سامنے وضاحت کی۔

'' ادائیگیوں کی بابت سنتے ہی یوسف کی آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے۔

اس نے پنچائیت کو رو رو کر بتایا کہ یہ سب ادائیگیاں میں نے کی ہیں۔'' لیکن نادر کے نام کی رسیدیں دیکھ کر پنچائیت لاجواب ہو گئی کوئی بھی شخص اس کو مورد الزام نہ ٹھہرا سکا۔

نادر نے مزید وضاحت کی کہ آپ کے خیال میں اگر یہ رسیدیں جعلی ہیں تو آپ خود جا کر دکانداروں اور شادی ہال کے مالک سے تصدیق کر لیں۔'' لیکن وہ رسیدیں تو سو فیصد درست تھیں کون ان کو جھٹلاتا۔

یوسف حمید اور پنچائیت کے لوگوں کو یقین تھا کہ نادر جھوٹا ہے۔ لیکن عدم ثبوت کی بنا پر وہ صاف بچ نکلا۔

علاقے کے دو بڑے نام کمانے کے چکر میں آخر کار تیسرے سے مات کھا ہی گئے۔

☆☆......☆☆

لاہور سے ارسال کردہ لرزہ خیز داستان

میں برباد ہوئی

وہ معصوم تھا، حالات کا شکار تھا، وہ کم سن تھی، فریب کو حقیقت سمجھ بیٹھی، دو ایسے انسانوں کی داستان جو نہ چاہتے ہوئے بھی برباد ہو گئے......

عنبرین اختر

تانبے کی طرح تپتے آکاش پر رینگتے ہوئے کچھ روئی کی مانند سفید سفید بادل کبھی چمکتے آفتاب سے دست و گریباں ہوتے پھر آفتاب کی تیز شعاعیں اُن کو دھکے دے کر افق کے پرے دھکیل دیتیں۔ پیڑوں پر اچکتے ہوئے کوئے اور کبوتروں کے پروں پر کبھی سونے کی چمک بھر جاتی اور کبھی کاجل سے بھی گہری سیاہی پھیل جاتی۔

وسیع لان میں کچھ لڑکے اور لڑکیوں کی ٹولیاں آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے اور کچھ اپنی اسٹڈی میں گم تھے۔ گراؤنڈ کے چاروں طرف دو منزلہ بلڈنگ تھی اور یہی کلاس رومز تھے فاصلوں پر بینچ لگے ہوئے تھے۔ اور ان بینچوں کے پاس رنگ برنگی پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ جن کی حفاظت مالی کرتا تھا۔ وہ روز ان کیاریوں کی صفائی کرتا اور فالتو جڑی بوٹیاں نکالتا رہتا۔ انسان ہوں یا پھول پودے دوسرے کی محبت اور توجہ چاہتے ہیں فرحان اپنا بیگ کندھوں پر لٹکائے قیصر کو تلاش کر رہا تھا۔ جو سر جھکائے موبائل پر گیم کھیل رہا تھا۔

فرحان اس کے پاس آیا۔

”یار تم نے شوسیالوجی کے نوٹس بنائے یا نہیں میں تو کل بہت تھک گیا تھا۔ اس لیے گھر جاتے ہی سو گیا۔ لیکن مجھے معلوم ہے تم نوٹس مکمل کر کے لائے ہو گے فرحان نے اپنے نامکمل نوٹس بینچ رکھ دیے۔ اتنا ارسطو نہیں ہوں کہ نوٹس مکمل کر کے لاتا۔ سچ پوچھو تو میں نے کل بک بھی نہیں کھولی۔ گھر پہنچا تو کزنز آئے ہوئے تھے۔ بس ان کے ساتھ ٹائم گزارنے کا پتہ ہی نہیں چلا۔“ قیصر کہتے ہوئے بولا۔

”یعنی کہ تم بھی میری طرح کام چور ہو۔“

”بس یار سمجھ لو۔“

”ویسے ایک بات بتاؤں تمہیں۔“

”ہاں بتاؤ کیا بات ہے فرحان“ قیصر لان میں اپنی بکس سمیٹتے ہوئے بولا۔

یار یہ سوسیالوجی بڑا مشکل سبجیکٹ ہے۔ ایک دم سے سر سے گزر جاتا ہے۔ اور مجھے تو اُس ٹائم

کلاس میں نیند آنے لگتی ہے۔ جب بھی سر لیکچر دینا شروع کرتے ہیں۔

نیند نہیں آتی جناب کو بلکہ اپنی کلاس فیلوز کو گھورتے رہتے ہو۔ اور کاغذ کی گولیوں پر کچھ لکھ کر لڑکیوں کی طرف پھینکتے رہتے ہو۔ فرحان نے چوری پکڑتے ہوئے کہا۔

''یہ تم کیسی باتیں کررہے ہو۔ میں نے تو ایسا کبھی نہیں کیا۔'' قیصر بوکھلا کر بولا۔

''کل جب پریڈ آف ہونے والا تھا۔ اچانک میری نظر تم پر پڑی۔ تو تم گولیاں بنا کر پھینک رہے تھے۔''

''اسی لیے لاسٹ چیئر پر بیٹھتے ہو کہ یہ حرکتیں کرسکو تم......''

''تو تم بھی کوئی فلسفی نہیں ہو۔ جو آرام سے اپنی سیٹ پر بیٹھ سکو۔ کل چھٹی کے ٹائم تم بھی آوازیں کس رہے تھے۔ اپنی غلطی نظر نہیں آتی تمہیں اور میری جاسوسیاں کرتے ہو۔ قیصر نے بھی معاملہ برابر کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا اب جانے دو ان باتوں کو اور یہ بتاؤ ان نوٹس کو مکمل کیسے کرنا ہے۔'' قیصر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔

فرحان کچھ دیر سوچنے لگا۔ پھر بولا۔

''ایک آئیڈیا ہے میرے پاس......''

''کیسا آئیڈیا؟''

''کیوں نا اس کلاس کے سب سے ہونہار دوست کے پاس جایا جائے اور اُس کے سامنے



اپنا مسئلہ رکھا جائے۔"
"تمہارا خیال بلال کی طرف تو نہیں۔"
"سو فیصد درست سمجھا تم نے......"
"لیکن یار وہ کیا سوچے گا۔"
"جانتے ہو رواں مہینے میں ہم اُس سے کوئی پچاس دفعہ نوٹس مانگ چکے ہیں۔ اور وہ بیچارہ اُف تک نہیں کرتا۔" فرحان شرمندہ ہوتے ہوئے بولا۔
"مگر وہ ہے کہاں کافی دیر سے نظر نہیں آ رہا ہے۔" فرحان اور قیصر نے نظر دوڑائی تو بلال سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ بلال جو دبلا پتلا چوبیس سالہ نوجوان تھا۔ چہرے پر داڑھی، بڑی آنکھیں اور سانولہ رنگ اس کی شخصیت کو ابھارتا تھا۔
غالباً وہ کالج کی مسجد سے ظہر کی نماز ادا کر کے لوٹ رہا تھا۔ ان کے پاس آیا۔ سلام کیا اور کہنے لگا۔
"کیا بات ہے دوستوں کچھ پریشان لگ رہے ہو۔" بلال سر سے ٹوپی اتارتے ہوئے بولا۔
"ہاں یار......تم ٹھیک سمجھے، ہم دونوں کا وہی پرانا اور سنگین مسئلہ جو ہمارے ساتھ چلتا آ رہا ہے۔"
"نوٹس نہیں بنائے تم نے۔" فرحان گنگنانے کے انداز میں بولا۔
"یہ لو نوٹس اور جلدی سے بنالو۔" بلال نے نوٹس بیگ سے نکال کر دیے۔
"اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے دوست ہی دوست کے کام آتے ہیں۔ اور ہاں جلدی سے انہیں تیار کرلو کل سر فیاض کو چیک کروانے ہیں۔"
"کل...... مگر آج کیوں نہیں؟" فرحان جملہ لمبا کرتے ہوئے بولا۔
کیونکہ آج سر فیاض جلدی گھر چلے گئے ہیں۔ اُن کا گھر سے کوئی ضروری فون آ گیا تھا۔
"اوہ تھینکس گاڈ...... یار تم کتنے اچھے ہو۔ ایک منٹ میں ہماری پرابلم حل کر دی۔"
"اچھا اب زیادہ باتیں نہ بناؤ، جلدی سے نوٹس تیار کرلو، میں اتنے میں لائبریری کا چکر لگا کر آتا ہوں۔" بلال تاکید کرتے ہوئے بولا۔ جبکہ دونوں دوست نوٹس بنانے میں مگن ہو گئے۔
بلال ایک دم سناٹا دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا۔ ہال میں جیسے ہی اس نے قدم رکھا۔ چند لوگوں کے سوا وہاں کتابوں سے بھری الماریاں ہی اسے نظر آئیں۔ اس نے کاؤنٹر سے ٹوکن لیا اور دبے قدموں سے ہال میں قدم رکھنا شروع کیے۔ ہال کے ایک طرف لائبریرین اپنے کچھ ضروری رجسٹر لیے بیٹھا تھا اور کچھ بکس ان کے صاف ستھرے ٹیبل پر سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ ہال کے چاروں کونوں میں صاف ستھری الماریوں میں بکس بڑی نفاست سے رکھی ہوئی تھیں۔
لیکن انہیں جس بک کی تلاش تھی کافی دیر وہ ڈھونڈتا رہا پھر لائبریرین کے پاس آئے اور کہا۔
"مجھے فلاں بک نہیں مل رہی ہے۔" لائبریرین بولا۔
"وہ بک فلاں لڑکی کے پاس ہے۔ آپ کچھ دیر انتظار کرلیں۔" بلال شکریہ ادا کرتے ہوئے نزدیکی صوفے پر بیٹھ گیا۔
"گھڑی پر ٹائم دیکھا تو دوپہر کے ڈھائی بج رہے تھے۔" مایوسی کے عالم میں وہ اٹھنے لگا۔ اپنا ٹوکن واپس کیا اور ہال سے باہر نکل آیا ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ عقب سے آواز آئی۔
"سنیں......" ایک نسوانی آواز بلال کی

سماعتوں سے ٹکرائی۔
''یہ رہی آپ کی بک اصل میں مجھے کچھ پوائنٹس چاہیے تھے۔اس لیے کافی دیر پاس رکھنی پڑی۔ آپ کو کافی دیر انتظار کرنا پڑا۔ اس کے لیے میں معذرت چاہتی ہوں۔'' وہ لڑکی بک بلال کو دیتے ہوئے وہاں سے چلی گئی لیکن بلال کی آنکھیں پلکیں جھپکنا بھول گئیں۔ وہ گوری رنگت والی لڑکی جس کی غزالی آنکھیں' ستواں ناک' اور صراحی جیسی گردن' بلال کے دل کے تار چھیڑ کر وہاں سے جارہی تھی۔ غالباً یہ کالج میں نئی آئی تھی۔ بلال نے دل ہی دل میں سوچا۔
''ارے مسٹر بلال کہاں کھو گئے آپ' وہ محترمہ تو کب کی جا چکی ہے اور آپ دور خلاؤں میں کیا تلاش کررہے ہو۔'' فرحان نوٹس پکڑاتے ہوئے بولا۔
''تم نے اپنا کام مکمل کرلیا۔''
''جی جناب ہم نے تو اپنا کام مکمل کرلیا۔ لیکن آپ کا کام اب شروع ہوا ہے۔ کچھ ایسا ہی لگ رہا ہے آپ کے چہرے سے' میں گھر جارہا ہوں کل ملیں گے بائے......'' وہ جلدی سے ہاتھ ملاتے ہوئے گیٹ سے باہر نکل آیا۔ بلال کے باہر نکلنے تک وہ لڑکی اسے کہیں نظر نہ آئی۔ غالباً وہ گھر جا چکی تھی۔ اس نے دل میں سوچا۔ پھر اس نے بھی اپنی بائیک اسٹارٹ کی اور گرمی میں باہر کشادہ سڑک پر نکل آیا اور گھر کی طرف چل دیا۔
شام کے سائے پھیلتے ہی آسمان پر ہلکے ہلکے بادل نمودار ہونے لگے۔ ٹھنڈی ہوا اپنا جادو جگا رہی تھی۔ اٹکھیلیاں کرتے پرندوں کے غول در غول کبھی آسمان کے اوپر دائروں میں گردش کرتے اور کبھی گن گاتے نیچے کا رخ کرتے جیسے اپنے رب کی پاکی بیان کررہے ہوں کہ اللہ نے اتنے گرم اور تابنے کی طرح تپتے آسمان پر بادل اور ٹھنڈی ہوا گویا کسی پردیس سے سفر کرتی ان کے دیس میں بھیج دی ہو۔
رنگ برنگی پروں والی تتلیاں پھولوں کا رس نچوڑ کر پھر سے اڑ رہی تھیں۔ پھولوں کی شاخیں ہوا کے زور سے اوپر نیچے ہورہی تھیں جیسے سجدہ شکر ادا کررہی ہوں۔ یکدم بارش کے قطرے دھرتی کے بنجر سینے میں پیوست ہونے لگے۔ آناً فاناً بارش شروع ہوگئی۔
سحر کالج سے دوپہر کے ڈھائی بجے آئی۔ کھانا کھا کر ستانے لگی کہ اس کی آنکھ لگ گئی جب بارش کی ٹھنڈی اور نرم بوندیں اس کی عقب والی کھڑکی سے ٹکراتی ہوئیں اندر آنے کی جسارت کرنے لگیں تو یکدم سحر کی آنکھ کھل گئی۔ تیز ہواؤں کے ساتھ بارش کی موٹی موٹی بوندیں دروازے کے اندر پختہ فرش پر گررہی تھیں۔ کچھ بوندیں اس کے بالوں میں موتیوں کی طرح گرنے لگیں۔ تو اس نے ہڑبڑا کر آنکھ کھولی۔ بارش تو اسے شروع سے پسند تھی۔ اپنے کمرے سے نکل کر باہر برآمدے میں آکر کھڑی ہوگئی۔
جہاں اس کے چھوٹے بہن بھائی نائلہ اور حماد بارش میں پہلے سے کھیل رہے تھے کچھ دیر تو سحر دونوں کی چھیڑ چھاڑ سے محظوظ ہوتی رہی۔ پھر نائلہ نے پکارا۔
''آیئے نا سحر باجی' آپ بھی ہمارے ساتھ بارش انجوائے کریں۔ آپکو تو ایسا موسم بے حد پسند ہے۔''
ابھی وہ سوچ رہی تھی بارش میں بھیگے یا نہیں اتنے میں کچن سے امی کی آواز آئی۔ سحر اٹھ گئی ہو تو ذرا میرے ساتھ کام میں ہاتھ ہی بٹادو۔ ماں کی آواز پر وہ پیچھے مڑی اور برآمدے کے ساتھ بنے

کچن کا رخ کرنے لگی۔ جہاں خورشید بیگم رات کے کھانے کے لیے ترکاری بنا رہی تھیں۔ کافی دیر کھڑے رہنے سے ان کا سانس پھول چکا تھا۔

ویسے بھی وہ شوگر کی مریضہ تھیں۔ سحر نے امی کو آرام کرنے کا کہا اور خود جلدی جلدی کھانا بنانے لگی۔

''اور ہاں سنو سحر...... کھانے کے ساتھ کوئی میٹھا بھی بنا لینا...... نائلہ اور حماد شوق سے میٹھا کھاتے ہیں اور ویسے بھی اس بھیگے موسم میں میٹھا کھانے کو جی چاہتا ہے۔'' خورشید بیگم اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولیں۔

''لیکن امی میٹھا آپ کی صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔ آپ کو یاد ہے ناں' پچھلے دنوں آپ کی شوگر کتنی ہائی ہو گئی تھی۔ آپ اپنی صحت کا بالکل خیال نہیں رکھتیں۔ ڈاکٹر نے سختی سے آپ کو میٹھا کھانے سے منع کیا ہے۔ میں میٹھا بنا دوں گی۔ لیکن آپ بالکل نہیں کھائیں گی۔

''ذرا جلدی ہاتھ چلاؤ رات کے آٹھ بجنے والے ہیں۔ لائٹ کا کچھ پتہ نہیں ایسے موسم میں تو ان بجلی والوں کو بس بہانہ چاہیے ہوتا ہے' بجلی بند کرنے کا۔'' وہ بولتی ہوئیں اپنے کمرے میں چلی آئیں۔ ابھی لیٹنے ہی لگی تھیں کہ وہی ہوا جو انہوں نے ایک منٹ پہلے کہا تھا۔ پورا علاقہ تاریکی میں ڈوب گیا۔ ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اتنے میں نائلہ ٹارچ لیے امی کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ حماد بھی ساتھ بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر تک سحر نے کھانا چن دیا۔ سب ٹارچ کی مدھم روشنی میں کھانا کھانے لگے۔

''سحر تمہاری پڑھائی کیسی جا رہی ہے۔''

''امی پڑھائی تو ٹھیک جا رہی ہے۔ پیپرز تو ٹائم پر ہوں گے۔ بس آج کل ہر کوئی ایک دوسرے سے نوٹس مانگ کر بنانے کے چکر میں ہے۔ اپنا دماغ تو کوئی استعمال ہی نہیں کرتا۔ پتہ نہیں یہ لوگ امتحان میں کیا کریں گے۔'' سحر نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے بولی۔

''اللہ سب بچوں کو ہدایت دے۔'' خورشید نوالہ توڑتے ہوئے بولیں۔ پھر سحر نے بھی نائلہ اور حماد کی پڑھائی کے بارے میں اُن سے پوچھا۔

☆......☆......☆

فضیلت بیگم روزانہ رات کے وقت تہجد کے لیے اٹھتی تھیں۔ آج بھی وہ تہجد کی نیت سے اٹھیں۔ صحن میں قدم رکھا تو ٹھنڈی ہوا کے جھونکے انہیں خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ وضو کر کے جائے نماز بچھا کر نیت باندھنے ہی لگی تھیں کہ باہر گلی سے فائر کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔ ڈر تو وہ گئی تھیں آخر کو ایک عورت تھیں اور دل کی مریضہ بھی تھیں۔ لیکن انہوں نے ہمت نہ ہاری۔ کمرے میں آ کر گلی کے باہر کھلنے والی کھڑکی سے جھانکنے لگیں۔ شراب کے نشے میں دھت کچھ لڑکے نعرے لگا رہے تھے اور ساتھ ہوائی فائرنگ بھی کر رہے تھے۔ اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں انہوں نے ان لڑکوں کو پہچان لیا ان میں سے دو تو حال ہی میں جیل کاٹ کر آئے تھے۔

''ذرا دیکھو تو جیل سے رہا ہو کر پھر وہی کرتوت......''

وہ شہادت کی انگلی ہونٹوں پر رکھتے ہوئے خود کلامی میں بولیں۔

''اور یہ تیسرا لڑکا تو اپنا ہدایت اللہ صاحب کا بیٹا معلوم ہوتا ہے اچھا خاصا پڑھا لکھا نوجوان معلوم ہوتا ہے۔ اس کی امی تو اپنے بیٹے کے بہت گن گاتی ہیں۔ ماشاء اللہ سے حافظِ قرآن ہے مگر

برے دوستوں کی صحبت نے اسے بھی برا بنا دیا ہے ۔ والدین اس کے پاؤں میں رسی باندھ دیں مطلب کہ شادی کر دیں تو کافی حد تک سُدھر سکتا ہے۔ کچھ دور جا کر ان لڑکوں نے پھر فائرنگ کی۔ اب کی بار چوکیدار بھی چوکنا ہو گیا تھا۔ تو وہ لڑکے دم دبا کر بھاگ نکلے اور فضیلت بیگم برآمدے کی طرف آئیں اور پہلے سے بچھی جائے نماز پر اللہ اکبر کہتی نماز کی نیت سے کھڑی ہو گئیں۔ بہت ہی ملنسار خاتون تھیں نماز انہوں نے کبھی قضا ہی نہیں کی تھی۔ سفر میں ہوں یا بیماری میں اٹھنے کی سکت نہ ہوتی تو بیٹھ کر پڑھتیں۔ اور یہ اسلامی طور طریقے انہوں نے اپنے خاندان کے بچوں اور اپنے پوتے میں بھی ڈال دیے تھے۔ ایک حج کیا تھا اور دوسرا کرنے کی خواہش تھی۔ اکثر اوقات خاندان کا کوئی فرد بیمار ہوتا تو پانی یا چینی دم کر کے دیا کرتی تھیں۔ تہجد سے فارغ ہو کر وہ جائے نماز پر بیٹھی رہیں۔

اتنے میں فجر کی اذان شروع ہو گئی۔ پھر وہ نماز پڑھ کر ہی اٹھیں۔ باری باری سب کے دروازے کھٹکھٹانے لگیں۔ ایک کمرے میں ان کا بیٹا وقار اور بہو ساجدہ بیگم سو رہے تھے۔ دوسرے کمرے میں ان کا پوتا بلال سو رہا تھا۔ سب کو اٹھانے کے بعد وہ قرآن کی تلاوت کرنے لگیں۔ صبح کے چھ بجے محلے کے بچے قرآن پڑھنے آ جاتے۔ وہ کافی عرصے سے صدقہ جاریہ کے طور پر قرآن پڑھاتی رہی تھیں۔ اپنے پوتے بلال کو بھی انہوں نے قرآن پڑھایا تھا اور نصیحت کرتی رہتی تھیں۔

''بیٹا دنیا میں نام صرف اللہ کا ہے۔ وہ سب دیکھ رہا ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے۔ ہم اچھے کام کریں۔ مخلوق خدا کی خدمت کریں۔ کسی کی حق تلفی نہ کریں۔ کسی بے گناہ کی جان نہ لیں۔ کیونکہ اس روئے زمین پر کسی بے گناہ کے خون کا ایک قطرہ سب مخلوق پر بھاری ہوتا ہے۔'' بلال دادو کی باتیں غور سے سنتا اور اُن پر عمل کرنے کی بھی کوشش کرتا۔ اسی لیے تو نماز کا پابند تھا اور ہر کسی کی مدد کرنے کو تیار رہتا تھا۔

رات کی ہونے والی بارش کی وجہ سے صبح بڑی خوشگوار تھی۔ گرمی اور حبس کا زور تقریباً ٹوٹ چکا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ آکاش پر اب بھی کچھ سرمئی پرندے اور بھورے بادل ہوا کی لہروں پر دوڑتے جا رہے تھے۔

وقار صاحب بھی جلدی سے تیار ہو کر اپنے آفس کے لیے روانہ ہو گئے وہ ایک پرائیویٹ کمپنی میں پچھلے چھ سال سے کام کر رہے تھے۔ بلال نے بھی دو توس چائے کے ساتھ کھائے۔ اپنی بکس ہاتھ میں تھامی' دادو کے پاس آیا۔ انہوں نے اپنے لاڈلے پوتے پر کچھ پڑھ کر دم کیا اور صحت و زندگی کی دعا دی۔ پھر اپنی امی جو گھر کی دیکھ بھال کرتی تھیں ان کو اللہ حافظ کہتا باہر پورچ میں کھڑی بائیک اسٹارٹ کرنے لگا۔ بائیک چلاتے ہوئے اُس کا خیال بار بار اُس خوبرو حسینہ کی طرف مائل ہو رہا تھا۔ کالج پہنچا تو وہ پہلے سے موجود تھی اور اتفاق ایسا ہوا کہ اس لڑکی کی بھی بلال پر نظر پڑی۔

بلال نے آتے ہی سلام کیا اور بک اس لڑکی کے حوالے کرنا چاہی۔ لیکن اس نے لینے سے انکار کر دیا اور کہا۔

''ہو سکے تو آپ اِسے کاؤنٹر پر ہی جمع کروا دیجیے۔'' بلال بہت بہتر کہتا ہوا وہاں سے جانے لگا تو چند قدم چل کر پھر واپس آیا اور بولا۔

''محترمہ اس کتاب پر آپ کے گھر کے کسی

فرد کا فون نمبر لکھا ہے۔" بلال نمبر دکھانے لگا۔
"او...... ہاں...... یاد آیا...... یہ میری سہیلی کا نمبر ہے۔ کل اچانک اُس کا فون رہ گیا تھا۔ اُس نے اپنا نیو سیل نمبر لکھنے کو کہا تھا۔ اور میں نے جلدی میں اس پر وہ نمبر لکھ دیا تھا۔ آپ کا بہت شکریہ۔"
"میرا نام بلال ہے اور میں بی ایس سی شوسیالوجی میں ہوں۔ یہ میرا لاسٹ ایئر ہے اور آپ......؟" وہ کچھ لمحے خاموش رہی۔ پھر لبوں پر مسکان سجائے بولی۔
"اتفاق سے میں بھی اسی سبجیکٹ میں بی ایس سی کر رہی ہوں۔ دو دن ہوگئے ہیں مجھے کلاس جوائن کیے اور اب آپ میرا نام پوچھیں گے پھر سیل نمبر کی باری آئے گی۔ پتہ نہیں آج کل کے لڑکوں میں یہ وائرس کہاں سے آیا ہے کہ لڑکی کو بے وقوف بنانا ہو تو بڑے نرم لہجے میں سب پوچھ لیتے ہیں......اور جب دل بھر جائے تو......"
بلال ہنسنے لگا۔ اور بات کاٹتے ہوئے بولا۔
"ٹھیک ہے محترمہ آپ نہ بتانا چاہیں تو آپ کی مرضی ویسے آپ ہماری کلاس جوائن کر چکی ہیں یہ تو رسمی سی بات ہے۔ جس میں آپ کی خوشی' ویسے میں ایسا نہیں ہوں جیسا آپ مجھے سمجھ رہی ہیں۔"
"ٹھیک ہے مان لیتی ہوں مجھے سحر کہتے ہیں اور اب گھر کا ایڈریس مت مانگیے گا۔" دونوں ہنستے ہوئے لائبریری کا زینہ عبور کر کے اندر داخل ہوگئے۔ یوں دونوں میں بے تکلفی بڑھتی گئی اور بات اُس نازک اور حساس جذبے کی طرف جا پہنچی جہاں دنیا کے سارے ثبوت ہار جاتے ہیں۔ لیکن وہ خود ہار کر بھی جیت جاتی ہے۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی قندیلیں ہمیشہ کے لیے روشن کر جاتی ہے۔

وہ دونوں ایک دوسرے کو پا کر بہت خوش تھے۔
وقار صاحب کے ہاں پچھلے چار دن سے ان کی چھوٹی بہن اپنے بھائی سے ملنے کراچی آئی ہوئی تھی۔ ان کی سہیلی کی شادی تھی اور ارم نے خاص طور پر ذکیہ کو شادی پر آنے کا کہا تھا۔ اس لیے ذکیہ اپنی تمام گھریلو مصروفیات سے وقت نکال کر یہاں آئی تھی۔ چار دن رہ کر آج ان لوگوں نے واپس جانا تھا۔ لیکن جانے سے پہلے بچوں نے ضد لگا رکھی تھی کہ ہم نے آئس کریم کھانی ہے اور وہ بھی بلال بھائی کے ساتھ بائیک پر۔
آخر کار بلال کو ہار ماننی پڑی اور وہ آئس کریم کھلانے لے گیا واپسی پر کچھ شاپنگ بھی کروا دی۔ فضیلت بیگم اپنے نواسوں کے وارے جاتی رہیں اور کامیاب زندگی کے لیے ڈھیر ساری دعائیں دیں۔ جانے سے پہلے دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے کے گلے لگیں۔ امی آپ میرے گھر ضرور آیئے گا۔ اور زیادہ دن ٹھہریے گا میرا تو دل ہی نہیں بھرا اور واپس جانا پڑ رہا ہے وہ آنکھوں میں آنسو لیے ماں سے لگی کھڑی تھی۔
فضیلت بیگم نے اپنے سفید دوپٹے کے پلو سے بھیگی آنکھیں صاف کیں اور کہنے لگیں۔
"بیٹی تو پرایا دھن ہوتی ہے آج بچوں والی ہوگئی ہے پھر بھی یوں لگ رہا ہے جیسے آج رخصت کر رہی ہوں۔ واہ مولا...... کیا کیا رنگ محبت کے ہیں۔" انہوں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ان کی آنکھیں ایک بار پھر نم ہوگئیں۔ بلال انہیں سہارا دے کر اندر لے گیا۔ کار کراچی اسٹیشن پر رکی تو ٹرین آنے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ ان لوگوں نے نوابشاہ کے ٹکٹ لیے۔ اسٹیشن پر کافی گہما گہمی تھی۔

کچھ گاڑیاں پلیٹ فارم پر کھڑی تھیں اور کچھ اپنے مقررہ وقت پر چلنے کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ اتنے میں مانیٹرنگ روم سے اعلان ہوا کہ ٹرین روانگی کے لیے تیار ہے۔

ٹرین نے وسل دیا اور ہولے ہولے پہیے گھماتی اپنے سفر کے لیے روانہ ہونے لگی۔ وقار اور ساجدہ نے ہاتھ لہرائے۔

جیسے ہی ان کی کار شہر کی مشہور و معروف شاہراہ پہنچی' ایک زوردار دھماکہ ہوگیا اور کسی کو کسی کا ہوش نہ رہا۔ ہر طرف خون اور لاشوں کے اعضا بکھر گئے ایک آہ و پکار شروع ہوگئی۔ ایمبولینسیں آئیں لاشوں اور زخمیوں کو اٹھانے لگیں۔ وقار اور ساجدہ کے سر میں چوٹیں آئیں' گاڑی کے شیشے دونوں کے جسموں میں پیوست ہوگئے۔ اور کافی سارا خون بہہ جانے سے دونوں موقع پر ہلاک ہوگئے۔ اسپتالوں میں قیامت صغریٰ برپا تھی۔ لوگ اپنے پیاروں کو پوچھنے آرہے تھے۔ لاشوں کو سردخانوں میں رکھ دیا گیا۔

بلال نے جیسے ہی شام کو وقت گزاری کے لیے ٹی وی آن کیا تو دھماکے کی بریکنگ نیوز دیکھ کر اس کا دل دہل گیا۔ جو لوگ ہلاک ہوچکے تھے ان کے ناموں کی پٹی چل رہی تھی۔ وہ آناً فاناً اسپتال پہنچا۔ بلال نے اپنے والدین کو پہچان لیا۔ جن کی لاشیں سفید کپڑے میں لپٹی ہوئی تھیں ۔ ایدھی والوں نے لاشیں گھر پہنچادیں۔ فضیلت بیگم جو پہلے ہی دل کی مریضہ تھیں اپنے اکلوتے بیٹے کی لاش یوں خون میں لت پت دیکھی تو برداشت نہ کرسکیں اور تیورا کر زمین پر گر پڑیں۔

بلال ایک ساتھ تین لاشیں دیکھ کر نیم پاگل ہوگیا۔

یکدم یہ کیا ہوگیا۔ جہاں کچھ دیر پہلے قہقہوں اور مسکراہٹوں کے تبادلے ہورہے تھے۔ وہاں اب صرف آنسو تھے۔ مصائب اور مشکلات تو زندگی کا حصہ ہوتی ہیں۔ جہاں قدم قدم پر انسان کو نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ جب کوئی صبر دینے والا نہ رہے تو رحمت کا فرشتہ دروازے پر صرف ایک دفعہ ہی آتا ہے۔ کس نے کفن دفن کا انتظام کیا اور کس نے قبر کھودی۔ بلال کو کوئی ہوش نہ تھا۔

گھر کے سناٹے اور ویرانی سے اسے وحشت ہونے لگتی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگ جاتا۔ کون تھا جو اسے سہارا دیتا۔ اس کے آنسوؤں کو اپنے دامن میں بھر لیتا۔ اس عظیم سانحے نے اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی موقف کردی تھی۔ وہ دادو کے لیے روتا تو والدین کا مسکراتا چہرہ اس کی پلکیں بھگو دیتا۔ وہ شفیق ہستی جنہوں نے اسے پالا پوسا تھا۔ دنیا کی ہر آزائش اسے مہیا کی تھی۔ اسے کامیاب زندگی گزارنے کے لیے گر سکھائے تھے مگر وہ اب تنہا تھا بالکل تنہا......

اسے کوئی سہارا چاہیے تھا۔ مضبوط اور لمس سے بھرپور' اور ایسے وقت میں وہی لوگ کام آتے ہیں جو اپنے ہوتے ہیں۔ اور اپنے ہونے کا حق ادا کرتے ہیں۔ جن کے دل میں دوسروں کے لیے محبت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے اور وہ نرم و لطیف انداز گفتگو کی مالک سحر تھی۔ جیسے اپنے محبوب کے کرب کا احساس تھا۔ اور وہ اس کے غم میں برابر کی شریک تھی۔

لیکن شاید سحر کی توجہ طلب محبت بھی بلال کے رویے کو نہ بدل سکی فرحان اور قیصر بھی اسے سمجھاتے اور حوصلہ دینے کی کوشش کرتے۔ لیکن وہ ہر ایک سے اُلجھتا اور کاٹ کھانے کو دوڑتا۔

ایک گرم دن سحر کالج سے دوپہر کے دو بجے چھٹی کر کے سیدھا بلال کے گھر آگئی۔ وہ اس کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتی تھی۔

بلال کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا سحر کی تو اس دن سے ہی بھوک مر گئی تھی۔ گھر میں چپ اور اُداس رہتی۔ سحر کی امی خورشید بیگم جانتی تھیں کہ سحر بلال کی وجہ سے پریشان ہے۔ وہ بیٹی کو حوصلہ دیتیں اور ہمت باندھتے ہوئے کہتیں۔

''اگر تم نے ہمت ہار دی اور یوں گم صم بیٹھی رہی تو بلال کی ڈھارس کون بنے گا۔ سحر امی کی باتوں کو غور سے سنتی اور مثبت انداز میں سوچنے لگ پڑتی۔ خورشید بیگم جانتی تھیں کہ بلال کے گھر والوں کے ساتھ بہت برا ہوا ہے۔

سحر پچھلے ایک ماہ سے بلال کے گھر آ رہی تھی آج بھی وہ پہلے سے کھلے گیٹ کو پا کر اندر آ گئی۔ دبے قدموں سے اندر داخل ہوئی تو ایک عجیب سناٹا اور ویرانی اس کی منتظر تھی۔ کسی کے دکھ کا اندازہ اس کی آنکھوں میں ڈوب کر ہی لگایا جا سکتا ہے کمرے میں جوں ہی قدم رکھا بلال پر نظر پڑی۔ جو زندگی سے بیگانہ اور اپنے خیالوں میں مست تھا۔ کمرے کی ہر چیز بے ترتیب تھی۔ جیسے کمرہ نہ ہوا کوئی کباڑ خانہ ہو گیا۔ سحر اس کے پاس کارپٹ پر دوزانو ہو کر بیٹھ گئی۔

کچھ دیر خاموشی سے بلال کے ویران چہرے اور سوجھی آنکھوں کو دیکھتی رہی پھر اپنی ٹھوڑی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے آہستگی سے اس سے مخاطب ہوئی۔

''بیشک تمہارے ساتھ بہت برا ہوا ہے۔ اس سانحے پر جتنے بھی اشک بہائے جائیں اور جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ لیکن بلال مرنے والوں کے ساتھ مرا تو نہیں جاتا نا۔ تم خود کو سنبھالو' یہ گھر اور اس گھر میں ہر وہ چیز جو قرینے سے رکھی ہوئی ہے تمہارے مرحوم والدین کی نشانی ہے۔ میں تمہیں اس طرح افسردہ دیکھتی ہوں تو دل پھٹ جاتا ہے۔ تم باہر نکلو لوگوں سے میل جول رکھو۔''

''گھر کی چار دیواری میں یوں قید رہو گے تو ذہنی مریض بن جاؤ گے کیا تمہیں اپنی زندگی عزیز نہیں ہے۔'' سحر کی باتیں بلال کے دل میں اترنے لگیں۔ گرم گرم آنسوؤں سے اس کی انگلیاں گیلی ہو چکی تھیں۔ اس نے بھیگی پلکیں صاف کیں پھر بولا۔

''لیکن سحر میرے والدین اس دھماکے میں کیوں مارے گئے؟ ان کا کیا قصور تھا۔''

''اِس میں تمہارے والدین کا کوئی قصور نہیں تھا۔ لیکن انہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ اور جو بے گناہ شہری مارے گئے اُن کا بھی کوئی قصور نہیں تھا۔ اس لیے اس کو اللہ کی رضا سمجھ کر قبول کر لو کہ یہی زندگی ہے۔''

''اگر یہی زندگی ہے تو میں اس زندگی پر لعنت بھیجتا ہوں۔ یوں جینے سے تو بہتر ہے انسان مر جائے۔'' بلال نچلے ہونٹ کا گوشہ کاٹتے ہوئے بولا۔

''مایوسی کی باتیں مت کرو تمہیں اپنی ضرورت نہیں لیکن ہم سب کو تمہاری ضرورت ہے۔ تمہاری معصوم مسکراہٹ اور ہنستا چہرہ دیکھنے کو سب بے تاب ہیں۔ تمہیں کالج گئے ایک ماہ ہو گیا ہے تمہاری پڑھائی کا کتنا حرج ہو رہا ہے۔ کچھ اندازہ ہے تمہیں۔ کیوں خود کو اذیت دینے پر تلے ہو۔'' سحر نے بلال کا کندھا چھوا اور اس کی ویران آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

''تم بس مجھے میرے حال پر چھوڑ دو اور جاؤ یہاں سے مجھے تمہاری تسلی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' بلال اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

سحر اسے سمجھا سمجھا کر تنگ آ چکی تھی۔ وہ پچھلے

ایک ماہ سے اسے زندگی کی طرف لانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے بلال کے حق میں دعا کی اپنا کالج بیگ اٹھایا اور گیٹ سے باہر آ گئی۔

پیاس سے سحر کا حلق خشک ہو گیا تھا۔ اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی لیکن دور دور تک سناٹا تھا۔ آج دو ماہ بعد ہوا خوری کے بہانے وہ گھر سے نکل کر باہر آیا تھا۔

بلال نے ایک نظر اُٹھا کر آسمان کی وسعتوں کو دیکھا اور سوچنے لگا۔ جس طرح اڑتے پرندوں کی زندگی کا کوئی نصب العین نہیں ہے کہ صبح کب اٹھنا ہے اور رات کہاں بسر کرنی ہے۔ جن کا کام بس دور ویرانوں میں بیٹھنا ہے اور اپنے لیے ہر طریقے سے رزق تلاش کرنا ہے۔ بالکل اسی طرح میری زندگی ناسور بن چکی ہے۔ نا کوئی امید نا آس......

چلتے چلتے ایک پتھر اس کے پاؤں میں آ گیا اور وہ گرتے گرتے بچا کسی اجنبی نے سہارا دے کر اُسے کھڑا کر دیا۔

''ہمیں راہ میں یوں ہی چلتے کتنے اجنبیوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ لیکن ہم یہ نہیں جان سکتے کہ اُن اجنبیوں میں کوئی ایک ایسا ہو گا جو کل کو ہماری زندگی تو کیا ہماری تقدیر ہی بدل دے گا۔'' وہ سہارا دینے والا اجنبی کون تھا۔ بلال اپنے ہوش میں ہوتا تو پتہ چلتا' ہوش تو اُسے تب آیا جب وہ راہ چلتا اجنبی بلال کے گریبان کو جھنجوڑ رہا تھا۔

''اے تُو نے میرے پیسے چرا لیے اگر میں تجھے سہارا نہ دیتا تو یہ خطرناک پتھر تیرے دماغ میں لگ جاتا اور اسی لمحے تُو زندگی ہار دیتا۔'' وہ اجنبی اپنی بڑی بڑی لیکن بے کیف آنکھیں نکالتے ہوئے بولا۔

''مگر بھائی میں آپ کی چوری کیونکر کروں گا۔ میرے پاس ہے ہی کیا' آپ بیشک میرے کپڑوں کی تلاشی لے لیں۔'' بلال اپنا آپ پیش کرنے لگا۔

''تیری تلاشی تو اب تیرا باپ لے گا۔ ذرا تھانے تو چل' ایک منٹ میں سب دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔'' وہ لڑنے پر اتر آیا۔

باپ کا نام سن کر بلال کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ باپ کا نام مت لو۔''

اجنبی جس کا نام شیر دل تھا۔ جس کی موٹی سرخ انگارہ آنکھیں تھیں۔ ان آنکھوں میں غضب و وحشت کی آگ جل رہی تھی۔ بڑی مونچھوں کا جال اس کے چہرے کو مزید غضب ناک بنائے ہوئے تھا۔ دونوں کو یوں لڑتا دیکھ کر آس پاس کے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ بلال کے کچھ کہنے سے پہلے ہی شیر دل نے اس پر جھوٹا الزام لگا کر سب لوگوں کو بتا دیا کہ اس نے میری جیب سے پیسے نکالے ہیں اور اب واپس نہیں کر رہا۔''

وہ بلال کو کھینچتا قریبی تھانے لے گیا۔ اور بلال کے خلاف چوری کا جھوٹا مقدمہ لکھوا دیا۔ مقدمہ کیسے نہ لکھا جاتا شیر دل کے ساتھ چند لوگ اور تھے جن کو بہلا پھسلا کر اس نے اپنے ساتھ کر لیا تھا۔ اور بلال تنہا جس کے ساتھ پہلے دادو کی دعائیں ہوتی تھیں۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ وہ چیختا رہا کہ میں بے گناہ ہوں میں ایک شریف انسان ہوں۔

پیسہ بے شک زندگی کی اہم ضرورت ہوتا ہے۔ مگر اس کی خاطر ضمیر بیچنے والا بہت ہی بڑا بدقسمت ہوتا ہے۔ لیکن کسی نے اس کی سچائی پر کان نہ دھرے۔ اور جیل میں بند کر دیا گیا پہرے دار بھی شیر دل کا کھا رہے تھے۔ جیسا وہ کہتا پہرے دار بھی ویسا ہی کرتے۔ اسے دو وقت کی

روٹی مشکل سے مل رہی تھی۔
دو دن میں بلال کی حالت بیماروں جیسی ہوگئی۔ داڑھی بڑھ گئی۔ زرد آنکھیں اور ان کے نیچے سیاہ حلقے ڈیرے جما چکے تھے۔ لیکن کسی کو اس کے دل کا کیا پتہ تھا کہ اس کے دل پر کیا قیامت گزر چکی ہے اور اب یہ نئی مصیبت۔ وہ چٹائی پر سر رکھ کر سوتا تو اسے ماں اور دادو کی سکون بھری گود یاد آجاتی۔ جو اپنی دل نواز باتوں سے بلال کو پیار کرتی تھیں اور اس کا سر سہلاتی تھیں۔
اسے یوں روتا دیکھ کر جیل میں ایک بزرگ قیدی اس کے پاس آیا۔ اس کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔ اور رونے کا سبب پوچھنے لگا۔ پہلے تو بلال نے کچھ نہ بتایا۔ لیکن بات انسانوں سے ہی کی جاتی ہے۔ بلال کو خیال آیا ہوسکتا ہے یہ بزرگ اس کی کوئی مدد کرسکیں۔ یا اس کا دکھ بانٹ سکیں بلال نے اپنے آنسو صاف کیے اور سارا ماجرا گوش گزار کردیا۔ وہ بزرگ قیدی کچھ لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔
"دیکھو برخوردار مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ میں بھی اس جیل میں تمہاری طرح مجبور اور بے بس پڑا ہوں۔ بعض اوقات زندگی محض سایہ ہوتی ہیں جن میں دھوپ کا شائبہ نہیں ہوتا۔ لیکن تمہیں ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔"
یہ لوگ قیدیوں کو چند دن جیل میں رکھتے ہیں پھر کسی نہ کسی ضمانت پر رہا کردیتے ہیں۔"
"ضمانت......؟"
"کیسی ضمانت؟ لیکن میرے پاس تو کوئی ضمانت نہیں۔ میرے تو والدین بھی اس دنیا میں نہیں رہے۔ کون میرے پیچھے آئے گا اور مجھے لوہے کی ان موٹی سلاخوں سے باہر نکالے گا۔" بلال نے افسردہ لہجے میں کہا۔ بزرگ قیدی ہنسا اور ہاتھ کے اشارے سے کہنے لگا۔
"یہ دیکھ رہے ہو اس قیدی کو......" وہ قیدی جیل کے ایک کونے میں بیٹھا تھا۔
"اس کو تین دفعہ ضمانت پر رہائی ملی۔ لیکن پھر بااثر لوگ اس پر جھوٹا الزام لگا کر اسے پھر سے جیل کی ہوا کھانے کے لیے بھیج دیتے ہیں۔"
"مگر کیوں؟" بلال حیران ہوا۔
"تم بہت سیدھے سادھے ہو۔ وہ اس لیے کہ یہ سب لوگ جن کے جسموں پر قانون کی وردیاں تم دیکھ رہے ہو یہ حلال کمائی سے نہیں بلکہ حرام کمائی سے سجائی گئی ہیں۔ یہ لوگ رشوت کھاتے ہیں...... رشوت...... کیا سمجھے۔" وہ بزرگ قیدی بلال کے کانوں کے پاس جا کر سرگوشی کے انداز میں بولے۔
"لیکن بابا جی رشوت دینا اور دینا دونوں حرام ہیں۔ اللہ تو ایسے بندے کو معاف نہیں کرتا۔ پھر یہ لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں۔"
"ایسا نہ کریں تو ان کا دھندا کیسے چلے......"
"دھندا...... میں کچھ سمجھا نہیں۔"
"دیکھو بیٹا دن کو یہ لوگ ڈیوٹیاں دیتے ہیں اور راتوں کو انہی پیسوں سے مجرے سننا' شراب' ملک میں لوٹ مار' تخریب کاری اور سٹے بازیاں کرتے ہیں۔" بلال یہ سب سن کر حیران رہ گیا۔ اُس نے تو ایسی چیزوں کے نام آج پہلی بار سنے تھے۔
"تو کیا آپ بھی ایسی ہی ضمانت پر رہا ہوتے ہیں۔" بلال نے پوچھا۔
"بیٹا میں تم سے ایک دن پہلے یہاں آیا ہوں اب دیکھو یہاں سے کون مہمان بن کر پہلے نکلتا ہے' میں' تم اور وہ قیدی جو اپنی سوچوں میں گم ہے۔" بزرگ قیدی بلال کو سمجھا بجھا کر اپنی چٹائی

پر جا کر لیٹ گیا۔ اور بلال دیر تک بزرگ قیدی کی باتوں کو سوچتا رہا جس کا کردار مجرمانہ ہو وہ قیمتی اور خوبصورت لباس میں بھی ننگا سا لگتا ہے۔ باہر سپاہی نے سیٹی بجائی تو بلال سر کے نیچے بازو کا تکیہ بنا کر دائیں کروٹ پر لیٹ گیا۔ اور دھیرے دھیرے نیند کے بھنور میں ڈوب گیا۔

''السلام علیکم! انسپکٹر صاحب...... کیا حال چال ہیں؟''

ایک بھاری بھرکم جسم کا مالک مرد جس کی گہری سیاہ مونچھوں میں ایک دو سفید بال تھے۔

ان سیاہ گھنی مونچھوں پر اُس نے خوفناک تاؤ دیے ہوئے تھے۔ اس کی مونچھیں ایسی نوکیلی اور ناک کی طرف مڑی ہوئی تھیں جیسے دو بڑے بڑے سیاہ بچھو اپنے ڈنک اٹھائے بیٹھے ہوں۔ اور اس کی ناک ان دو سیاہ نوکوں کے درمیان مظلوم ہو۔ بڑی بڑی نمک پاروں جیسی آنکھیں جن میں آگ برس رہی تھی۔ منہ میں پان اور ہاتھوں میں موٹے نگوں والی دو انگوٹھیاں جن کو وہ اکثر چلتے پھرتے مروڑتا رہتا تھا۔ سفید کاٹن کا سوٹ اور پاؤں میں پشاوری چپل پہنے وہ تھانے کے اندر داخل ہوا۔ اس کی نگرانی پر مامور بندے کمرے کے باہر کھڑے رہے۔ ایک خاص بندہ جو الطاف میمن کے ہمراہ تھا۔ اس کے ساتھ اندر آیا۔

انسپکٹر امجد الطاف میمن سے بغل گیر ہوا۔ اور اپنی کرسی پیش کی جس پر وہ بیٹھا تھا۔

''ارے نہیں انسپکٹر صاحب کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔ میں اِدھر ہی ٹھیک ہوں۔'' الطاف میمن انسپکٹر امجد کے سامنے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''آپ کے لیے چائے منگواؤں......'' انسپکٹر امجد پوچھنے لگا۔ اور پھر دو کپ چائے منگوائی گئی۔ پھر چائے اور سگریٹ کا دور چلتا رہا۔ اُس خاص بندے نے الطاف میمن کے کان میں کچھ کھسر پھسر کی تب الطاف میمن اصل بات کی جانب آیا۔

''انسپکٹر صاحب آپ کی جیل میں چند دن پہلے چوری کے الزام میں ایک چوبیس سالہ نوجوان گرفتار ہو کر آیا ہے۔ ہم اس کی ضمانت کروانے آئے ہیں۔''

''اگر آپ اجازت دیں تو ہم اس کو ضمانت پر رہا کر کے اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں۔'' الطاف میمن نے سگریٹ پھونکتے ہوئے کہا۔

''ارے الطاف صاحب! یہ تھانہ آپ کا ہے اور یہاں جتنے بھی قیدی موجود ہیں سب آپ کے مہمان ہیں۔ اور پھر ضمانت کیسی اِدھر آپ کا حکم اور اُدھر سمجھیں کام ہو گیا۔'' الطاف میمن زور سے ہنسا۔ دائیاں ہاتھ زور سے میز پر مارا اور کہا۔

''جب کوئی فرض نماز توڑتا ہے اور غفلت کی چادر اوڑھ کر سوتا ہے تو لاقانونیت اور ظلم کا ہیولا جاگ اٹھتا ہے۔ اور انصاف یتیم بچے کی طرح کونے میں بیٹھ کر رونے لگتا ہے۔''

انسپکٹر امجد نے بیل بجائی اور سپاہی سے کہنے لگا۔

''تین چار دن پہلے جو چوری کے جرم میں ایک لڑکا گرفتار ہوا تھا اُسے لے کر آؤ۔''

''جی انسپکٹر صاحب...... بہت بہتر۔'' سپاہی حوالات کی طرف گیا۔ اور جیل کا تالا کھولنے لگا۔ اندر بلال چٹائی پر عصر کی نماز ادا کر رہا تھا۔ سلام پھیر کر اس نے پہلے سب قیدیوں کے حق میں دعا کی بعد میں اپنے لیے دعا کرنے لگا۔ وہ بچپن سے لے کر آج تک پہلے سب کے لیے دعا کرتا تھا پھر آخر میں اللہ سے اپنے لیے مانگتا تھا اور یہی اعلیٰ اوصاف اس کی نس نس میں سما گئے تھے۔ اتنے

میں وہ سپاہی اندر آیا۔ اور کہنے لگا۔
"تم تینوں میں سے بلال کون ہے؟" بلال قمیض جھاڑتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور بولا۔
"جی میں ہوں بلال......"
"چل اوئے تیری ضمانت آئی ہے۔" یہ سن کر بلال کی آنکھیں خوشی سے روشن ہوگئیں۔ لیکن دوسرے ہی لمحے سوچنے لگا۔ میری ضمانت کون کرواسکتا ہے۔ مجھے تو یہاں کوئی جانتا نہیں ہے۔ ضمانت کا نام سن کر وہ بزرگ قیدی بلال سے بغلگیر ہوا۔ اور کہا۔
"چل بیٹا تیری تو لاٹری نکل آئی ہے۔ مزے سے باہر جا اور کھلی فضا میں سانس لے۔"
"لیکن بابا جی میری ضمانت کون کرواسکتا ہے۔" بلال ابھی تک شش و پنج میں مبتلا تھا۔
"میں نے تجھے کہا تھا ناں کہ یہاں یہ سب چلتا رہتا ہے۔ ڈھیر سارے پیسے ملے ہوں گے انسپکٹر صاحب کو، تبھی تو منہ میں اتنی چاشنی بھر آئی ہے کہ تمہارا نام لے کر پکارا جارہا ہے۔ جا میرے بیٹے اللہ تجھے اپنی حفظ و امان میں رکھے۔" بلال دونوں قیدیوں سے بغل گیر ہوا۔
اور چپل گھسیٹتے ہوئے جیل سے باہر آگیا۔ آخری نگاہ دونوں پر ڈالتے ہوئے جیسے کہہ رہا ہو اللہ تم دونوں کے لیے بھی کوئی نہ کوئی سبب ضرور پیدا کرے گا۔ بلال جیسے ہی انسپکٹر صاحب کے روم میں داخل ہوا۔ الطاف میمن پہلے ہی انسپکٹر امجد کی جیب کرارے نوٹوں سے گرم کرچکا تھا اور انسپکٹر امجد کی حریص نظریں ان نوٹوں کو دیکھنے میں محو تھیں۔ الطاف میمن نے جب بلال کو دیکھا تو کہا۔
"اچھا تو یہ ہے بلال...... شکل سے تو بڑا معصوم نظر آتا ہے۔" الطاف میمن اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور بلال کے مقابل کھڑا ہوتے ہوئے کہنے لگا۔
"کیوں اوئے شرم نہیں آتی تجھے چوری کرتے ہوئے۔"
"صاحب میں نے کوئی چوری نہیں کی تھی اللہ گواہ ہے۔ میں نے ایسا کبھی سوچا بھی نہیں۔"
"اچھا اب بس کر اور چل میرے ساتھ...... میں تجھے ضمانت پر رہا کر کے اپنے ساتھ لے کر جارہا ہوں، ورنہ ہمیشہ یہاں ہی سڑتا رہتا۔"
"شکل سے تو تُو چور ہی لگتا ہے اور کہتا ہے میں نے چوری نہیں کی۔" الطاف میمن رعب سے کہنے لگا۔ بلال جس کی داڑھی بڑھ چکی تھی۔ جسم کمزور ہوچکا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں، پاؤں میں بوسیدہ چپل تھی۔
"میں سچ کہتا ہوں میں نے ایسی گری ہوئی حرکت کبھی نہیں کی۔" بلال وضاحت دینے لگا۔
"اوہو...... الطاف صاحب کیوں بحث کرتے ہیں چھوڑیے ناں...... لیجیے اس پر سائن کردیں۔ اور اپنے مہمان کو اپنے سرائے خانے میں لے جائیں۔" انسپکٹر نے فائل الطاف کے آگے رکھ دی۔ الطاف نے ایک نظر بلال کو دیکھا اور دوسرے لمحے سائن کردیے۔ دونوں نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملائے۔ الطاف کے بندے بلال کو لے کر باہر آئے۔ جہاں کالے رنگ کی جیپ میں سب بیٹھ گئے۔
جیپ آہستہ سے اپنی جگہ سے سرکنے لگی۔ اور آناً فاناً گنجان آبادی کا سینہ چیرتی ہوئی ایک ویران علاقے میں داخل ہوگئی۔ اس وقت رات کے آٹھ بجے تھے۔ گرمی بدستور قائم تھی۔ سارا دن کی گرم ہوا اب قدرے ٹھنڈی ہوئی تھی۔ جیسے

ہر شے نے سکون کا سانس لیا ہو لیکن گھنٹے کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جیپ ایک حویلی کے گیٹ کے پاس جا کر رُکی۔

بلال کے لیے یہ جگہ بالکل نئی اور انوکھی تھی دور دور تک کھیت اور لہراتی فصلیں نظر آ رہی تھیں۔ کہیں سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ چوکیدار نے گیٹ کھولا۔ جیپ اندر داخل ہوگئی۔ بلال کا کندھا پکڑ کر اندر لایا گیا۔ حویلی کا اندرونی حصہ دیکھ کر بلال دنگ رہ گیا۔ ہر کمرہ ہی خوبصورت جاذب نظر تھا۔ رات کا کھانا کھا کر بلال کو جس روم میں بٹھایا گیا۔ اس میں سفید جھالروں والے سفید پردے ربن سے بندھے ہوئے تھے۔ جو کھڑکی کو محراب کی شکل دے رہے تھے۔

اس کے قریب ایک میگزین پڑا تھا۔ جس پر ایک حسینہ نائٹ گاؤن زیب تن کیے کھڑی تھی اور اُس کی نیلی آنکھیں جیسے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ سارا ماحول ایک دم جیسے بلال کو پُراسرار لگنے لگا تھا۔ حویلی میں ابھی تک اسے ایک ملازمہ ہی نظر آئی۔

جو کٹھ پتلی کی طرح اِدھر اُدھر کام کر رہی تھی۔ حویلی سے باہر خوفناک مونچھوں والے آدمی اسلحہ پکڑے پہرہ دے رہے تھے۔ یا پھر کسی لمحے کتے بھونک کر نحوست پھیلا رہے تھے۔ بلال یہ ماحول دیکھ کر سراسیمہ ہوگیا۔ آخر وہ بندے کہاں گئے جو مجھے یہاں تک لائے تھے۔ وہ بھاری بھرکم سرخ مخمل والے صوفے سے اٹھ کر اِدھر اُدھر جھانکنے لگا۔ پردوں کو چھوا پھر جہاز نما گلدان دیکھنے لگا۔ کافی دیر وہ انتظار کرتا رہا۔ اتنے میں وہی ملازمہ اندر آئی اور کہنے لگی۔

”صاحب جی آپ کو الطاف صاحب بلا رہے ہیں۔“ بلال ’اچھا‘ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”آپ میرے پیچھے آیئے میں آپ کو ان کے کمرے تک لے چلوں۔“ دوسرے لمحے وہ الطاف کی حویلی کے دوسرے بالا خانے کے کمرے میں موجود تھا۔ یہ کمرہ بھی اُس کمرے سے کچھ کم نہیں تھا۔ یہاں بھی ہر طرح کی آزمائش مہیا تھی۔

الطاف نے ایک لمحے کے لیے بلال کے جسم کو غور سے دیکھا پھر سگار سلگاتے ہوئے کہنے لگا۔

”تم نے کھانا کھا لیا ہے‘ اور اب آرام کرو۔ صبح ناشتے پر تفصیل سے بات ہوگی۔“

”تفصیل سے بات...... کیسی تفصیل......“ بلال کی آنکھیں پھٹ سی گئیں۔

”اوہو ایک تو تم سوال بہت کرتے ہو اور مجھے فالتو سوال کرنے والے لوگ بالکل پسند نہیں ہیں۔ تمہیں اب تک میری باتوں سے اندازہ ہو جانا چاہیے۔“ بلال ہلکا سا سر ہلا کر مڑنے لگا۔ تو الطاف نے سختی سے کہا۔

”خبردار یہاں کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی‘ میرے کارندے ہمہ وقت چوکس رہتے ہیں‘ یہ نہ سمجھنا کہ اس رات کی سیاہی میں تم بھاگو گے اور تمہیں کوئی پہچان نہیں پائے گا۔ اب تم جاؤ اور آرام کرو۔ اور صبح سات بجے ناشتے کی ٹیبل پر آ جانا۔“

بلال چلا گیا تو الطاف سگار کے دھوئیں کو گھورتے ہوئے کچھ سوچنے لگا ایک کمینی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر رقصاں تھی۔

آج اس نے پہلی دفعہ فجر کی نماز قضا کر دی تھی۔ شاید آج وہ کسی اور ڈگر پر چلنے والا تھا۔ یا قسمت اور زندگی اس سے دور جا رہی تھی۔ جب ذہن پر خوف اور مایوسی کے تاریک سائے چھا

جائیں تو درختوں سے چھن کر آنے والی روشنی بھی ظلمات میں چھپا ہوا آدمی بن کر دکھائی دیتی ہے۔

اچانک اسے الطاف کے رات والا جملہ یاد آ گیا کہ صبح سات بجے ناشتے کی ٹیبل پر آ جانا۔ وہ ہڑ بڑا کر اٹھا پورے سات بجے وہ الطاف میمن کی نظروں کے سامنے تھا۔ دونوں نے خاموشی سے ناشتہ کیا۔ بلال پوچھنا چاہتا تھا کہ اتنی وسیع و عریض حویلی میں آپ اکیلے رہتے ہیں یا کوئی اور بھی...... لیکن اُس کے لب ہلنے سے پہلے ہی منجمد ہو گئے۔ ملازم ناشتے کے برتن اُٹھا کر لے جا رہے تھے۔ الطاف نے نیپکن سے ہاتھ اور گھنی مونچھیں صاف کیں۔

اور ہاتھ کے اشارے سے بلال کو باہر گیراج میں لے آیا جہاں اس کے کارندے حکم کی تعمیل کرنے پہلے سے موجود تھے۔ یہ سب کیا تھا اُسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ ہر سو خاموشی چھائی تھی۔ جیسے کسی کے لب کشائی کے لیے کھلے تو بندوق کی گولیاں اس کے سینے میں اُتار دی جائیں گی۔ اور جیسے بولنا یا کچھ پوچھنا گناہ کبیرہ سمجھا جاتا ہو۔ جیپ ایک بار پھر سنسان راستے پر چلی جا رہی تھی۔

دورانِ سفر میں الطاف میمن نے بلال کے ساتھ کوئی بات نہ کی۔ تقریباً صبح کے نو بجے ہم ایک ویران اور اجڑی جگہ پر موجود تھے۔

ایک شخص نے جیپ کا دروازہ کھولا اور بلال کو پکڑ کر باہر لے آیا جیسے ہی اسے جیپ سے باہر نکالا اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس کے سامنے شیر دل ایک زہریلی مسکراہٹ لبوں پر سجائے کھڑا تھا۔ وہ شیر دل جس نے بلال پر چوری کا جھوٹا الزام لگایا تھا۔ اُس کے ساتھ اور بندے بھی تھے جو بلال کو پکڑ کر اندر لے گئے۔ جیسے میں مجرم ہوں اور سزا پانے کے لیے جا رہا ہوں۔

وہ بلال کو نیم تاریک گلی سے گزارتے ہوئے لے جا رہے تھے۔ بلال نے مڑ کر اس پھیکے چہرے کو دیکھا اسے خیال آیا کہ مجھے اس سے ضرور کچھ پوچھنا چاہیے کہ یہ سب کیا ہے...... اور مجھے یوں مجرموں کی طرح پکڑ کر کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ مگر وہ ہمت نہ کر سکا۔

ایک تاریک کوٹھڑی میں لا کر بلال کے ہاتھ باندھ دیے اور آنکھوں پر کالی پٹی باندھ دی کہ کچھ دکھائی نہ دے سکے۔ مگر وہ بہت سارے میلے کثیف کم عمر لڑکوں کو قطار در قطار وہاں کھڑا دیکھ چکا تھا۔

بدصورت مرد ان کے جسم پر تھپڑوں اور گھونسوں کی بارش کر رہے تھے۔ ان کے کنگھی سے نا آشنا بال کثیف پوشاک اور چہرے پر داڑھی کا گھنا جال' آنکھیں اور ہونٹ ریگستان کی طرح خشک تھے۔ بلال اُن کم عمر لڑکوں کا حال پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ لوگ اسے گھسیٹتے ہوئے کال کوٹھری میں لے گئے تھے۔ اور پھر بلال کو کوئی ہوش نہ رہا تھا۔

☆......☆......☆

دوسری طرف سحر بلال کے لیے حد درجہ پریشان تھی۔

''مانا کہ محبت کا کھو جانا زندگی میں خلل پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن اگر کسی انسان سے اس کی زندگی وفا نہ کرے تو مایوسی اور ناامیدی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔'' وہ پچھلے دو ماہ سے بلال کے گھر کے چکر لگا رہی تھی۔ اُس کی معصوم اور بھولی بھالی صورت سحر کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھی۔ وہ سوچا کرتی مجھے کچھ بتائے بنا بلال آخر کہاں

جاسکتا ہے۔ موبائل پر رابطہ کرتی تو وہ بھی آف ملتا۔ وہ بہت پریشان تھی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ بلال کے محلے کے لوگوں سے بھی پوچھا لیکن کسی نے بھی واضح جواب نہ دیا۔ اُس کی صاف شفاف آنکھوں سے فکر چھلکتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ کالج سے واپسی پر روز بلال کے گھر کا چکر لگاتی۔ لیکن یہاں نہ کوئی آس باقی رہی تھی نہ امید......

ایک دن اس کی امی خورشید بیگم پانی کا گلاس لیے اس کے پاس پلنگ پر بیٹھ کر اُسے دیکھنے لگیں۔ جس کے خاک آلود کالے بال زرد چہرہ اور بھیگی پلکیں ماں کا دل بیٹی کو دیکھ کر پسیج گیا وہ بولیں۔

''تمہاری شکل سے لگ رہا ہے کہ تم بہت تھک گئی ہو۔ ایسا کرو پولیس اسٹیشن میں مقدمہ درج کروادو۔'' سحر نے ٹھنڈا پانی حلق میں اُتارا امی کی بات کو سنا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

''لیکن امی ہم رپورٹ میں کیا درج کرائیں گے۔ ہمارے پاس تو کوئی ثبوت بھی نہیں اور نہ کوئی چشم دید گواہ...... اور پولیس والوں کو تو آپ اچھی طرح جانتی ہیں بال کی کھال تک اتارنے لگتے ہیں۔ یاد ہے آپ کو پچھلے دنوں ہماری ہمسائی رضیہ کا تین سالہ بیٹا گم ہوگیا تھا۔ اور انہوں نے غلطی سے پولیس میں اغواہ برائے تاوان کی رپورٹ درج کروادی تھی۔ پولیس تو پیسے ہضم کرگئی لیکن بچہ جانتی ہیں آپ کہاں سے ملا۔ گندے نالے کے پل کے نیچے اُس کی نیم برہنہ لاش ملی تھی۔ اور پھر بلال کوئی بچہ تو نہیں کہ کوئی اسے اغوا کر کے لے جائے گا۔'' سحر ناگواری سے بولی۔

''پھر وہ کہاں جاسکتا ہے، زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔'' خورشید بیگم پریشان ہوتے ہوئے بولیں۔

''اُس کی پھوپو نواب شاہ میں رہتی ہیں ہوسکتا ہے وہ اپنی پھوپو کے پاس چلا گیا ہو۔ لیکن بتائے بغیر کیسے جاسکتا ہے کم از کم مجھے تو بتا سکتا تھا ناں۔'' امی خدشہ ظاہر کرنے لگیں۔

سحر کا ننھا سا دل بلال کی بے اعتنائی سے ٹوٹ گیا تھا۔ کالج کے ماحول میں اسے بلال کا عکس نظر آتا تو وہ اور اُداس ہوجاتی۔ ماضی کی بے فکریوں کی یادیں تازہ ہوجاتیں۔ اور سوچتی ہماری زندگی کا وہ مختصر دور جو بلال کے سنگ گزرا تھا محض ایک قہقہہ تھا جو فضا کی وسعتوں میں کھوگیا ہے۔ ایسے میں اس کی سہیلی مہوش اسے سہارا دیتی۔

''سحر آخر تم اتنی نروس کیوں ہورہی ہو؟ پریشان مت ہو خود کو سنبھالو، پڑھائی میں دل لگاؤ اور انجوائے کرو زندگی کو...... اگر تم بلال سے واقعی محبت کرتی ہو تو ڈھونڈ نکالو اُسے...... جس کو تمہاری فکر نہیں ہے تم اُس کے لیے اپنا آپ خراب کررہی ہو۔ کبھی آئینے میں خود کو دیکھو تو میری باتوں کا جواب تمہیں خود ہی مل جائے گا۔ میری باتیں یوں تو تمہیں ناگوار گزر رہی ہوں گی۔'' مہوش اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''تم مجھے تسلی دینے اور ہمت بندھانے آئی ہو یا میرے زخموں پر نمک ڈالنے تم اچھی طرح جانتی ہو میں پچھلے تین ماہ سے کتنی پریشان ہوں۔ ہاں میں بلال کو ڈھونڈ نکالوں گی۔ جو لوگ روح کی گہرائیوں تک اتر جائیں پھر ان سے جدا ہو کر نہیں جیا جاتا۔

''تم ناراض نہیں ہوا ایسا کرتے ہیں کسی مزار

پر چلتے ہیں وہاں جا کر تم بلال کے لیے دعا مانگنا'
اگر تمہاری نیت سچی ہوئی تو دعا میں اس کا اثر ضرور
رس بس جائے گا۔"

" بقول امی کہ یہ مزار والے بڑے پہنچے
ہوئے بزرگ ہوتے ہیں لیکن ہوتے تو وہ بھی
ہمارے جیسے انسان ہیں۔ بس اللہ اُن کو ہمارے
جیسے پریشان حال لوگوں کے لیے ایک وسیلہ بنا کر
دنیا میں بھیج دیتا ہے۔ آج ویسے بھی جمعرات ہے
میرے گھر کے پاس ایک مزار ہے۔ اگر تمہارا دل
مانے تو آج کالج سے چھٹی ٹائم وہاں چلتے ہیں
مہوش کی بات سن کر سحر کے دل کی مرجھائی کلی
مسکرانے لگی۔ جیسے اس پر ٹھنڈی اوس پڑ گئی ہو۔

دبے قدموں سے دونوں سہیلیاں مزار کے
احاطے میں داخل ہوئیں عجیب قسم کی خاموشی تھی۔
لیکن چڑیوں کی چہکار اس خاموشی کو پُر اسرار
بنائے ہوئے تھی۔ برآمدے میں کچھ خواتین بیٹھی
تھیں۔

کوئی دعا مانگ رہی تھی تو کوئی شکرانے کے
نفل ادا کر رہی تھی۔ مزار کی دوسری جانب دیے
پڑے تھے۔ جن میں دیا سلائی جل رہی تھی۔ اگر
بتیوں کی بھینی بھینی مہک ایک دلفریب تاثر دے
رہی تھی۔ سحر نے مزار کے اندر جھانکا تو چھت پر
بڑا فانوس نظر آیا جو جگمگ کر رہا تھا۔ اس نے تازہ
گلاب کی پتیاں لیں اور قبر کے قریب جا کر نچھاور
کر دیں۔ دعا مانگتے ہوئے اُسے اچانک رونا
آ گیا۔ پاس بیٹھی ایک درویش عورت نے اسے
سہارا دیا۔ اور کہنے لگی۔

" بیٹی تیرے اندر ایسا کون سا غم ہے کہ جب
سے تُو نے دعا مانگنی شروع کی ہے روئے جا رہی
ہے۔ یہ بڑے پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ تو صبر اور
حوصلے سے کام لے۔ اللہ سب کی دعائیں قبول
کرتا ہے۔ پھر اُس درویش عورت نے ایک
دھاگہ دیا اور کہا تیرے دل میں جو بھی اُلجھن ہے
اُس کو ذہن میں رکھ کر یہ کالا دھاگہ اس کھڑکی
کے ساتھ باندھ دے اللہ نے چاہا تو تیری مراد بر
آئے گی۔"

اُس عورت نے کھڑکی طرف اشارہ کرتے
ہوئے کہا۔ جہاں مختلف رنگوں کے دھاگے
بندھے ہوئے تھے۔ سحر نے وہ کالا دھاگہ لیا اور
اللہ کا نام لے کر کھڑکی کے ساتھ باندھ دیا۔ پھر
اُس نے پاس پڑی صندوقچی میں نذرانہ ڈالا۔ اور
باہر کا رخ کرنے لگی۔ مزار کے باہر ایک طرف
قوالی کی آواز آ رہی تھی۔ قوالی کی آواز سن کر سحر
کے دماغ پر سے بوجھ ہلکا ہونے لگا۔ قوالی کے
ساتھ متوالے بھنگڑے ڈال رہے تھے۔ اور ایک
دوسرے پر نوٹوں کی بارش کر رہے تھے۔ دونوں
سہیلیاں کچھ دیر کھڑکی کے ساتھ لگیں یہ منظر دیکھتی
رہیں۔ شام کے سائے پھیلنے لگے تو دونوں باہر
کھلی اور صاف سڑک پر نکل آئیں۔ اور فٹ
پاتھ پر پیدل چلنے لگیں۔

" میرا گھر تو آ گیا ہے تم کچھ دیر میرے گھر
آ جاؤ چائے پی کر جانا......" مہوش نے گلی کی نکڑ پر
کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

" نہیں مہوش میں گھر جاؤں گی۔ امی پریشان
ہوں گی۔ نائلہ اور حماد کے اسکول کا ہوم ورک بھی
چیک کرنا ہے۔ اور امی کو دوا بھی دینی ہے۔" وہ
کہتے کہتے چپ ہو گئی پھر جیسے کہیں کھو گئی۔

" کیا ہوا سحر تم ابھی تک اپ سیٹ ہو۔ اللہ پر
کامل یقین رکھو اور پُر امید رہو۔ یوں اُداس رہنے
سے تم بیمار پڑ جاؤ گی اور پھر......" مہوش کچھ کہتے
کہتے رُک گئی۔

" اور پھر کیا؟" سحر چونکی۔

’’پھر تم ہمارے دولہا بھائی کو کیسے تلاش کرو گی۔‘‘ مہوش ہنستے ہوئے بولی۔
’’چل ہٹ تجھے مذاق سوجا ہے اور اِدھر میرے دل کو کہیں قرار نہیں آرہا۔‘‘
’’سب ٹھیک ہوجائے گا تم بس اچھا سوچو اور ہاں اگلے مہینے کی دو تاریخ کو میری سالگرہ ہے تم نے ضرور آنا ہے۔ میں فون کر کے آنٹی کو منالوں گی۔ لیکن تمہاری طرف سے کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔ ورنہ میرا پتہ ہے ناں......
ہاں ہاں میں ضرور آؤں گی۔ سحر نے مسکرا کر کہا اور پاس سے گزرتے ایک رکشے کو اشارہ کیا اور مہوش کو اللہ حافظ کہتی رکشے میں سوار ہوگئی۔
مزار پر گئے دو ہفتے گزر چکے تھے۔ لیکن ایسی کوئی صورتِ حال اس کو نظر نہیں آئی کہ کہیں سے اس کو بلال کا سراغ ملتا۔
خورشید بیگم جو شام کی ترکاری چولہے پر چڑھا چکی تھیں اور اب وہ آنگن کے ایک کونے میں مٹی کے تندور پر روٹیاں لگا رہی تھیں۔ ہر سو گرم روٹیوں کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ نائلہ اور حماد کو بھوک تندور کے پاس کھینچ لے آئی۔ دونوں گرم روٹیوں کو ہاتھ لگانے لگے۔
’’ارے بچو! سنبھل کے اٹھاؤ بہت گرم روٹیاں ہیں۔‘‘ امی نے اپنے بچوں کو تاکید کی۔ سحر یہ سارا منظر دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ کل مہوش کی سالگرہ تھی۔ اُس کے لیے بازار سے گفٹ لینا تھا۔ مہوش فون پر نا جانے کتنی بار سالگرہ پر آنے کا کہہ چکی تھی اور اب تو امی کی طرف سے بھی اجازت مل گئی تھی لیکن اُس کا دل ابھی تک پُرسکون نہیں تھا۔ پھر وہ انکار بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی ایک ہی تو عزیز از من جاں سہیلی تھی۔
آج چھٹی کا دن تھا۔ آنکھ کھلی تو صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ جلدی سے فریش ہونے کے بعد وہ کچن میں آئی اور سب کے لیے ناشتہ بنانے لگی۔ چھٹی والے دن عموماً سحر ہی سب کے لیے ناشتہ بناتی تھی۔ کچن کے کاموں سے فارغ ہو کر اس نے جلدی سے واشنگ مشین لگائی اور پورے ہفتے کے کپڑے دو گھنٹے میں دھو ڈالے۔ پھر خود نہائی واش روم سے باہر نکلی تو سہ پہر کے چار بج رہے تھے۔
سارا دن وہ کاموں میں گم رہی۔ لیکن لاشعوری طور پر وہ مہوش کی سالگرہ کو ذہن میں رکھے ہوئے تھی۔
سالگرہ کے لیے اس نے ہلکا فیروزی شیفون کا پیراہن زیب تن کیا۔ فنکشن کی مناسبت سے ہلکا پارٹی میک اپ کیا۔ اس کے پھولے گالے اب اندر کو دھنس چکے تھے۔ لیکن پھر بھی وہ خود کو آئینے میں آخری بار نگاہ ڈالے حیران ہو رہی تھی کہ ان سوجی ہوئی آنکھوں میں بھی وہ کس قدر حسین لگ رہی ہے۔ اس کے بازوؤں پر کالے بالوں کی آوارہ لٹیں رقص کر رہی تھیں۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ مہوش کے گھر اس کی سالگرہ کا گفٹ لیے کھڑی تھی۔ بچوں نے خوبصورت کپڑے پہنے ہوئے تھے۔
مہوش نے بھی سبز شیفون کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ دونوں سہیلیاں ایک دوسرے کے گلے لگیں۔ سحر نے مہوش کو گفٹ پکڑاتے ہوئے سالگرہ کی مبارکباد دی اور کہنے لگی۔
’’رات کو نظر اُتار لینا کہیں میری نظر نہ لگ جائے تمہیں اس قدر پیاری جو لگ رہی ہو۔‘‘ سحر کی بات پر مہوش کھلکھلا کر ہنس پڑی اور پھر دونوں سہیلیاں ٹیبل کی طرف آئیں اور بچوں کو بھی بلالیا گیا جو کھیل کود میں مگن تھے۔ خوب گہما گہمی میں

کیک کاٹا گیا رقص و موسیقی کا شور شرابا اور سہیلیوں کے ڈانس دیکھ کر آج وہ پہلی بار کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ ہنستے ہوئے بھی اس کی پلکیں بھیگنے لگیں۔

اسے بلال کا چہرہ اپنی آنکھوں کے گرد گھومتا ہوا نظر آرہا تھا۔ شاید میں اور دیر یہاں نہ بیٹھ سکوں۔ وہ خود سے بولی۔ بڑی مشکل سے مہوش سے اجازت ملی۔ گھر پہنچی تو رات کے دس بج چکے تھے۔ آتے ہی اس نے امی کو سلام کیا۔

''کیسا رہا تمہارا فنکشن......'' امی پوچھنے لگیں۔

''بہت اچھا رہا......مہوش تو آنے نہیں دے رہی تھی بڑی مشکل سے اجازت ملی۔'' سحر کلائیوں سے نیلی چوڑیاں اُتارتے ہوئے بولی۔

''اور میری بیٹی کیسی لگ رہی تھی؟'' امی اس کے گال چھوتے ہوئے بولیں۔

''جب گھر سے نکلی تھی تو سب سے پہلے آپ نے ہی تو دیکھا تھا پھر کیوں پوچھ رہی ہیں۔'' سحر لبوں پر نیم مسکان سجاتے ہوئے بولیں۔

''چلو اچھی بات ہے کہ میری بیٹی کا دھیان تو کسی اور طرف ہوا......''

''دھیان جس طرف بھی ہو لیکن ہر لمحہ دھیان میں وہ بے وفا ہی رہتا ہے۔'' سحر تاسف بھرے لہجے میں بولی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

خورشید بیگم اب سحر کی شادی کا سوچ رہی تھیں۔ پڑھائی تو ساتھ ساتھ ہوتی رہے گی۔ وہ تعلیم کو شادی کی رکاوٹ نہیں بنانا چاہتی تھیں۔ آخر کب تک ان کی بیٹی پاگلوں کی طرح ایک بے نام سی آس دل میں سجائے بیٹھی رہے گی۔ آخر کچھ سوچ کر وہ بھی اپنے کمرے میں آرام کرنے کے لیے چلی گئیں۔

☆......☆......☆

بڑھی ہوئی داڑھی ہاتھ میں رائفل اور گولیوں کا ہار جو اس کے گلے میں ہمہ وقت لٹکتا رہتا تھا۔ درمیانہ کاٹن کا سوٹ جو جابجا داغ دھبوں سے بھرا ہوا تھا۔ آنکھوں میں انتقام اور دشمنی منجمد تھی۔ اور یہ انتقام اور دشمنی بے گناہ لوگوں کی جان لے کر پوری ہو رہی تھی۔

لوگوں کو بم دھماکوں سے مارا جارہا تھا تو دہشت گردی سے ڈرایا جارہا تھا۔ وہ اور اس کے ساتھی بے دردی سے لوگوں کو پکڑ کر تشدد کا نشانہ بناتے اور پھر جھوٹے الزام لگا کر سر تن سے جدا کر دیتے۔ اب وہ پورے گروہ میں بلا کے نام سے مشہور تھا۔ جب کوئی دھماکہ کروانا ہوتا تو باس بلال عرف بلا کو اپنا دست بازو سمجھتا۔ اور اس پر پورے یقین کے ساتھ دھماکے اور دوسرے کام کرواتا۔

''یار اِدھر آؤ یہ دیکھو نقشہ کل تم سب نے اس سڑک سے جانا ہے اور اس مقام پر دھماکہ کرنا ہے۔'' باس سب لڑکوں پر رعب جماتے ہوئے بولا۔ پھر وہ ایک فائل اٹھا لایا۔ جن پر سب لڑکوں کے نام درج تھے۔ جنہوں نے کل کی کارروائی میں حصہ لینا تھا۔

کل کے دھماکے کے لیے وہ آج مکمل تیاری کر رہے تھے۔ یہ اسلحہ کون پہنچائے گا اور دھماکہ کس نے کرنا ہے۔ تم سب اچھی طرح جانتے ہو ایک بات کا خیال رکھنا جہاں ہم نے دھماکہ کرنا ہے وہاں لوگوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہوگی۔ اور اسی لیے پولیس بھی بھاری تعداد میں موجود ہوگی۔ اس لیے بہت ہوشیاری سے تم سب نے مل کر کام کرنا ہے۔ باس سمجھانے لگا۔ رات منصوبہ بندی کرتے گزر گئی۔ اور صبح خونخوار تھی۔ نا جانے کس کا سہاگ اجڑنے والا تھا۔ اور کون یتیم

ہونے والا تھا۔ لوگ جلسے کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ آج بڑی اونچی پارٹی جلسہ کرنے والی تھی۔

لیڈر نے اپنا اثر و رسوخ بٹھانے کے لیے قیام و طعام کا بھی انتظام کیا ہوا تھا تاکہ لوگ اسے زیادہ ووٹ دیں۔ یہ جیکٹ تم پہن لو' باس نے بلال کو کہا۔ بارودی مواد تمہیں شکیل عقبی گیٹ سے پکڑائے گا سب دروازوں پر پولیس کی بھاری تعداد موجود ہوگی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اس طرح کی کارروائیاں کرنا اب تمہارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے اور ہاں اب تم معاوضے کی بالکل فکر نہ کرنا جتنے لوگ مارے جائیں گے اُس سے دگنا معاوضہ تمہیں ملے گا۔

''یہ لو ایڈوانس رقم......'' بلال نوٹوں سے بھرا بیگ باس کے ہاتھوں سے لے کر اپنی کوٹھری میں ایک صندوق میں رکھ کر آ گیا۔

''اب تم سب جاؤ...... اور فکر کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ میں تمہارے رابطے میں ہوں گا...... ٹائم یاد ہے ناں شام کے سات بجے تم نے دھماکہ کرنا ہے۔ اس لیے کسی بھی ہنگامی صورت حال میں گھبرانا مت۔'' پھر یہ لوگ ایک جیپ میں سوار ہوئے' جیپ جلسہ گاہ کے عقبی گیٹ پر رُکی۔

ساتھی نے بھاری بیگ بلال کے حوالے کیا اور فوراً اُس کی نگرانی کرنے لگا۔ ساتھ ہی وہ باس کے رابطے میں بھی تھا۔

بلال بارود سے بھرا بیگ ہاتھ میں پکڑے آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگائے جلسے گاہ میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کی رہنمائی شرافت اور شکیل کر رہے تھے۔ آناً فاناً دھماکہ ہو گیا۔ ہر طرف اعضا بکھر گئے۔ گردنیں تن سے جدا ہو گئیں۔ آنتیں باہر نکل آئیں' خون میں نہائے جسم سینکڑوں کی تعداد میں زمین پر بکھرنے لگے۔ بارود کی بو میں بسی لاشیں جو عین روشنی کے دائروں میں پڑی ہوئی تھیں۔ لاتعداد کراہوں اور چیخوں کا شور دیکھ کر بلال کا باس اسے شاباشی دے رہا تھا۔

''واہ میرے لال ٹو نے تو کمال کر دکھایا۔ یہ ہے تیرا باقی معاوضہ۔'' جمیل نے اسے سینے سے لگایا۔

اور بقایا رقم بلال کے حوالے کر دی۔ بلال بدی کے راستے پر چلتے ہوئے بہت آگے نکل چکا تھا۔ ہر بری عادت بلال میں موجود تھی اور وہ ان سب کاموں میں خاصی مہارت حاصل کر چکا تھا۔ باس اس سے بہت خوش رہتا تھا۔ اور اسے اپنی ٹیم کا سنہری ہیرا سمجھتا تھا۔ وہ بلال جو سب کی آنکھ کا تارا تھا۔

پانچ وقت کا نمازی اور سب کے کام آنے والا تھا۔ جس نے سحر کے دل میں محبت کا بوٹا مہکایا تھا۔ جو دادو کی جان اور والدین کی آنکھ کا تارا تھا۔ آج وہ ایک ایسی دلدل میں پھنس چکا تھا۔ جہاں سے نکلنا ناممکن تھا۔

دن گزرتے جا رہے تھے اور بلال پورے شہر میں دہشت گردی پھیلائے جا رہا تھا۔ ہاں کبھی کبھار اُس کا ضمیر تھوڑی دیر کے لیے اسے ملامت کرتا لیکن پھر وہ اس کو کسی بچے کی طرح لوری دے کر سلا دیتا تھا۔

☆......☆......☆

''سحر میں تمہیں بار بار سمجھا رہی ہوں اور یہ آخری بار ہے۔ اس تصویر کو غور سے دیکھ لو اور اب میں انکار کا لفظ تمہاری زبان سے نہ سنوں۔''

''آخر کب تک تم ایک بے نام سی آس پر زندگی گزارو گی۔ اور ایسا میں ہرگز نہیں ہونے

دوں گی۔ ارے خدا کی پناہ' چھ ماہ ہو گئے بلال کو غائب ہوئے۔ نہ اُس کا کوئی اتا پتہ نہ رابطہ' میں تمہیں ایسی غلطی کبھی نہیں کرنے دوں گی۔ خدا جانے وہ زندہ بھی ہے یا مر چکا ہے۔ پھر نائلہ بھی بڑی ہو رہی ہے۔ ایک دو سال تک وہ بھی شادی کے قابل ہو جائے گی۔'' خورشید بیگم ایک لڑکے کی تصویر اس کے بیڈ پر رکھتے ہوئے غصے میں بتا رہی تھیں۔

روز و شب کی گریاں زاری اور امی کا بڑھتا ہوا دباؤ وہ شدید ڈپریشن کا شکار ہونے لگی تھی۔ ایسے میں دوست ہی کام آتے ہیں۔ اور ایسی دوستی اس کی سہیلی مہوش نبھا رہی تھی۔

جو ہر قدم پر اور ہر سلگتے موسم میں اس کے ساتھ تنہا اُس صحرا میں سفر کر رہی تھی جس کی نہ کوئی منزل نہ کوئی راستہ' وہ سحر کے کمرے میں آئی کمرے کی خاموشی اور گھٹی گھٹی فضا بتا رہی تھی کہ اس کی سہیلی دل کھول کر رو چکی ہے۔ مہوش سحر کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔

''سحر جانی تمہیں کیا ہو گیا ہے اس طرح روتی رہی تو تم اپنی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر سکو گی۔ آنٹی ٹھیک کہتی ہیں۔ میری مانو تو شادی کے لیے ہاں کر دو۔ ان دوریوں کو اب مزید اتنا نہ بڑھاؤ کہ ہم سب بھی تم سے ہمیشہ کے لیے دور ہو جائیں۔ تم بہت حساس ہو اپنا فیصلہ خود کر سکتی ہو۔ پھر اتنی دیر کیوں ؟'' مہوش سمجھاتے ہوئے بولی۔

مہوش کی بات سننا تھی کہ سحر کے ہونٹ کانپ اٹھے بھینچی ہوئی مٹھیاں تھرتھرا اٹھیں۔ آنکھوں کو بے دردی سے مسلنے لگی۔

''بہت افسوس ہے مجھے تم پر مجھے یقین نہیں آ رہا کہ یہ سب تم کہہ رہی ہو تم تو میری کیفیت سے اچھی طرح آشنا ہو پھر بھی تم...... مجھے تو تم پر مان تھا ایک تم ہی تو واحد سہارا تھی جس سے میں ہر بات کرتی تھی۔ مجھے تم سے ایسی امید ہرگز نہیں تھی۔'' سحر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''دیکھو تم ناراض نہیں ہو اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو شاید میں بھی ایسا ہی کرتی۔ یار وقت کا تقاضہ یہی ہے کہ تم خاموشی سے آنٹی کی بات مان لو اگر خدانخواستہ آنٹی کو کچھ ہو گیا تمہارے ابو تو اس دنیا میں نہیں ہیں۔ حماد ابھی چھوٹا ہے۔ وہ اکیلے گھر کی ذمہ داریاں نہیں اٹھا سکے گا۔''

مہوش اس کے مقابل کھڑی ہو گئی۔

مجھے کچھ وقت دو وہ جیسے گڑگڑائی اور مہوش کو اپنی دوست کی بے بسی پر بہت رونا آیا۔

رات دن پریشان رہنے سے خورشید بیگم کی شوگر ہائی ہو گئی اور بلڈ پریشر بھی کنٹرول میں نہیں رہا تھا۔ ایسی ہی گرمیوں کی ایک شام کو ان کی طبیعت بگڑی تو سحر انہیں ڈاکٹر کے پاس لے جانے لگی۔

''میں نہیں جاؤں گی ڈاکٹر کے پاس' تم بس اُس رشتے کے لیے ہاں کر دو۔ میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔''

''امی غصہ مت کریں دیکھیں آپ کا رنگ پیلا پڑتا جا رہا ہے اور ایسی حالت میں ڈاکٹر سے معائنہ کروانا ضروری ہوتا ہے۔'' ڈاکٹر کے پاس پہنچیں تو زیادہ رش نہیں تھا۔ ٹوکن جلدی مل گیا۔ اگلا نمبر انہی کا تھا۔ ڈاکٹر نے چیک اپ کیا اور کہا۔

''ان کے سر پر کوئی ذہنی بوجھ ہے اگر آپ انہیں پُرسکون رکھیں تو ان کی صحت کے لیے بہتر ہو گا۔ میں کچھ دوائیں لکھ کر دے رہا ہوں انہیں باقاعدگی سے دیتی رہیں اور کوشش کریں گھر کا

ماحول خوشگوار رہے۔"

سحر نے ڈاکٹر سے پرچی لی اور دونوں ماں بیٹی کلینک سے باہر نکل آئیں۔ سامنے اسٹور سے دوائیں خریدیں اور بل کاؤنٹر پر ادا کیا۔ باہر گنجان سڑک پر رکشے کے انتظار میں کھڑی تھیں کہ اچانک ایک ڈاکو اس کے سامنے سے گزرا شاید کسی کو لوٹ کر بھاگ رہا تھا سحر کی آنکھیں اس چہرے کو لاکھوں میں پہچان سکتی تھیں۔ وہ چلائی۔

"بلال...... بلال تب اُس اجنبی نے جھٹکے سے اسے پلٹ کر دیکھا دفعتاً ایک کالی گاڑی آ کر رُکی اور بلال نے تیزی سے پلٹ کر سحر کا ہاتھ پکڑا اور کھینچتا ہوا گاڑی کی پچھلی نشست پر ڈال دیا۔ سب کچھ اس قدر جلدی ہوا کہ وہ کچھ سمجھ نہ پائی۔

وہ بلال اور ایک اجنبی کے درمیان پھنسی بیٹھی تھی دماغ ماں کی طرف تھا کہ ان پر کیا گزر رہی ہوگی۔

بلال سحر کو اپنے اڈے پر لے آیا تھا یہاں لا کر اس کو ایک تاریک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ شناسائی کی جو ایک رمق اُس کو بلال کی آنکھوں میں نظر آئی تھی پھر وہ کبھی نظر نہ آئی۔ دن میں کئی کئی بار وہ بلال سمیت ان بھیڑیوں کی ہوس کا شکار بنتی اب تو اُس کو یاد بھی نہیں تھا کہ کتنے دن یا مہینے اس قید میں گزر گئے ہیں۔

تنہائی میں وہ سر پٹک پٹک کر روتی کہ کاش ماں کی بات مان لی ہوتی سیراب کے پیچھے نہ دوڑ رہی ہوتی۔

کاش کسی طرح یہاں سے نکل سکوں، اپنے بہن بھائیوں اور ماں کو دیکھ سکوں۔ مگر اس کی بدقسمتی نے اُس کے مستقبل پر سیاہ چادر تان دی تھی۔ اور پھر ایک دن انہونی ہوگئی۔ وہ جگہ جہاں وہ قید تھی گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونجنے لگی۔ کئی گھنٹوں کے بعد خاموشی چھا گئی اور پھر بھاری بوٹوں کی آوازیں اُس کے کانوں میں پڑنے لگیں۔

کچھ دیر بعد دروازہ دھڑاک کر کے دور جا گرا۔ مہینوں بعد سورج کی روشنی سے اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

کچھ دیر بعد منظر واضح ہوا تو سامنے وردیوں میں ملبوس جوان کھڑے تھے تمام دہشت گرد مارے گئے تھے اس کو پہلے اسپتال پھر Rehab شفٹ کر دیا گیا۔ اس کے بتائے ہوئے پتے پر اہلکار گئے اور معلومات لائے کہ خاتون بچوں کو لے کر کہیں چلی گئیں۔

مہوش کی شادی ہوگئی اور اس کے والدین نے ہر قسم کے تعاون سے انکار کر دیا وہ نہیں چاہتے تھے کہ مہوش کے سسرال تک کوئی بھی منفی خبر پہنچے۔ آج سحر ایک سرکاری اسکول میں بطور ٹیچر کام کر رہی ہے۔ دن تو بچوں کے ساتھ گزر جاتا ہے مگر رات ایک آزمائش بن کر آتی ہے۔ بلال اور سحر دونوں ہی اپنی اپنی جگہ غلط تھے۔ بلال نے مجبوری میں برائی کا راستہ چنا اور اُسی راستے کا مسافر ہوگیا۔

سحر نے ایک انجان شخص کی چند روزہ دوستی کی خاطر ماں کو دکھ دیے اور وہ اپنے تمام رشتے، عزت اور پرسکون زندگی سب کھو بیٹھی، کاش انسان وقت گزرنے سے قبل ہی سنبھل سکتا۔ کاش نوجوان نسل والدین کی محبت کو سمجھ سکے۔

کاش وہ جان سکیں کہ زندگی بس ایک ہی بار ملتی ہے اور اس کو اصل محبتوں کے ساتھ گزارنے والے خوش نصیب ہوتے ہیں۔ کم عمری کی محبت صرف دھوکہ ہے۔

☆☆......☆☆

کراچی سے ارسال کردہ خوبصورت تحریر

اللہ کے نام خط

آج شام وہ استاد کا سودا سلف لانے کے لیے باہر نکلا تو راستے میں مسجد کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک کاغذ اڑتا ہوا اس کے پیروں کہ پاس آیا...... جسے اس نے جھک کہ اٹھا لیا لکھائی سے کوئی دوسری تیسری جماعت کا بچہ لگ رہا تھا وہ غور سے پڑھنے لگا......

فرح انیس

کوئی تم سے اگر اچھے کی امید رکھتا ہو تو اس کو مایوس مت کرنا کبھی کیونکہ تمہاری ایک نا اس کو مایوسی کے اندھیرے میں دھکیل سکتی ہے...... یہ جو آس ہوتی ہے نہ اس کو توڑنا نہیں کبھی... تم کسی کی ایک حاجت پوری کرو گے اللہ تمہاری دس حاجتیں پوری کرے گا ایک بات یاد رکھنا جب ہاتھ میں تمہارے وقت ہو تو ایسا کام کر جانا کہ ہر کام تمہارے حق میں اللہ کر دے کیونکہ یہ وقت جو ہوتا ہے نہ ایسے میں رب بندے کو دے کر آزماتا ہے کے اس میں کتنا ظرف ہے دوسرے کو دینے کا اب تو یہ تم پر منحصر ہے کہ سارا خود رکھتے ہو یا پھر اس پاک ذات کے نوازے ہوئے میں سے دوسرے کو بھی نوازتے ہو......

کھانے کے بعد باتوں باتوں میں شاہ جی اپنے شوروم کے ملازمین سے مخاطب ہوئے آج انہوں نے اپنے ملازمین کو رات کھانے پر بلایا تھا۔

شاہ جی جن کا گاڑیوں کا ایک بہت بڑا شوروم تھا...... عمر کوئی پچپن ساٹھ کے لگ بھگ تھی۔ شاہ جی کو اللہ نے خوب دولت سے نوازا ہوا تھا ایک ہنستے بستے خوش حال گھرانے سے انکا تعلق تھا...... بیوی بچے سب ہی ان کے فرمانبردار تھے راوی ہر طرح سے چین ہی چین لکھ رہا تھا انکی زندگی میں......

شاہ جی اپنے ملازمین کی ضروریات کا بھی بے حد خیال رکھتے تھے یہیں وجہ تھی کہ سب ان کی بہت عزت کرتے تھے......

شاہ جی پر جب وقت اور پیسہ آپ کے ہاتھ میں ہو تو انسان کو بس اپنا آپ اور پھر اپنی ہی ضروریات نظر آتی وہ چاہتا ہے کہ میری خواہشات کا کشکول بھر جائے غضنفر کے سوال پر شاہ جی مسکرا دیے......

یہیں تو اصل امتحان ہوتا ہے اس کے نفس کا کہ اپنے دل کو مار کر دوسرے کی ضرورت پوری کرنے کا بیٹے، مگر شاہ جی ایسا ہوتا نہیں ہے کیونکہ انسان کو ایسے میں بس اپنا آپ اور اپنی ضروریات ہی نظر آتی ہے۔

میں تم لوگوں کو آج ایک سچی کہانی سناتا ہوں اس ہی سے متعلق شاہ جی کے کہنے پر ڈرائنگ روم میں بیٹھے تمام نفوس دلچسپی سے ان کی جانب متوجہ ہو گئے۔

استاد اس بار اگر پرائز بونڈ نکلا نہ دیکھنا میں وہ سب لونگا جو میں نے سوچا ہوا ہے...... عماد آنکھوں میں ان گنت خواب لیے بولا۔

ہاں ٹھیک ہے پہلے یہ صاحب کی گاڑی تو دیکھ لے...... استاد کے کہنے پر وہ گاڑی میں موجود مسلہ دیکھنے لگا۔

مگر اس کا ذہن اگلے ماہ کی دس تاریخ میں اٹکا ہوا تھا' اس نے بونڈ لا کر رکھا ہوا تھا اب اس کا دل شدت سے یہ دعا کر رہا تھا کہ اسکا پرائز بونڈ نکل آئے۔

کتنے ارمان تھے اس کے بچپن سے جوانی تک کہ بیشمار خواب تھے جو اس کی آنکھوں میں بسے ہوئے تھے۔

عماد اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھا بدقسمتی سے بچپن میں ہی ماں باپ جیسی عظیم نعمت سے محروم ہوگیا تھا۔ بچپن کبھی نانی تو کبھی دادی کے گھر گزرا...... مگر نانا نانی اور دادا دادی کی وفات کے بعد اس نے زندگی کے وہ کٹھن مرحلے طے کرے کہ بعض اوقات کا تو اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ خودکشی کر لے...... رشتے داروں کے گھر رہنا اس کے لیے بڑی اذیت رہا ان کی ہر وقت کی باتوں نے اس کی زندگی اجیرن کردی تھی۔

کبھی کسی کے در پر تو کبھی کسی کے در پر اس نے اپنی زندگی گزاری...... نوکروں سے بدتر سلوک کیا جاتا تھا اس کے ساتھ...... کبھی کوئی دھتکار کے نکال دیتا تو کبھی کوئی رشتے دار رحم کھا کر رکھ لیتا پورا بچپن اس ہی طرح گزر گیا...... بقول عماد کہ جوانی سے بچپن ہجرت کرتے گزر گئی۔

اس کو تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا اس نے مزدوری کر کے کبھی لوگوں کے جوتے پالش کر کے غرض یہ کہ ہر طرح سے محنت مزدوری کر کے اس نے میٹرک تک تعلیم حاصل کرلی اور وہ ایک مکینک شاپ پر ملازم لگ گیا۔



مکینک کا مالک جس کو سب استاد بولتے تھے اس نے ایک کمرہ عماد کو رہنے کے لیے دے دیا جس پر وہ ان کا بے حد ممنون تھا وہ مطمئن تھا کہ اس کو اب رشتے داروں کی ہر وقت کی باتیں اور ذلت نہیں سہنی پڑے گی۔

اس نے تھوڑے ہی دن پہلے پرائز بونڈ لیا تھا اور وہ اس انتظار میں تھا کہ کب اس کا پرائز بونڈ نکلے وہ دن رات بس یہیں سوچتا کہ وہ کیا کرے گا اس رقم کا بچپن سے محرومی دیکھنے والا عماد اب اپنی ہر محرومی دور کرنا چاہتا تھا اس رقم سے......

آج شام وہ استاد کا سودا سلف لانے کے لیے باہر نکلا تو راستے میں مسجد کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک کاغذ اڑتا ہوا اس کے پیروں کے پاس آیا...... جسے اس نے جھک کے اٹھا لیا لکھائی سے کوئی دوسری تیسری جماعت کا بچہ لگ رہا تھا وہ غور سے پڑھنے لگا۔

"پیارے اللہ جی میرا دل چاہتا ہے کہ میں بھی اچھے کپڑے پہنوں میرے ابا کے پاس تو اتنے پیسے بھی نہیں جو وہ مجھے اچھے کپڑے لا دے اماں بولتی ہے کہ اللہ سے بولو تو میں نے خط لکھ کر آپ کو یہاں آپ کے گھر دینے آیا ہوں مسجد تو آپ کا گھر ہے نہ مجھے اچھے کپڑے دے دیجیے نہ۔"

عماد کی آنکھیں بے اختیار آنسوؤں سے بھر گئی وہ متلاشی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا وہ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ وہ بچی نظر آجائے جس نے یہ خط لکھا۔

اب وہ روز گزرتا وہاں سے اور بے ساختہ اس کی نگاہ اس پرچے کو ڈھونڈتی کہ کیا پتا پھر اس بچی نے اللہ کو خط لکھا ہو مگر ایک ہفتے تک اسے نظر نہیں آیا مگر ایک ہفتے بعد اسے پھر مسجد کے کونے میں درخت کے ساتھ کوئی کاغذ نظر آیا اس نے تیزی سے جھپٹ کر اس کاغذ کو اٹھا لیا وہ اس ہی بچی کا خط تھا۔

"پیارے اللہ جی آپ نے ابھی تک مجھے کپڑے نہیں بھیجے میں کب سے انتظار کر رہی ہوں کپڑوں کا ساتھ مجھے کھلونے بھی دیجیے گا میرے پاس کوئی کھلونا نہیں ہے اور کھانے کو بھی دیجیے گا میرا بہت دل کرتا ہے کہ میں بھی اچھے اچھے کھانے کھاؤں پر اماں بولتی ہے ہم نہیں کھا سکتے ایسے کھانے پر امیروں کو بھی تو آپ دیتے ہیں مجھے بھی دے دو نہ۔"

عماد کا خط پڑھ کر دل پر عجیب سا بوجھ آگیا اسے اپنا محرومی لیا ہوا بچپن یاد آنے لگا اور تھوڑے ہی دن بعد اس نے بچی کو بھی دیکھ لیا جو یہ خط رکھ کے جایا کرتی تھی وہ کوئی نو سے دس سال کی بچی تھی چہرے پر بھولپن لیے ہوئے چھوٹی سی گڑیا آنکھوں میں آس و امید لی ہوئی۔

عماد نے اس کو واپس پلٹتے دیکھا تو اس کے قدم بے اختیار اس کا پیچھا کرنے لگے وہ ایک چھوٹے سے گھر میں گھس گئی تھی وہ اس کو گھر میں داخل ہوتا دیکھ کر واپس پلٹ آیا اور ایک ہفتے بعد اس کا پرائز بونڈ نکل آیا تھا پورے دس ہزار کا اس کی خوشی دیکھنے والی تھی۔

تم اب کیا کرو گے ان پیسوں کا استاد اس کے چہرے پر پھوٹتی خوشی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ میں اس سے سب کچھ خریدونگا ہر وہ چیز جو میں چاہتا ہوں عماد خوشی سے کانپتے لہجے میں بولا اس کو لگ رہا تھا ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو اسے لگ رہا تھا وہ سب کچھ خرید لے گا کہاں تو اس کے ہاتھ میں اتنی محنت مزدوری کے بعد بھی پورے دن کے سو روپے ہاتھ آتے تھے اور اب اکھٹے اتنے پیسے وہ پوری رات ان پیسوں کو تکیے کے نیچے رکھ کے فکر میں جاگتا رہا کہ کہیں اس کے پیسے ادھر ادھر نہ ہو جائیں رات بھر اٹھ اٹھ کر رقم دیکھتا اس کو یقین نہیں آرہا تھا۔

دوسرے دن اس کے قدم بے اختیار بازار کی جانب اٹھے وہ ایک بہت بڑی مارکیٹ تھی وہ آنکھوں

میں خوشی لیے بہت دلچسپی سے ان کپڑوں کو دیکھ رہا تھا' جن کو لینے کی اسے بچپن سے حسرت تھی' کیسی خوشی ہوتی ہے نہ جو خواب بچپن سے آپ کی آنکھوں میں بسا ہو اور اس کے پورے ہونے کا وقت ہو تو آنکھوں سے پھوٹتی خوشی کا حال ہی الگ ہوتا ہے یہیں حال آج عماد کا تھا اچھا اوڑھنا پہننا اس کا کتنا بڑا خواب تھا اور خواب تو خواب ہوتا ہے چاہے کسی بھی روپ میں ہو۔

وہ اپنے لیے مختلف لباس دیکھنے لگا پینٹ شرٹس، خوبصورت قمیض شلوار اس کا دل چاہا وہ سب خرید لے کہ اس کی نگاہ برابر والی دکان پر بے اختیار اٹھی اور پھر ان نگاہوں نے پلٹنے سے انکار کر دیا اس کی نگاہیں وہاں جم سی گئی تھی' وہ ان کپڑوں کی دکان میں گھسنا چاہا جہاں اس کو اپنے من پسند لباس نظر آرہے تھے مگر اس کے قدموں کو جیسے جکڑ سا لیا ہو کسی کے الفاظوں نے اور وہ اس دکان میں داخل ہو گیا اور پھر وہ ان مان بھرے آس لیے ہوئے الفاظوں کو سوچتا گیا اور خریداری کرتا گیا۔

اس نے رنگ برنگ کے کپڑے، بہت سارے کھلونے اور کھانے پینے کی اشیاء ڈھیروں سامان خرید ڈالا......اب اس کا رخ اس بچی کے دروازے پر تھا بہت آہستگی سے اس نے اس دروازے پر دستک دی اور خود تیزی سے وہاں گھر کے پاس لگے درخت کے پیچھے خود کو چھپا لیا دروازہ کھولنے والی وہی بچی تھی وہ چھپ کے اس بچی کے تاثرات دیکھ رہا تھا وہ بچی جھک کر ان شاپرز کو دیکھنے لگی اور کچھ لمحوں بعد اس کے لبوں سے خوشی کے مارے چیخ نکلی اور اس کے لبوں سے نکلنے والے الفاظ نے عماد کو وہیں ساکت سا کر دیا۔

اماں دیکھو اللہ کا جواب آیا ہے اللہ نے میرے لیے بھیجا ہے اس کی آواز پر ایک عورت باہر آ گئی اور وہ بھی حیرانگی سے باہر رکھے سامان کو دیکھ رہی تھی۔

اماں دیکھو نہ میں اللہ کو خط لکھتی تھی نہ اس نے بھیج دیا اس بچی کہ چہرے پر پھوٹتی خوشی اور لبوں پر مسکان دیکھ کر عماد کی آنکھوں میں نمی آ گئی' میں نے بولا تھا نہ اللہ سنتا ہے دیکھا سن لی اللہ نے بس اماں کوئی بھی تم کو پریشانی آئے نہ اللہ کو خط لکھ دینا' وہ بچی مدبر بنی ماں کو بتا رہی تھی پر وہ نہیں جانتی تھی کے درخت کی اوٹ میں چھپے عماد کو کتنا بڑا سبق دے رہی تھی۔

وہ چہکتی ہوئی سامان اٹھاتی ہوئی اندر جانے لگی اور درخت سے اپنی پشت لگائے عماد سوچنے لگا کے کیا مضبوط یقین ہے اس بچی کا اللہ پر اور اللہ بھی اس بچی کا یقین ٹوٹنے بھی نہیں دے گا' آج میرے ذریعے سے کروایا کل کو کوئی اور عماد اس کے دروازے پر یہ سب دے کر جائے گا۔

وہ بہت خوش اور مطمئن تھا شاید اتنی خوشی اسے اپنے لیے بھی سب خرید کر نہ ملتی جو اس بچی کی آنکھوں میں دمکتے جگنوں دیکھ کر ملی۔

کیا ہوا عماد کیا لیا اپنے لیے دوسرے دن وہ شاپ پر پہنچا تو استاد اس کو دیکھ کر پوچھنے لگا' وہ سب لیا جو بچپن سے ارمان تھا بہت سارے لباس پرفیوم گھڑی سب لیا استاد وہ مسکراتے ہوئے بتانے لگا۔

چل اچھی بات ہے یہ تو بہت استاد کے کہنے پر وہ مسکرا کر کام میں لگ گیا۔

شام جب وہ جانے لگا تو استاد کے آواز دینے پر وہ انکی طرف چلا آیا'' ......جی استاد'' یہ لو استاد اس کی طرف لفافہ بڑھاتا ہوا بول' یہ کیا ہے وہ نہ سمجھی سے بولا دیکھ لو خود ہی وہ لفافہ کھول کہ دیکھنے لگا اچھے خاصے پیسے تھے اس میں۔

اب گھڑی بھی لینا پرفیوم بھی اور اچھے اچھے کپڑے بھی استاد کی بات پر وہ آنکھوں میں الجھن لیے دیکھنے لگا۔

میں اس بچی کے منہ سے نکلے الفاظ پر چونکا تھا

کہ اللہ کا جواب آیا ہے وہ بچی اللہ کو خط لکھتی تھی اس یقین سے کہ وہ جانتی تھی کہ ایک دن اس کو جواب ملے گا اور وسیلہ تم تھے اس کام کا کیونکہ اللہ نے تمہارے ذریعے سے کروانا تھا یہ کام اور کل اس ہی لمحے میں اللہ نے میرے دل میں ڈالا تمہیں پیسے دینے کا خیال یار نیکی کے اس سفر میں مجھے بھی شامل کرلے استاد کے کہنے پر وہ چونک کر ان کو دیکھنے لگا' کل میں وہیں سے گزر رہا تھا جب تم اس بچی کے دروازے پر سامان رکھ رہے تھے تو میں متجسس ہو کر وہیں رک گیا اور پھر زیادہ دیر نہ لگی مجھے ساری بات سمجھنے میں......

میں بہت چھوٹا تھا استاد میں نے محرومیوں کے سوا کبھی کچھ دیکھا ہی نہیں بالکل بھکاریوں جیسی زندگی گزاری رشتے دار رحم کھا کر تو رکھ لیتے تھے' مگر کتے سے بھی بدتر حال ہوتا تھا پل پل ترستا تھا ہر چیز کے لیے خواہش کو مارنا آسان نہیں ہوتا مگر میرا وجود عادی ہو گیا تھا خواہشوں کو مارنے کا اپنے دل کو مارنا پڑتا تھا' اچھے کپڑے پہننا تو بہت دور کی بات ہے میں تو اچھا کھانے پینے کو ترستا تھا۔

بچپن سے جوانی آگئی اچھے وقت کے انتظار میں پر جب میں نے اس بچی کو دیکھا تو نجانے کیوں مجھے اس میں اپنا بچپن نظر آیا اس کی آنکھوں میں وہی سب تھا جو میری آنکھوں میں ہوا کرتا تھا۔

مگر یہاں ایک جگہ فرق تھا اس میں کہ اس کا اللہ پر یقین تھا اور وہ بھی اس قدر مضبوط کہ وہ اس آس پر اللہ کو خط لکھتی کہ اللہ اس کا یقین نہیں توڑے گا تو اللہ کیسے اس کا یقین توڑتا۔

مجھے اس چھوٹی سی بچی نے بہت بڑا سبق دے دیا استاد اس کا مانگنے اور منوانے کا انداز جس قدر پیارا تھا اور وہ جس یقین سے سامان کو دیکھ کر اپنی ماں سے بولی تھی نہ کہ دیکھا میں نے بولا تھا نہ اللہ سنتا ہے۔

اس وقت اس لمحے میں وہاں کھڑا ہوا بالکل اندر سے ساکت تھا کہ کاش ہم سب کا یقین اس بچی جیسا ہو عماد کی آنکھوں سے تیزی سے آنسو بہہ رہے تھے۔

استاد نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا اور تم کو ایک بات بتاؤں عماد جو لوگ اپنی ضروریات کو مار کر دوسروں کی ضروریات پوری کرتے ہے نہ صرف اس لیے کہ وہ بھی اس محرومی کے وقت سے گزر چکے ہوتے ہیں اور وہ نہیں چاہتے کہ جس وقت سے وہ گزرے دوسرا بھی گزرے تو ایک وقت ایسا آتا ہے پھر کے اللہ ہر کام میں ان کا بھلا کرتا ہے' استاد مسکراتے ہوئے بولا۔

جاؤ اب تم بھی وہ لو جو تمہارا دل ہے استاد کے کہنے پر عماد ہچکچاتے ہوئے ان کا چہرہ دیکھتے ہوئے بولا یہ تو بہت زیادہ ہے پر......

نہیں یہ اتنے زیادہ نہیں کم از کم تمھارے خلوص سے زیادہ نہیں اور عماد راستے میں چلتے ہوئے سوچنے لگا ٹھیک ہی تو سنا ہے اللہ اپنے اوپر بندوں کا احسان نہیں رکھتا ایک کے بدلے چار کر کے لوٹاتا ہے اور سودا مہنگا بھی نہیں اس کی راہ میں دینا منافع بخش ہی تو ہے۔

اور پھر عماد نے زندگی گزارنے کا ایک راز جان لیا کہ دوسروں کی ضروریات پوری کرتے جاؤ ان کی خوشی کا خیال رکھو اللہ تم کو نوازتا جائے گا اور آج عماد شاہ جی کے روپ میں تم لوگوں کے سامنے ہیں' کچھ نہ بھی ہو کسی کو دینے کے لیے تو محبت اور تسلی کے دو بول ہی بول دو پر دو ضرور کہ یہ انسان کا انسان پر حق ہے کہ کسی سوالی کو خالی ہاتھ نہ لوٹاؤ' شاہ جی اپنی نم آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے دھیمے سے مسکرا دیے۔

تمنا درد دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

☆☆......☆☆

فلمی کیڑا

فلموں کے آخری شو کے دیوانے کا حال تحریر کی شکل
میں جو آپ کو کھلکھلا کر ہنسنے پر مجبور کر دے گا......

پیر نوید شاہ

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ہم سینما میں سپرہٹ پاکستانی فلم 'ہمراہی' کا آخری شو دیکھنے کے بعد فلم کے سریلے گیت گنگناتے ہوئے اپنی کرائے کی قیام گاہ کی جانب گامزن تھے۔ بجلی والوں کی عنایتوں کے طفیل ہر سو تاریکی کا راج تھا۔ اوپن ایئر مین ہولوں کی بہتات کے باعث سنبھل سنبھل کے پھونک پھونک کر قدم بڑھا رہے تھے۔

چوراہے پر پہنچے تو کچھرا کنڈی کے پاس دو عدد گدھوں پر نظر پڑی جو حالت جنگ میں ایک دوسرے پر دولتیوں کی گولیاں برسانے میں سرگرم تھے۔ منظر نامہ کافی دلچسپ اور فلمی انداز کا تھا سو ہم کھڑے ہو گئے یہ دیکھنے کے سرخرو کون ثابت ہوتا ہے؟ مدھم سی چاندنی میں فریقین کا جائزہ لیا تو عقدہ کھلا کہ ایک لنگڑا اور دوسرا کانا ہے' دھک سے رہ گئے۔

''ہمراہی......'' ہم بڑبڑائے۔

''وہ بھی حیوانوں کی...... یعنی کہ ہمراہی کا سیکوئل......!''

جو گدھا از حد زیادہ جنگ و جدل کر رہا تھا وہ لنگڑا تھا اور جو خوب پٹ رہا تھا وہ کانا تھا گویا انسانوں کی طرح حیوانوں کے مابین بھی طاقتور اور کمزور کی جنگ تھی۔ یکا یک لنگڑے گدھے کو جانے کیا سوجھی کہ اُس نے پینترا بدلا اور کانے گدھے پر نان اسٹاپ دولتیوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ اس متکبر' جنگجو' جذباتی' سنگ دل کو اس مظلوم پر ذرا ترس نہ آیا جو کوئی آہ کیے بغیر شرافت کی منہ بولتی تصویر بن کر ظلم کے پہاڑ سہتا رہا تڑپتا رہا مچلتا رہا۔

''چھوٹی چھوٹی لاتیں لمبی ہو جاتی ہیں۔'' اچانک فلم تم بن کا گیت گونج اٹھا۔

''ہائیں...... یہ گدھے گاتے بھی ہیں۔'' ہم اچھل پڑے۔

''گدھے ہیں یا سونو نگم کے بھائی؟''

''خمار نیند کی کارستانی ہے میاں......'' دماغ میں جھماکا سا ہوا' بات سمجھ میں آ گئی۔ سڑک پر

ایک ٹرک جارہا تھا جس میں گانا چل رہا تھا ہماری نیند نے بولوں میں ترمیم کردی تھی۔

"اوہ مائی گاڈ......" اپنی عقل پر ماتم کیا گدھوں کو ان کے حال پر چھوڑ کے آگے چل دیے۔ بابو پان شاپ کے آگے سے گزرے تو زمین پر پڑے پانچ سو روپے کے نوٹ پر نظر پڑی۔

"پیسہ پیسہ کرتی ہے تو پیسے پہ کیوں مرتی ہے؟" بے اختیار ہم گنگنانے لگے۔ خوشی سے ہماری باچھیں کھل گئیں۔ للچائی نظروں سے نوٹ کو تکنے لگے جو فراخ دالی سے بلا رہا تھا۔

"کہیں کسی کی شرارت تو نہیں؟" اچانک خیال آیا۔ آج کل شرارتی بچے کرنسی نوٹ کو باریک ڈوری کے ساتھ نتھی کرکے سڑک پر ڈال دیتے ہیں۔ جوں ہی کوئی اٹھانے کو لپکے تو ڈوری کھینچ کر تماشہ بناتے ہیں۔

"نہیں بھئی نہیں......" اس امکان کے پیش نظر اٹھانے سے ہچکچائے لیکن بیروزگاری اور مفلسی غالب ہوئی تو امکانات کو بالائے طاق رکھ کے خود کو آمادہ کرلیا۔

چاروں اطراف دیکھ کے نوٹ کی جانب بڑھے ہی تھے کہ پل بھر میں ہوا کا طوفانی جھونکا نازل ہوا اور نوٹ اپنی جگہ سے اچھل کر ہوا میں رقص کرتا ہوا پرواز کرنے لگا۔ ہار ماننے والے ہم بھی نہ تھے لگ گئے تعاقب میں، آگے نوٹ پیچھے ہم......آدھی رات میں فلم "ریس" چل پڑی تھی۔

اڑتا اڑتا نوٹ کوڑے کے ایک چھوٹے سے ڈھیر پر جا ڈھیر ہوا۔ غالباً تھک چکا تھا۔

"آ دیکھیں ذرا...... کس میں کتنا ہے دم......" ہونٹوں پر زباں پھیر کے ہم گنگنائے۔ اب نوٹ



کو ہمارے عتاب سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ جس طرح بلی چوہے پر، مکڑی مکھی پر حملہ آور ہوتی ہے اسی طرح ہم خراماں خراماں نوٹ کی جانب بڑھنے لگے۔ انتہائی قریب پہنچ کر جھپٹا مارا تو پاؤں تلے زمین نکل گئی۔ محاورتاً نہیں حقیقتاً...... دراصل کوڑے کا وہ ڈھیر کھلے مین ہول کے اوپر ویس کی طرح تیر رہا تھا۔ بلدیہ والوں کی اعلیٰ کارکردگی کے طفیل دام فریب میں آگئے تھے ہم...... ہائے رے ہائے برے نصیب میرے......

مین ہول کے سیاہ، بدبودار، غلیظ پانی میں غوطہ زن تھے۔ ہوش ٹھکانے آگئے پر اس سرکاری بدبودار آزمائش سے جان چھڑانے کی تدبیر نہ سوجھی۔ یکایک مین ہول میں نصب فولادی سیڑھی نظر آئی آؤ دیکھا نہ تاؤ بندر کی طرح چڑھ گئے اور بالآخر بدبودار جہنم سے آزادی پا کے نکلے۔

''کالے لباس میں بدن ایسا لگے ایمان سے جیسے ہیرا نکل رہا ہو کوئلے کی کان سے۔'' ایک بار پھر کسی گزرنے والی گاڑی میں سے سچویشن کے مطابق گونجتے گیت پر تلملا کے رہ گئے۔ تضحیک پر اسے پانچ انگلیوں کا کھلا گفٹ عنایت کیا۔ خود کا جائزہ لیا تو خود سے نفرت ہونے لگی تعفن سے دماغ پھٹ رہا تھا۔ ابکائیاں سی آرہی تھیں۔ اُجلے کپڑے بلا معاوضہ سیاہ رنگ دھار چکے تھے۔

''دور باش، خوش باش لعنت ہے ایسی دولت پر......'' منحوس نوٹ کو ہم کوسنے لگے کہ جس کی بدولت تتلی سے بھنورے بن چکے تھے۔

''ایسی دولت سے ہم باز آئے جو دل کو جلائے ستائے......'' نوٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے دکھی دل کے ساتھ لتا جی کا گیت گنگناتے ہوئے ٹھکانے کی جانب راہی ہوئے۔

کرائے کے ڈربے پر پہنچ کر بند دروازہ کھٹکھٹایا۔ جو فوراً کھلا لیکن یہ کیا۔

''بھ...... بھ...... بھوت...... بھوت......''

ہم پر نظر پڑتے ہی ہمارا جگری یار تین بٹا چار اسپرنگ کی طرح اچھلا اور دہشت زدہ ہو کے چلا اٹھا۔

''بچاؤ...... بچاؤ...... بھوت...... بھوت......''

یہ الفاظ نہیں بلکہ کوئی چاٹ مصالحہ تھا جو تین بٹا چار ہمارے زخموں پر چھڑک رہا تھا۔

تین بٹا چار کا اصل نام مختار تھا جو کہ اس کی منفرد شخصیت کے پیش نظر ہم تبدیل کر چکے تھے۔ موصوف کا چہرہ الجبرا کی طرح اُلجھا ہوا ہے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ ناک کہاں ہے؟ نتھنے کہاں اور منہ کہاں ہے؟ اب ایسی صورت حال میں ہمارا تجویز کردہ نام کچھ غیر موزوں تو نہیں ناں؟ تین بٹا چار...... ایسا نام دنیا میں اور کسی کا ہو تو مانیں۔

''بچاؤ...... بچاؤ...... بھوت بھوت......''

تین بٹا چار کی آہ و پکار جاری تھی کہ ہم نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''ابے یہ ہم ہیں ہم......'' ہم نے وضاحت کی۔

''ہائیں...... فلمی کیڑا؟'' تین بٹا چار خود کو چھڑاتے ہوئے بڑبڑایا۔

''تو یہ میک اپ کس لیے کیا ہے فلم میں کام تو نہیں مل گیا' پر یہ کیسا بدبودار میک اپ ہے؟''

ہم نے اُسے اپنی رام لیلا سنائی تو اس کے خرگوش جیسے کان کھڑے ہو گئے۔

''بولو بولو شیدی جامبو...... بولو بولو......''

موقع پا کے وہ طنز کے نشتر برسانے لگا۔

''بولو بولو شیدی جامبو......''

''بکواس بند کر۔'' ہم دھاڑے تو اس کی

بولتی بند ہوگئی۔
''فلمی کیڑے...... فلمیں کم دیکھا کرو نہ روز اسی طرح ذلیل وخوار ہوتا رہے گا۔''
''ابے فلمیں دیکھنے سے بھلا ان باتوں کا کیا تعلق ہے یہ تو محض اتفاق ہے اتفاق......''
''چل چھوڑ ان باتوں کو' تو واش روم جا' انسان بن کے آ' تب تک میں تمہارے لیے کمال کی چائے بنا کر لاتا ہوں...... کیا یاد کرو گے۔''
''کمال کی چائے...... کیا غالب کمال نے چائے کا کارخانہ لگالیا کیا؟''
''افوہ...... لگتا ہے کہ یہ فلمی کیڑا تمہیں گدو پہنچا کے ہی چھوڑے گا؟''
ذرا دیر بعد نہا دھو کے' اُجلے کپڑے زیب تن کر کے ہم باہر نکلے' گو کہ گندگی دھل چکی تھی لیکن مہک دار اثرات باقی تھے' بدبودار سانحے نے دماغ کی چولیں ہلا دی تھیں' طبیعت میں عجیب سی کراہیت سرایت کر چکی تھی۔ جوں ہی تین بٹا چار کچن سے نمودار ہوا ہم نے جھٹ سے چائے کا کپ اٹھالیا اور بڑے چاؤ سے ہونٹوں سے لگایا تو چودہ طبق روشن ہوگئے۔
''آخ تھو......'' ہم تھوکتے ہوئے گرجے۔
''چائے ہے یا ہمدرد کی صافی......''
''توبہ توبہ...... معافی معافی...... شاید پتی کی بجائے پسا ہوا گرم مصالحہ ڈال دیا میں نے سوری۔''
''سوری کے بچے لعنت ہے تیری زندگی پر' ایسی نکارہ آنکھیں نکال کے کتوں کو کھلا دے۔''
کڑوی کسیلی چائے نے ہمیں جوالا مکھی بنا دیا۔
''ہیو یو ناٹ عقل اِن یور کھوپڑی مسٹر منحوس نمبر ون۔''
''واہ...... واہ...... بالکل سلطان راہی......
قسم تیری جوانی کی تو ہیرو ہے فلمی کیڑے۔''
''کیا مطلب...... یہ اچانک...... کیسی بہکی بہکی باتیں کرنے لگتا ہے تُو الو کے پٹھے؟''
''مطلب نہیں ضرورت بول ضرورت...... ضرورت اس بات کی ہے کہ اب تو اداکار بنے اداکار...... آج تیری ڈائیلاگ ڈلیوری میں سلطان راہی کی جھلک ہے۔ تُو سلطان راہی ثانی بن سکتا ہے۔''
''سلطان...... راہی......؟ یعنی کہ وہ ہی انجمن والا سلطان راہی......؟''
''ہاں سلطان راہی...... جو پل بھر میں لاشوں کے ڈھیر لگا دیتا ہے ڈھشوم ڈھشوم......''
''کیا بکواس کر رہے ہو تین بٹا چار...... بھنگ ونگ تو نہیں پی لی کوئی؟''
''بکواس نہیں یہ حقیقت ہے فلمی کیڑے' کچن میں تُو نے جو سلطان راہی کی بڑی سی تصویر لگا رکھی ہے ناں' یہ سب اسی کی کارستانی ہے سلطان راہی کی روح بذریعہ چائے تیرے اندر داخل ہو چکی ہے۔ اب پاکستان فلم انڈسٹری میں تیرا داخلہ کوئی نہیں روک سکتا۔''
''م...... م...... مگر...... یہ سب...... کیسے...... ہوگا؟ ...... کہاں میں اور ...... کہاں سلطان راہی؟''
''ارے پریشان کیوں ہوتا ہے یار...... ناصر ادیب سے رابطہ کر' مولا جٹ پارٹ ٹو میں کام مل گیا ناں تو لوگ اصلی سلطان راہی کو بھول جائیں گے۔ تیرا راج ہوگا تیرا فلمی کیڑے۔''
''اوہ...... ویری گڈ......'' ہم نے پیار بھری نظروں سے تین بٹا چار کو گھورا اور اپنے درخشاں مستقبل کے خوابوں کی رنگین دنیا میں کھو گئے۔
☆☆......☆☆☆

بہاول نگر سے ارسال کردہ تحریر

سچی لگن

سچی محبت کرنے والے کبھی خالی ہاتھ نہیں رہتے

اور صبا کی لگن نے یہ ثابت بھی کر دیا تھا......

محمد ابو ہریرہ بلوچ

صباء کی ماں سائرہ اسے ڈھونڈتے ہوئے اس کے کمرے تک آئی تو ایک دم جیسے چونک پڑی۔ اس کے پاؤں زمین سے چمٹ کر رہ گئے۔ اندر صباء ابو ذر کی تصویر کو سامنے رکھے ہوئے راز و نیاز میں اس قدر مگن اور محو تھی کہ اسے اپنی والدہ کی موجودگی کا علم ہی نہ ہو سکا۔

برسات کی طرح بہتے آنسو صباء کے گالوں کو مسلسل بھگو رہے تھے۔ ہچکیوں کی آواز واضح سنائی دے رہی تھی۔ سائرہ کچھ دیر ساکت و جامد کھڑے ہوئے بیٹی کی حالت زار کو دیکھتی رہی لیکن جب صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا تو وہ مڑی اور اپنے خاوند خوشی محمد کے کمرے کی طرف چل دی۔

اندر خوشی محمد صاحب کسی کتاب کے مطالعے میں مستغرق نظر آئے۔ اجی سنتے ہو! سائرہ نے اسے متوجہ کیا تو وہ کتاب بند کر کے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

مجھ سے صباء کی یہ حالت دیکھی نہیں جاتی۔ پچھلے بارہ سال سے یہ اندر ہی اندر انتظار کی بھٹی میں جل رہی ہے۔ ہم کب تک اسے یونہی بٹھائے رکھیں گے۔ بہت کچھ بدل چکا ہے شاید ابوذر اور اس کے گھر والے بھی۔ 12 سال کا عرصہ بہت ہوتا ہے انتظار کے لیے۔

اب ہمیں کوئی اچھا سا لڑکا ڈھونڈ کر جلدی سے اس کے ہاتھ پیلے کر دینے چاہیئے۔ میں جیتے جی اپنی بیٹی کو دلہن بنا دیکھنا چاہتی ہوں۔ سائرہ کی آواز جذبات میں رندھ گئی تو وہ سر جھکا کر بلک بلک کر رونے لگی۔

اری اللہ کی بندی اپنے فرض سے سبکدوشی کا خواہاں میں تجھ سے زیادہ ہوں۔ لیکن ان دونوں کی منگنی بھی ہو چکی ہے اور وہ ایک دوسرے سے بے حد پیار بھی کرتے ہیں۔

میرے خیال سے ایسا قدم اٹھا کر ہم ان پر زیادتی کریں گے۔ پھر بھی میں رات کھانے کی میز پر صباء سے اس بارے میں بات کروں گا اگر وہ تمہاری اسی سوچ کی ہم خیال نکلی تو میں جھٹ منگنی پٹ ویاہ والا معاملہ کروں گا۔

دعا کرو ایسا ہی ہو سائرہ کی آواز ابھری اور پھر کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ ابوذر اور صباء آپس میں کزن تھے آج سے بارہ سال قبل جبکہ صبا کی عمر محض سات سال تھی ان دونوں کو منگنی کے رشتے میں جوڑ دیا گیا تھا۔ چونکہ خوشی محمد اور محمد اختر علی کو دوستی کو رشتہ داری میں بدلنے کی اس سے اچھی ترکیب نہ سوجھی۔

اور ویسے بھی دونوں ہم عمر تھے ساتھ پڑھے ساتھ کھیلے دونوں کو ایک دوسرے سے خاص لگاؤ بھی تھا۔

لیکن پھر اختر علی کو بزنس کے سلسلے میں دوسرے ملک جانا پڑا۔ اور جاتے ہوئے اس نے خوشی محمد سے کہا کہ تمہاری بیٹی اب ہماری بہو ہے۔ وہاں سے واپس ہوتے ہوئے میں اپنے بیٹے کی شادی صبا سے کروا دوں گا۔ اور تب سے لے کر اب تک بارہ سال ہو چکے تھے صبا اور اس کے والدین انتظار کی چکی میں پس رہے تھے۔ اختر علی اور اس کی فیملی ایسے گئے کہ پلٹ کر خبر لینا بھی گوارہ نہ کیا۔

دو چار مہینے بعد بات ہو جاتی تھی لیکن انہوں نے کبھی آنے کا ذکر نہیں کیا تھا اور نہ ہی خوشی محمد نے کبھی پوچھنے کی زحمت کی۔

کھانے کی میز پر خوشی محمد نے گلہ کھنکھارا جہاں وہ سب جمع تھے۔ انھوں نے بات شروع کی صبا بیٹی اب تم انیس سال کی ہو چکی ہو میں اور تمہاری ماں نے مل کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ کوئی اچھا سا لڑکا دیکھ کر تمہارے ہاتھ پیلے کر دیے جائیں۔



اس بارے میں تمہارا کیا کہنا ہے؟ صبا نے دونوں کو حیرت سے دیکھا اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ اس کے ماں باپ اس سے ایسی بات کر سکتے ہیں۔ حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ میری اور ابوذر کی منگنی ہو چکی ہے۔ اس نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور بولی۔

جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں ہم صرف اس کے فیصلے ہی زمین پر کر سکتے ہیں میرا اور ابوذر کا جوڑا پہلے بن چکا ہے۔ اب صرف کسی بھی لمحے اس کا فیصلہ ہونا باقی ہے۔ آپ ہی اس کا انتظار کرتے کرتے تھک گئے ہوں گے لیکن میں نہیں۔

ایک لڑکی زندگی میں صرف ایک ہی شخص سے پیار کر سکتی ہیں اور وہ میں ابوذر سے کر چکی ہوں۔ اب کسی اور کے بارے میں سوچنا بھی گناہ سمجھتی ہوں۔ میرا دل اب بھی ابوذر کے لیے ہی دھڑکتا ہے۔

پھر بھی اگر آپ زبردستی اپنے فیصلے کی تکمیل اور اس پر عمل درآمد کرانا چاہیں تو میں احتجاج نہیں کروں گی۔ لیکن اس رشتے میں میری ایک فیصد بھی رضامندی شامل نہیں ہوگی۔ اور آپ کا وہ فیصلہ صرف بیٹی ہونے کی وجہ سے ہی قبول کروں گی۔

صبا خاموش ہو چکی تھی دل کا غبار جیسے چھٹ گیا تھا۔ باولی ہو چکی ہے یہ لڑکی۔ آجکل پیار محبت کے قصے صرف کتابوں میں ہی ملتے ہیں۔ تیری بھوسہ بھری کھوپڑی میں یہ بات کیوں نہیں آ رہی کہ جس ابوذر کے لیے تو پل پل مرتی ہے تڑپتی ہے اس نے اس عرصے میں ایک بار بھی تجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی اور شاید تم یہ بات بھول رہی ہوں کہ وہ دوسرے ملک میں ہے۔ ہو سکتا ہے اس نے وہاں اپنے لیے کسی اور لڑکی کو پسند کر لیا ہو یا پھر شہر کی رنگینیاں اسے بھا گئی ہوں۔

سائرہ بیٹی کی باتوں پر اچھل پڑی تو اس نے بھی اسے حقیقت کا آئینہ دکھا کر دل کا غبار نکالا۔ خاموش رہو تم سائرہ! ہم اس طرح بیٹی پر زبردستی نہیں کر سکتے۔

خوشی محمد نے بیٹی صباء کا جھکا سر دیکھا تو اسے ڈانٹ کر بیٹی کی سائیڈ لی۔ صباء کے دل میں یہ باتیں برچھیاں بن کر اتر گئیں۔ یہ حقیقت تھی کہ ابوذر نے اس کی ایک دفعہ بھی خبر نہیں لی۔ اور ماں کا وہم بھی تو غلط نہیں تھا۔ جب اس سے برداشت نہ ہو سکا تو وہ اٹھی اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اور ماں باپ اسے آواز دیتے رہ گئے۔ کب عقل آئے گی تمہیں سائرہ ابھی وہ بچی ہے اگر غصے میں آ کر اس نے کوئی غلط قدم اٹھا لیا تو اس کی ذمہ دار تم ہو گی۔

☆......☆......☆

بیگم سامان پیک کر لو کل ہم پاکستان جا رہے ہیں۔ جہاں مجھے اپنے دوست سے کیے وعدے کی تکمیل کرنی ہے۔ اختر علی کمرے میں داخل ہوئے تو بات شروع کی۔ ہیں؟؟؟؟ آپ جانتے بھی ہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔

اس جنت جیسی زندگی کو چھوڑ کر جہاں ہر چیز کی فراوانی ہے کون اس جہنم جیسے ملک میں جانا چاہے گا جہاں کرپشن لوٹ مار اور نجانے کیسے کیسے روح فرسا واقعات وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ نہ بابا نہ میں یہاں سے کہیں بھی نہیں جانے والی۔ اور ہاں رہا آپ کے وعدہ نبھانے کا سوال تو میں اس سے بالکل بھی خوش نہیں ہوں ہمارا بیٹا ابوذر ایک ایجوکیٹڈ لڑکا ہے۔

اچھی نوکری ہے سمارٹ ہے پرفیکٹ ہے اس کے لیے تو میں رشتوں کی لائن لگا دوں۔ اور آپ اسے گاؤں کی مڈل کلاس لڑکی سے جوڑنا چاہتے ہیں۔ جسے ہماری سوسائٹی میں رہنے کا ڈھنگ بھی

نہیں ہے۔

آپ کے اس فیصلے سے آپ کا بیٹا بھی متفق نہیں ہوگا۔ اختر علی کا پارہ یہ باتیں سن کر ہائی ہوگیا۔

تم کون ساجدی پشتی شہری اور رئیس زادی ہو۔ اپنی اوقات مت بولو۔ بادشاہ سے فقیر بننے میں ذرا بھی دیر نہیں لگتی۔ ہم پاکستان ضرور جائیں گے۔

اور ہاں رہا بیٹے کی رضامندی کا سوال تو میں اسے مجبور نہیں کروں گا۔ اسے اپنی پسند کا پورا حق حاصل ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ صرف اسے ایک نظر دیکھ لے۔

اگر وہ اسے پسند نہ آئی تو میں بھی اس پر جبر نہیں کروں گا۔ لیکن مجھے امید ہے کہ ایسی نوبت نہیں آئے گی۔ اختر علی نے بیوی کی لمبی چوڑی تقریر سن کر اپنی بات بھی کہہ ڈالی۔ اور اگر میں نہ جانا چاہوں تو؟؟؟؟ بیگم نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ تو میں اپنی ساری جائیداد جس پر تم عیش کر رہی ہو اولڈ ہاؤس میں دے دوں گا۔ محلوں سے روڈ پر آتے ہوئے لمحہ بھر بھی دیر نہیں لگے گی۔ ایک منٹ میں ساری اکڑ دھری کی دھری رہ جائے گی۔ خاوند کی یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی۔ وہ وہ واقعی ڈر گئی۔ نہیں نہیں ہم پاکستان ضرور جائیں گے۔ میں کل تک اپنی پیکنگ مکمل کرلوں گی آپ بے فکر رہیں۔

اچھا کیا جو جلدی مان گئی۔ اختر علی نے بیوی کو گھورا اور پھر آگے بڑھ گئے۔ بیگم کچھ سوچنے لگی۔ ابوذر کو جب پتہ چلا کہ اسے پاکستان جانا ہے تو اس نے مزاحمت کرنے چاہی۔ چونکہ وہ بھی اپنا ہمسفر ڈھونڈ چکا تھا۔

''دیپکا'' اس کے خوابوں کی شہزادی۔ اس سے وہ کئی وعدے قسمیں کر چکا تھا لیکن باپ کی طرف سے ملی دھمکی کے بعد اس نے بھی خاموش ہونے میں ہی عافیت جانی۔

اچھی باتیں

''ڈاکٹر صاحب قسم خدا کی اسلام کی ساری اچھی باتیں تو امریکہ والوں نے اپنالیں۔ اسلام تو ہم نے بس امریکہ میں دیکھا۔ ایک سے ایک گوری چٹی حسین عورت نظر آتی ہے۔ وہاں کی عورتوں کو گرمی بہت لگتی ہے۔ بولائی بولائی پھرتی ہیں۔ اکثر عورتوں کو لباس کا بھی ہوش نہیں رہتا۔ ساحل پر چلے جائیں تو دور تک غسل آفتابی میں مشغول عورتیں نظر آتی ہیں۔ مجال ہے کوئی نگاہ اٹھا کر تو دیکھ لے۔ امریکہ والوں کی نگاہوں میں اب بھی شرم باقی ہے۔ ایک ہمارا ملک ہے گوری چمڑی کی کوئی چڑیل بھی نظر آجائے تو ایسے گھور گھور کر دیکھتے ہیں جیسے سکتہ ہوگیا ہو۔ چہرے سے نگاہ نہیں ہٹاتے۔ ایسے پیچھے لگ جاتے ہیں جیسے کوئی عورت نہ دیکھی ہو۔

(ڈاکٹر محمد محسن کی کتاب ''آئیڈیل منافق'' سے اقتباس)

مرسلہ: عنایت شاہ۔ کراچی

باپ کی جائیداد بھی تو اسے چاہیے تھی۔ اس نے تہیہ کرلیا کہ وہ وہاں پہنچتے ہی لڑکی کو نہ بول دے گا۔

ماں کی خواہش بھی تو یہی ہے۔

صبا کے فون پر وائبریشن ہونے لگی۔ نمبر اجنبی تھا اس نے ہچکچاتے ہوئے یس کا بٹن دبایا اور کانوں سے لگالیا۔ میں بہت جلد تم سے ملنے تمہارے ملک پاکستان آرہا ہوں۔ کال کرنے والے نے تعارف سے پہلے ہی مدعا بیان کر دیا۔ آپ کون ہیں؟؟ صبا نے اجنبیت دکھائی۔ وہ جس کا آپ کو پچھلے بارہ سالوں سے انتظار تھا۔ تمہارا منگیتر ابوذر۔ صباء کے دل کی بنجر زمین یکدم شاداب ہوگئی۔

اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ اس کا انتظار رنگ لا رہا ہے۔ محبت کا ابر کرم اس زور سے برسا کہ اسے سیرابی حاصل ہوگئی۔

میں کل تمہارے روبرو ہوں گا۔ انتظار کرنا اور پھر کال بند ہوگئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے موبائل پرس میں رکھا اور خود سے گویا ہوئی۔ اتنے سالوں سے انتظار ہی تو کر رہی ہوں ایک دن اور سہی۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے مارے آنسو چھلکنے لگے۔ اس نے یہ خوشخبری گھر والوں کو سنائی تو ان کی خوشی بھی قابل دید تھی۔ استقبال کی تیاریاں ہونے لگیں۔ پورے گھر کو سجایا گیا۔ ایسے جیسے کسی دلہن کو لایا جانا ہو حالانکہ دلہن تو گھر میں تھی دولہا آنے والا تھا۔

باپ کے کہنے پر ہی اس نے صبا کو کال کی تھی۔ تا کہ اس کا دل رہ جائے اور غیر حاضری کا بہانہ بھی۔ اگلے دن دوپہر کو ان کی آمد ہوئی۔ ابوذر خوبصورت تھا اسے بھی صبا کی معصومیت اچھی لگی لیکن ماں اور دیپکا سے کیے وعدے نے صبا کی خوبصورتی اور معصومیت کو بھلا دیا۔ اور وہ بے رخی برتنے لگا۔ صبا کا دل کٹ کر رہ گیا 12 سال انتظار کا یہ پھل ملتا ہے کہ روبرو ہو تو اجنبیت دکھائی جائے۔ لیکن وہ یہ سوچ کر خاموش ہوگئی کہ بارہ سال بعد آیا ہے اجنبیت ختم ہونے میں تھوڑا وقت تو لگے گا۔ بیگم اختر علی کو یہ سب فضول اور بے کار لگ رہا تھا اسے سی میں رہنے والی کو گاؤں کا ماحول اتنی جلدی کیسے راس آسکتا تھا۔ لیکن اس نے بھی یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ وہ بارہ سال بعد آئے ہیں۔ ماحول سے موافقت ہونے میں تھوڑا وقت درکار ہوگا۔ سارا گھر ان کی خدمت گزاری میں لگ گیا۔ ان کو تنکا توڑنے کی بھی زحمت نہیں اٹھانی پڑی۔ سب کچھ ایک حکم پر حاضر ہوتا۔ لیکن اختر علی کا رویہ سب سے الگ تھا وہ اپنے جگری دوست خوشی محمد سے مل کر بہت خوش تھے۔ گاؤں کی تازہ ہوا سبزیاں پھل اسے اس بیگانے ملک میں کہاں میسر آنے والے تھے۔ وہاں کی ہر چیز پیکنگ میں اور مصنوعی تھی۔ جبکہ یہاں پر قدرتی اور تازہ۔

خوشی محمد میں اپنی فیملی کو یہاں اس لیے لایا ہوں کہ انہیں تم میں گھل مل کر ماحول سے انسیت ہو جائے۔ اور تمہاری فیملی سے بھی۔ اس دوران صبا اور ابوذر بھی ایک دوسرے کو جان اور سمجھ لیں گے۔ ایک دن جاگنگ کرتے ہوئے اختر علی نے خوشی محمد سے بات کی تو وہ بولے دعا کرو خدائی فیصلہ تمہاری سوچ کے مطابق ہو۔ دن گزرتے گئے ابوذر کو رہ رہ کر اپنی گرل فرینڈ دیپکا کی یاد ستانے لگی۔ اتنی دور رہ کر بھی اس کی قربت میں گزرے لمحوں کو محسوس کر سکتا تھا۔ اس کی زلفیں اس کی رنگت اور بے باکیاں' تنہائی میں اس کی چھیڑ۔ چھاڑ آہ!!!! وہ ٹھنڈی آہ بھر کر رہ جاتا۔ رات کو اسکائپ کے ذریعے آن لائن بات ہو جاتی تو دیپکا روز اس سے واپسی کے بارے میں پوچھتی اور ہر بار اسے یہ بہانہ کرنا پڑتا وہ ایک دو دن میں لوٹ آئے گا۔ ایسا کرتے ہوئے مہینہ گزر چکا تھا۔ وہ اپنے باپ سے بغاوت کر کے بھی واپس نہیں جا سکتا تھا۔ صبا لاکھ کوشش کر کے بھی ابوذر کے دل میں جگہ بنانے میں ناکام رہی تھی۔ اور وہ بنا بھی کیسے سکتی اس کے دل میں دیپکا کی یادیں جو بھری پڑی تھیں لیکن اس نے پھر بھی کوشش نہیں چھوڑی آہستہ آہستہ دیپکا نے بھی بے رخی برتنی شروع کر دی اور نیٹ پر بھی کم وقت دینے لگی۔

ہم یہاں اور کتنے دن تک رہیں گے ابو؟؟؟

ایک دن اپنے والد کو تنہا بیٹھا دیکھا تو اس کے پاس آکر یہ سوال کر بیٹھا۔ کم سے کم چھ سات مہینے باپ نے مختصر سا جواب دیا اور دوبارہ اپنے کام میں لگ گیا۔ ابوذر کا منہ حیرت اور پریشانی سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ دیپکا سے چھ مہینے مزید دوری برداشت

کرنی پڑے گی؟؟؟!نہیں!ایسا ممکن نہیں تھا۔ایک مہینہ بھی کس کرب میں گزرا تھا اب چھ مہینے مزید۔ایسا نہیں ہوسکتا۔ ایسا نہیں کہ سب اس کا خیال نہیں رکھتے تھے جو تنہائی میں اسے دیپیکا کی یاد آتی۔بس وہ صباء کو اس کے قابل جگہ نہیں دے پا رہا تھا۔ وہ ہمیشہ اس سے بے رخی سے بات کرتا۔۔لیکن صباء بجائے غصہ ہونے کے درگزر سے کام لے جاتی۔ آج رات جب ابوذر کی دیپیکا سے بات ہوئی تو اس نے اپنی ابو کی بات کو دہرا دیا دیپیکا!ڈیڈ کہتے ہیں،ہم چھ مہینے تک یہاں رہیں گے۔ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ دیپیکا اسے تسلی دے گی۔

اور کہے گی کہ جان کوئی بات نہیں میں انتظار کرلوں گی۔مگر سب کچھ اس کی سوچ کے برعکس ہوا وہ اس پر پھٹ پڑی۔ میں تمہارے لیے اتنا انتظار نہیں کرسکتی۔ زندگی میں آگے بڑھنے کے لیے مجھے تمہارے سہارے کی ضرورت نہیں۔تم سے اچھے بھی بہت مل جائیں گے۔ابوذر کا دماغ چکرا گیا وہ جس سے محبت کے دعوے کرتا ہے وہ اس کے لیے صرف چھ مہینے تک انتظار نہیں کرسکتی۔ اور صبا جو کہ محض منگنی کے رشتے کو نبھاتے ہوئے بارہ سال سے انتظار کررہی ہیں اس کا کیا؟؟؟ حقیقی محبت کا مفہوم دماغ میں اترنے لگا۔

☆☆......☆

اس نے صبا کو اپنے سامنے بٹھا کر بات کی۔ صبا ان بارہ سالوں میں ایک دفعہ بھی تمہارے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ تمہیں مجھ سے اچھے بھی لوگ مل سکتے تھے۔جن کے ساتھ زندگی کے سفر پر نکل سکتی تھی۔ لیکن 12 سال کا انتظار محض میرے لیے؟ کیا یہ مشکل نہیں تھا۔اس نے ابوذر کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور بولی۔امید پر دنیا قائم ہے۔ میری تم سے محبت بچپن کی ہے اسے بھلانا کم از کم میرے لیے تو بہت دشوار تھا۔ جب تمہارا نام میرے ساتھ جڑ گیا تو کسی دوسرے کو ہم سفر بنانے کا خیال بھی میرے دل میں کیسے آتا اور ویسے بھی انتظار کا اپنا ہی مزہ ہے۔تو میرا اور کب تک انتظار کرسکتی ہوں صبا کی بات ختم ہوتے ہی اس نے دوسرا سوال داغا۔ لیکن جو کچھ اس نے سنا اس سے اس کی ہونٹوں پر خاموشی کی مہر لگ گئی۔

ساری عمر ابوذر ساری عمر اس نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا صبا کی آنکھوں میں سچائی تھی اسے اپنی حقیقی محبت مل گئی تھی اس کی منگیتر صبا کے روپ میں ۔اس نے باپ سے مل کر شادی کی رضامندی ظاہر کردی۔اور یوں ایک اچھی اور قابل بھروسہ لڑکی کو محبت کرنے والا شوہر مل گیا۔

☆☆......☆☆

سوچ

☆ہماری دنیا کا عجیب گورکھ دھندا ہے کہ ایک کسان سال بھر کی محنت و جانفشانی، گرمی، سردی اور برسات کی مصیبتیں جھیلنے کے بعد اتنے پیسے کما سکے کہ جس سے وہ صرف اپنے اہل وعیال کی پرورش کرے، لیکن ایک وکیل عدالت میں صرف آدھے گھنٹے کی بحث سے ایک قاتل کو بچا کر لاکھوں روپے کما لے۔

☆آپ اس لیے مغموم رہتے ہیں کہ آپ کے پاس یہ سوچنے کے لیے یہ وقت ہے کہ آپ خوش ہیں یا غمگین، کام کیجئے اور مصروف رہیے۔

☆اگر زندگی سے غم کے کانٹے چن لیے جائیں اور وہ سراپا گہوارہ مسرّت بن جائے تو ایسی زندگی دوزخ کا نمونہ ہوگی۔ (برنارڈ شاہ)

مرسلہ: آصف خان۔میرپوخاص

چیچہ وطنی سے ارسال کردہ تحریر

لمحوں کی غلطی

بعض اوقات ایک لمحہ ساری حیاتی پر بھاری

ہو جاتا ہے...... ایسا ہی اس بدنصیب لڑکی کے ساتھ بھی ہوا تھا......

عبدالغفار عابد

خدا نے جب جانداروں کو پیدا کیا تو انہیں جوڑوں کی شکل میں پیدا کیا۔ جانداروں کا جوڑوں کی شکل میں پیدا کرنا خدا کی نشانیوں میں سے ایک بہت بڑی نشانی ہے۔ اور جن الفاظ میں خدا اس پر تبصرہ فرماتا ہے وہ اسی کو زیب دیتا ہے۔ فرمایا لوگوں کے لیے سجا دی گئی ان خواہشات کی محبت، مال و دولت اور اولاد سے بھی پہلے عورت کا ذکر ہے۔ اس قدر سادہ الفاظ میں دنیا کی سب سے بڑی حقیقت کو بیاں کرنا خدا تعالیٰ کو ہی زیبا ہے۔ اگر یہ سجاوٹ ختم کر دی جائے تو انسان ان چیزوں سے محبت کرنا چھوڑ دے۔

ایک دوسرے سے محبت کرنے کے بارے میں ہر جگہ خدا یہی کہتا ہے کہ یہ محبت ہم نے تمہارے دلوں میں ڈالی اور اگر ہم نہ ڈالتے تو تم دنیا کی ساری دولت خرچ کر کے بھی دلوں میں محبت نہ پیدا کر سکتے' ایک دوسری جگہ فرمایا۔

''وہی خدا ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اس میں سے اس کا جوڑا بنایا تا کہ وہ اس سے سکون حاصل کرے۔''

آج کا معاشرہ مرد کے نام سے مشہور ہے اس معاشرے میں عورت کی کوئی قدر و قیمت نہیں، چودہ سو سال پہلے عورت کو زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ پھر نبی پاک ﷺ اس دنیا میں تشریف لائے آپ ﷺ نے عورت کی حیثیت کو واضح کیا۔ مردوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔

''تم عورت کو اہمیت دیا کرو۔'' آپ ﷺ نے عورت کی شان بڑھانے کے لیے اپنی چادر مبارکہ زمین پر بچھا دی۔ یہ خاتون کون تھیں کیا تھیں؟ کون نہیں جانتا میرے نبی ﷺ کی لاڈلی بیٹی فاطمہؓ

عورت کے بارے میں علامہ اقبال نے فرمایا۔

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

بچے، خوشبو، پھل، پھول، بارشیں، ٹھنڈی ہوا، پہاڑ، پانی سب خوبصورت چیزوں میں سے عورت شاید خوبصورت ترین ہے۔ عورت ان وجوہات میں شامل تھی جن کے لیے سلاطین نے آپس میں جنگیں

کیں۔

آج بھی عورت کی خاطر لڑائیاں ہو رہی ہیں کل تک ہماری مائیں، بہنیں اور بیٹیاں ہندوؤں، سکھوں سے اپنی عصمتیں بچاتی پھرتی تھیں۔ انہیں تب کوئی پوچھنے والا نہیں تھا آج بھی کوئی پوچھنے والا نہیں۔ محبت کی جنگ میں ہار ہمیشہ عورت کی ہوتی ہے کیونکہ مرد کی فطرت میں دھوکا ہے۔

آج کے معاشرے کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ اس معاشرے میں جینے کا حق صرف مرد کو ہے، عورت کو نہیں۔ مرد اپنی خواہش کے مطابق اپنی زندگی کو انجوائے کر سکتا ہے مگر عورت کو یہ حق حاصل نہیں۔ اگر کوئی عورت اپنی مرضی سے جینا چاہے تو اس کی سزا موت ہے۔

زیر نظر کہانی بھی ایک ایسی ہی لڑکی کی ہے جس نے اپنی مرضی کی زندگی جینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ کہانی ایک لڑکی نے دورانِ سفر مجھے سنائی۔ میں عید کی چھٹیاں گھر گزارنے کے بعد بذریعہ ٹرین واپس کراچی آ رہا تھا۔

میں اپنے برتھ پر لیٹا سچی کہانیاں پڑھ رہا تھا۔ میرے برابر والے برتھ پر لیٹی ایک لڑکی اپنے ٹچ موبائل میں مصروف تھی۔ رات کافی گزر چکی تھی اس وقت زیادہ تر مسافر سو رہے تھے۔ مجھے بھی اب نیند آ رہی تھی۔ میں سونے لگا تو لڑکی بولی۔

''بھائی یہ ڈائجسٹ مجھے دے دیں میں پڑھ کر واپس کر دوں گی۔'' لڑکی نے اپنا نام نازش بتایا میں نے اُسے ڈائجسٹ دیا اور سو گیا۔ جب میری آنکھ



کھلی تو صبح ہو چکی تھی وہ ابھی تک سچی کہانیاں پڑھ رہی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد ٹرین حیدرآباد ریلوے اسٹیشن رُکی تو مسافر ناشتہ کرنے ٹرین سے نیچے اترنے لگے کئی مسافروں نے جن میں زیادہ خواتین شامل تھیں اپنی سیٹوں اور برتھوں پر بیٹھتے ہی پھیری والے کو ناشتے کا آرڈر دے دیا۔ نازش نے بھی وہیں بیٹھے چائے بسکٹ کے ساتھ ناشتہ کیا جب میں ناشتہ کر کے واپس آیا تو اس نے شکریہ کے ساتھ سچی کہانیاں واپس کرتے ہوئے میرا نام پوچھا۔ میں نے اپنا نام بتایا میرا نام سن کر وہ بہت حیران ہوئی۔

"اچھا آپ رائٹر ہیں رسالے میں موجود دوسری دنیا کہانی آپ نے لکھی ہے۔"

"جی میں نے ہی لکھی ہے۔"

"آپ نے چکوال کے پہاڑی علاقے کی زبردست منظر کشی کی ہے عابد صاحب...... میں آپ کو اپنی دوست کی ناکام محبت کی داستان سناتی ہوں پلیز اس پر ضرور کہانی لکھیں۔" نازش نے اپنی دوست کی جو داستان مجھے سنائی وہ میں انہی کی زبانی آپ قارئین کو سناتا ہوں۔

ہمارے گاؤں میں ایک ہی پرائمری اسکول تھا۔ جہاں لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ بھائی وقار میں اور زیبی اسی اسکول میں پڑھتے تھے۔ زیبی ہمارے گاؤں کے ماسٹر یامین کی اکلوتی اولاد تھی۔

بچپن سے ہی اس کی شادی چچازاد بلال سے طے کر دی گئی تھی۔

ماسٹر صاحب سفید پوش آدمی تھے جن کا گزارہ صرف تنخواہ پر تھا مگر سادہ زندگی کی وجہ سے ان کی گزر بسر سکون سے ہو رہی تھی۔ بچپن پلک جھپکتے بیت گیا۔ پرائمری کے بعد ہم تینوں نے نزدیکی گاؤں کے ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا زیبی کے ابو خود موٹر سائیکل پر اسے اسکول چھوڑنے جاتے ہم دونوں بہن بھائی اپنے موٹر سائیکل پر اسکول جاتے' وقت گزرتا رہا یہاں تک کہ ہم نے میٹرک کر لیا۔ میٹرک کے بعد مجھے آگے پڑھنے کی اجازت نہ ملی۔

بھائی نے مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے شہر کے کالج میں داخلہ لے لیا۔ زیبی کو بھی اُس کے ابو نے شہر کے خواتین کالج میں داخل کرا دیا۔ ماسٹر صاحب نے زیبی کے لیے سواری کا بندوبست کر دیا۔ اب وہ دوسری طالبات کے ساتھ رکشے پر کالج جاتی۔"

"میری اور زیبی کی دوستی برقرار رہی جب کبھی اسے موقع ملتا وہ ہمارے گھر آ جاتی میں ہی نہیں سارے گھر والے اس سے پیار کرتے تھے میری شدید خواہش تھی کہ بھائی وقار کی شادی زیبی کے ساتھ ہو جائے' اس سلسلے میں جب میں نے زیبی سے بات کی تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ وہ بولی۔

"نازش ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کیونکہ میں زبیر سے محبت کرتی ہوں ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھا رکھی ہیں۔ زبیر شہر کا رہنے والا خوبصورت نوجوان لڑکا ہے۔

جس کی گرلز کالج کے سامنے کتابوں کی دوکان ہے۔

دونوں کی محبت کئی ماہ بکل مارے بیٹھی رہی' مگر یہ کافر اپنا وجود منوائے بغیر کب رہتی ہے' چاہت کی چنگاری سلگ اٹھے تو پھر کوئی پانی کارگر ثابت نہیں ہوتا۔

حسن امرا کی میراث نہیں کھلی رنگت اور تیکھے نقوش کی حامل سرو قد زیبی نے زبیر کی محبت کی خلعت پہنی تو جیسے جیون میں رنگ بھر گئے۔"

"دونوں کی محبت کے چرچے شہر کے بعد اب

گاؤں میں بھی ہونے لگے۔ ایک روز گاؤں کی نائن ہمارے گھر ایک شادی کا بلاوا دینے آئی تو اس نے بتایا کہ سارے گاؤں میں ماسٹر کی بیٹی کی باتیں ہورہی ہیں۔ کوئی ان باتوں پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا کیونکہ ماسٹر کا گھرانہ شرافت میں اپنی مثال آپ تھا ان کے خاندان کی عورتیں باپردہ اور بلاضرورت گھر سے باہر قدم نہیں نکالتی تھیں۔ پھر ایک دن اچانک یہ خبر ملی کہ زیبی کی شادی ہورہی ہے۔ شاید اس کے والد کو بھی وہ سن گن ہوگئی تھی جو گاؤں کے لوگوں کو ہوچکی تھی۔

بلال نے میٹرک کے بعد پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اپنے والد کے ساتھ کھیتی باڑی کا کام کرواتا تھا۔ وہ بدشکل اور عمر میں بھی زیبی سے بڑا تھا اس کے ساتھ زیبی کی جوڑی مناسب نہیں تھی۔ زیبی چودہ کلاسیں پاس ایک خوبصورت لڑکی تھی وہ گاؤں میں حور کے نام سے مشہور تھی۔

شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ اگلے روز نکاح تھا رات کو زیبی گھر سے غائب ہوگئی۔ یہ خبر گھر والوں پر بم بن کر گری شادی والے گھر صف ماتم بچھ گئی۔ گھر والوں کے علاوہ گاؤں والوں نے بھی اپنے ذرائع سے تلاش کیا مگر زیبی کا کہیں پتہ نہ چلا اس صدمے سے والدہ زندگی کی بازی ہار گئیں۔ ماسٹر صاحب نے نوکری چھوڑ دی اور گھر بیٹھ گئے وہ لوگوں کا سامنا نہیں کرنا چاہتے تھے۔''

بھائی وقار نے میڈیکل کی تعلیم مکمل کرلی تو اسے سرکاری اسپتال میں نوکری مل گئی۔ ایک دن وہ اپنے دوست کی شادی اٹینڈ کرنے لاہور گئے تو صاحب خانہ نے وقار کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا کہ خاطر تواضع مطلوب تھی۔

جب چائے کی ٹرے لے کر ایک لڑکی اندر آئی تو وقار اُسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ کوئی نہیں زیبی تھی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا جب وہ میز پر چائے کی ٹرے رکھ کر چلی گئی تو بھائی نے اپنے دوست اختر سے دریافت کیا۔

''یہ لڑکی کون تھی؟''

''یہ لڑکی نرس کے ریفرنس سے میرے پاس کام کی غرض سے آئی ہے مجھے گھر اور کلینک کے لیے ایک ملازمہ چاہیے تھی سو میں نے اسی کو رکھ لیا...... خیریت...... آپ کیوں اس کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔''

''یہ ہمارے گاؤں کے ماسٹر کی لڑکی ہے اس کا نام زیبی ہے عرصہ ہوا اچانک گھر سے غائب ہوگئی تھی۔ اس غم سے اس کی والدہ مرگئیں اور ماسٹر نے نوکری چھوڑ دی۔ براہ کرم آپ اس کو بلائیں میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' اختر صاحب نے زیبی کو بلایا۔

''زیبی آپ یہاں کیسے پہنچیں؟''

''وقار میں آپ کے سوال کا جواب بعد میں دوں گی پہلے آپ یہ بتائیں میرا گاؤں اور ماں باپ کیسے ہیں؟''

''آپ جس گاؤں اور گھر سے ناتا توڑ کر آئی ہو اب اس کے بارے میں پوچھنے کا فائدہ' آپ کی والدہ وفات پاگئیں اور والد نوکری چھوڑ کر گھر بیٹھ گئے ہیں وہ نیم مردہ حالت میں جی رہے ہیں۔''

''میں اپنے والدین کا گھر چھوڑ کر بہت پچھتا رہی ہوں کس منہ سے واپس گھر جاؤں میں خود واپسی کے سارے دروازے بند کر کے آئی ہوں۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''اب ایسا نہیں ہوسکتا کہ میں عزت کے ساتھ واپس اپنے گھر چلی جاؤں۔''

''اس کا حل بعد میں ڈھونڈتے ہیں پہلے یہ بتاؤ آپ گھر سے بھاگی کیوں تھیں؟''

''مجھے بلال پسند نہیں تھا میرے ابو زبردستی اس کے ساتھ میری شادی کرانا چاہتے تھے میں زبیر سے محبت کرتی تھی اس کا سہارا لے کر گھر سے بھاگی مگر وہ بے وفا نکلا پانچ مہینے وہ اور میں ساتھ رہے جب پیسے ختم ہو گئے بیچ راستے میں مجھے بے سہارا چھوڑ کر چلا گیا اب شہر میں میرا کوئی نہیں تھا اللہ نے مجھے ڈاکٹر صاحب سے ملا دیا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو اپنی کہانی سنائی تو انہوں نے مجھے کام پر رکھ لیا میں کلینک اور گھر کی صفائی وغیرہ کرتی ہوں اور ڈاکٹر صاحب کے گھر میں ہی رہتی ہوں۔'' جب وقار واپس جانے لگا تو زیبی نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔

''مجھے اپنے ساتھ گھر لے چلو میں اپنے باپ سے تو معافی مانگ لوں۔''

''آپ کے والد تو آپ کو معاف کر دیں گے مگر گاؤں والے تم کو کبھی معاف نہیں کریں گے۔''

''تم مجھے گھر جانے دو تا کہ میں گھر والوں سے اجازت لے لوں اور ان کے علم میں تو لاؤں کہ آپ اس وقت کہاں اور کس حال میں ہیں۔'' زیبی اس بات پر راضی ہو گئی۔

وقار گھر آیا ماسٹر صاحب اور گھر والوں کو ساری روداد بیان کی وہ مان گئے واپس جا کر وقار نے زیبی سے نکاح کر لیا۔ جب وہ گاؤں واپس آئے تو پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ گاؤں والوں نے حکم صادر کر دیا۔

''لڑکا اور لڑکی دونوں یہاں سے چلے جائیں۔ دوبارہ کبھی اس گاؤں میں نہ آئیں۔''

''ماسٹر صاحب کی عزت سارے گاؤں کی عزت تھی جس نے ماسٹر صاحب کی عزت کا خیال نہیں رکھا۔ وہ ہماری عزت کا کیا خیال رکھے گی۔'' بھائی نے لوگوں کو سمجھانا چاہا۔

مگر وہ لوگ بھائی سے بھی سخت متنفر ہو چکے تھے وہ یہ ماننے کو تیار ہی نہ تھے کہ بھائی نے یہ نکاح محض گاؤں کی عزت بچانے کے لیے کیا ہے۔

کسی نے بھائی کی بات نہ مانی۔ پنچائیت کا فیصلہ تھا کہ اگر وقار کو اپنی زندگی عزیز ہے تو وہ زیبی کو ساتھ لے کر ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلا جائے ورنہ دونوں کو گاؤں کے رواج کے مطابق سزا ملے گی۔ ابو نے بھائی کو سمجھایا۔

''تم زیبی کو ساتھ لے کر شہر چلے جاؤ۔'' بھائی اور زیبی شہر کرائے کے مکان میں رہنے لگے۔ کچھ دنوں بعد ابو نے اپنے حصے کی زمین بیچ کر شہر میں مکان خرید لیا۔

ہم سب گھر والے شہر میں رہتے ہیں۔ شادی کے ایک سال بعد بھابی کو گردوں کی تکلیف ہوئی ٹیسٹ وغیرہ کروائے تو پتہ چلا کہ دونوں گردوں میں پتھری ہے۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ اس کا فوری حل آپریشن ہے بھائی کا دوست ڈاکٹر کراچی آغا خان اسپتال میں سرجن ہے۔ بھائی نے اس سے مشورہ کیا تو اس نے کہا۔

''آپ بھابی کو کراچی لے آئیں۔'' وقار زیبی کو لے کر کراچی چلے گئے منگل کو زیبی کا آپریشن ہے میں اسپتال زیبی کے پاس رہنے کے لیے جا رہی ہوں۔''

بھائی نے نیکی کی زیبی سے نکاح کر کے اسے ایک نئی زندگی دی لیکن اس نیکی کے بدلے ہمیں گاؤں سے دربدر ہونا پڑا۔ ہمیں یہ سزا ملی کہ ہم گاؤں نہیں جا سکتے۔

کاش لوگوں کو عقل آ جائے اور وہ سمجھ سکیں کہ رسم و رواج اہم ہوتے ہیں مگر سب سے اہم انسان ہے اور سوائے شرک کے کوئی غلطی اتنی بڑی نہیں کہ اس کی معافی نہ مل سکے۔

☆☆......☆☆

کبیر والا سے ارسال کردہ انتہائی خوبصورت تحریر

تین سوال

بادشاہ نے اپنے وزیر کو آدھی سلطنت عنایت کردی تھی مگر شرط تھی کہ 3 سوالوں کے جواب لانے دوں گے......

شاہد رفیق سہو

''انسان کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی کیا ہے؟'' وہ رکا اور بولا۔

''دوسرا سوال انسان کی زندگی کا سب سے بڑا دھوکا کیا ہے؟'' وہ رُکا اور بولا۔

''تیسرا سوال انسان کی زندگی کی سب سے بڑی کمزوری کیا ہے؟'' ذلت بادشاہ کا موڈ اچھا تھا وہ نوجوان وزیر کی طرف مڑا اور مسکرا کر پوچھا۔

''تمہاری زندگی کی سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟'' وزیر شرما گیا اس نے منہ نیچے کرلیا بادشاہ نے قہقہہ لگایا اور بولا۔

''تم گھبراؤ مت بس اپنی زندگی کی سب سے بڑی خواہش بتاؤ۔'' وزیر گھٹنوں پر جھکا اور عاجزی سے بولا۔

''حضور آپ دنیا کی خوبصورت ترین سلطنت کے مالک ہیں میں جب بھی یہ سلطنت دیکھتا ہوں تو میرے دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے اگر اس کا دسواں حصہ میرا ہوتا تو میں دنیا کا خوش نصیب ترین شخص ہوتا۔'' وزیر خاموش ہوگیا بادشاہ نے قہقہہ لگایا اور بولا۔

''میں اگر تمہیں اپنی آدھی سلطنت دے دوں تو وزیر نے گھبرا کر اوپر دیکھا اور عاجزی سے بولا۔

''بادشاہ سلامت یہ کیسے ممکن ہے میں اتنا خوش قسمت کیسے ہوسکتا ہوں۔'' بادشاہ نے فوراً سیکریٹری کو بلایا اور اسے دو احکامات لکھنے کا حکم دیا۔ بادشاہ نے پہلے حکم کے ذریعے اپنی آدھی سلطنت نوجوان وزیر کے حوالے کرنے کا فرمان جاری کردیا دوسرے حکم میں بادشاہ نے وزیر کا سر قلم کرنے کا آرڈر دے دیا۔ وزیر دونوں احکامات پر حیران رہ گیا۔ بادشاہ نے احکامات پر مہر لگائی اور وزیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

''تمہارے پاس تیس دن ہیں تم نے ان تین دنوں میں صرف تین سوالوں کے جوابات تلاش کرنا ہیں تم کامیاب ہوگئے تو میرا دوسرا حکم منسوخ

ہو جائے گا اور تمہیں آدھی سلطنت مل جائے گی اور اگر تم ناکام ہو گئے تو پہلا حکم خارج سمجھا جائے گا اور دوسرے حکم کے مطابق تمہارا سر اتار دیا جائے گا۔'' وزیر کی حیرت پریشانی میں بدل گئی۔ بادشاہ نے اس کے بعد فرمایا۔

''میرے تین سوال لکھ لو۔'' وزیر نے لکھنا شروع کر دیا' بادشاہ نے کہا۔

''انسان کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی کیا ہے۔'' وہ رکا اور بولا۔

''دوسرا سوال انسان کی زندگی کا سب سے بڑا دھوکا کیا ہے؟'' وہ رکا اور بولا۔

''تیسرا سوال انسان کی زندگی کی سب سے بڑی کمزوری کیا ہے؟'' بادشاہ نے اس کے بعد نقارے پر چوٹ لگوائی اور با آواز بلند فرمایا۔

''تمہارا وقت شروع ہوتا ہے اب......'' وزیر نے دونوں پروانے اٹھائے اور دربار سے دوڑ لگا دی اس نے اس شام ملک بھر کے دانشور' ادیب' مفکر اور ذہین لوگ جمع کیے اور سوال ان کے سامنے رکھ دیے ملک بھر کے دانشور ساری رات بحث کرتے رہے لیکن وہ پہلے ہی سوال کے جواب پر متفق نہ ہو سکے وزیر نے دوسرے دن دانشور بڑھا دیے لیکن نتیجہ وہی نکلا وہ آنے والے دنوں میں لوگ بڑھاتا رہا مگر اسے کوئی تسلی بخش جواب نہ مل سکا یہاں تک کہ وہ مایوس ہو کر دارالحکومت سے باہر نکل گیا وہ سوال اٹھا کے پورے ملک میں پھرا مگر اسے کوئی تسلی بخش جواب نہ مل سکا وہ مارا



مارا پھرتا رہا شہر شہر گاؤں گاؤں کی خاک چھانتا رہا ۔

شاہی لباس پھٹ گیا پگڑی ڈھیلی ہو کر گردن میں لٹک گئی جوتے پھٹ گئے اور پاؤں میں چھالے پڑ گئے یہاں تک کہ شرط کا آخری دن آ گیا گلے دن اس نے دربار میں پیش ہونا تھا وزیر کو یقین تھا یہ اُس کی زندگی کا آخری دن ہے کل اس کی گردن کاٹ دی جائے گی اور جسم شہر کے مرکزی پل پر لٹکا دیا جائے گا۔

وہ مایوسی کے عالم میں دارالحکومت کی کچی آبادی میں پہنچ گیا آبادی کے سرے پر ایک فقیر کی جھونپڑی تھی وہ گرتا پڑتا اُس کٹیا تک پہنچ گیا۔ فقیر سوکھی روٹی پانی میں ڈبو کر کھا رہا تھا ساتھ ہی دودھ کا پیالہ پڑا تھا فقیر کا کتا شڑاپ شڑاپ کی آواز میں دودھ پی رہا تھا۔

فقیر نے وزیر کی حالت دیکھی قہقہہ لگایا اور بولا۔

''جناب عالی آپ صحیح جگہ پہنچے ہیں آپ کے تینوں سوالوں کے جوابات میرے پاس ہیں۔'' وزیر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

''آپ نے کیسے اندازہ لگایا میں کون ہوں اور میرا مسئلہ کیا ہے؟'' فقیر نے سوکھی روٹی کے ٹکڑے رکھے مسکرایا اپنا بوریا اٹھایا اور وزیر سے کہا۔

''یہ دیکھیے آپ کی بات سمجھ میں آجائے گی۔'' وزیر نے جھک کر دیکھا بورے کی طرف شاہی خلعت بچھی تھی وہ لباس تھا جو بادشاہ اپنے قریب ترین وزراء کو عنایت کرتا تھا' فقیر نے کہا۔

''جناب عالی میں بھی اسی سلطنت کا وزیر ہوتا تھا۔ میں نے بھی ایک بار بادشاہ سے شرط لگانے کی غلطی کی تھی۔ نتیجہ آپ کے خود دیکھ لیجیے۔'' فقیر نے اس کے بعد سوکھی روٹی کا ٹکڑا اٹھایا اور دوبارہ پانی میں ڈبو کر کھانے لگا وزیر نے دکھی دل سے پوچھا۔

''کیا آپ جواب تلاش نہیں کر سکے تھے۔'' فقیر نے قہقہہ لگایا اور جواب میں بولا۔

''میرا کیس آپ سے مختلف تھا۔ میں نے جواب ڈھونڈ لیے تھے۔ میں نے بادشاہ کو جواب بتائے آدھی سلطنت کا پروانہ پھاڑا بادشاہ کو سلام کیا اور اس کٹیا میں آ کر بیٹھ گیا میں اور میرا کتا دونوں مطمئن زندگی گزار رہے ہیں۔'' وزیر کی حیرت بڑھ گئی یہ سابق وزیر کی حماقت کے تجزیے کا وقت نہیں تھا۔ جواب معلوم کرنے کی گھڑی تھی چنانچہ وزیر اینکر پرسن بننے کی بجائے فریادی بن گیا اور فقیر سے پوچھا۔

''کیا آپ مجھے سوالوں کے جواب دے سکتے ہیں۔'' فقیر نے ہاں میں گردن ہلا کر جواب دیا۔

''پہلے دو سوالوں کے جواب مفت دوں گا لیکن تیسرے جواب کے لیے تمہیں قیمت ادا کرنی ہوگی۔'' وزیر کے پاس شرط ماننے کے علاوہ اور کوئی آپشن نہ تھا اس نے فوراً ہاں میں گردن ہلا دی۔

''دنیا کی سب سے بڑی سچائی موت ہے انسان کوئی بھی ہو کچھ بھی ہو اس سچائی سے نہیں بچ سکتا۔'' وہ رُکا اور بولا۔

''انسان کی زندگی کا سب سے بڑا دھوکہ زندگی ہے ہم میں سے ہر شخص زندگی کو دائمی سمجھ کر اس کے دھوکے میں آجاتے ہیں۔'' فقیر کے دونوں جواب ناقابل تردید تھے' وزیر سرشار ہو گیا اُس نے اب تیسرے جواب کے لیے فقیر سے

شرط پوچھی۔ فقیر نے قہقہہ لگایا کتے کے سامنے سے دودھ کا پیالہ اٹھایا وزیر کے سامنے رکھا اور کہا۔

"میں آپ کو تیسرے سوال جواب اس وقت تک نہیں دوں گا جب تک آپ یہ دودھ نہیں پیتے۔" وزیر کے ماتھے پر پسینہ آ گیا اس نے نفرت سے پیالہ زمین پر رکھ دیا وہ کسی قیمت پر کتے کا جھوٹا دودھ نہیں پینا چاہتا تھا۔ فقیر نے کندھے اچکائے اور کہا۔

"اب تمہارے پاس دو راستے ہیں تم انکار کردو شاہی جلاد کل تمہارا سر اُتار دے یا پھر تم یہ آدھا پاؤ دودھ پی جاؤ' اور تمہاری زندگی بھی بچ جائے گی اور تم آدھی سلطنت کے مالک بھی بن جانا' فیصلہ بہرحال تم نے کرنا ہے۔" وزیر مخمصے میں پھنس گیا ایک طرف زندگی اور آدھی سلطنت تھی دوسری طرف کتے کا جھوٹا دودھ تھا وہ سوچتا رہا یہاں تک کہ جان مال جیت گیا اور سیلف ریسپیکٹ ہار گئی وزیر نے پیالہ اٹھایا اور ایک ہی سانس میں دودھ پی گیا فقیر نے قہقہہ لگایا اور بولا۔

"میرے بچے انسان کی سب سے بڑی کمزوری غرض ہوتی ہے یہ اسے کتے کا جھوٹا پینے تک مجبور کر دیتی ہے۔ یہ وہ سچ ہے جس نے مجھے سلطنت کا پروانہ پھاڑ کر اس کٹیا میں بیٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

میں جان گیا تھا میں جوں جوں زندگی کے دھوکے میں آؤں گا میں موت کی سچائی کو فراموش کرتا جاؤں گا' میں موت کو جتنا فراموش کرتا رہوں گا میں اتنا ہی غرض کی دلدل میں دھنستا جاؤں گا اور مجھے روز اس دلدل میں سانس لینے کے لیے غرض کا غلیظ دودھ پینا پڑے گا لہٰذا میرا مشورہ ہے کہ زندگی کی ان تینوں حقیقتوں کو جان لو تمہاری زندگی اچھی گزرے گی۔" وزیر خجالت شرمندگی اور خود ترسی کا تحفہ لے کر فقیر کی کٹیا سے نکلا اور محل کی طرف چل پڑا وہ جوں جوں محل کے قریب پہنچ رہا تھا اس کے احساس اور شرمندگی میں اضافہ ہو رہا تھا اس کے اندر ذلت کا احساس بڑھ رہا تھا وہ اس احساس کے ساتھ محل کے دروازے پر پہنچا اس کے سینے میں خوفناک ٹیس اٹھی وہ گھوڑے سے گرا اور لمبی ہچکی لی اور اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

ہمیں کسی دن کسی ٹھنڈی جگہ پر بیٹھ کر زندگی کے ان بنیادی سوالوں پر ضرور غور کرنا چاہیے ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ ہم لوگ کہیں زندگی کے دھوکے میں آ کر غرض کے پیچھے تو نہیں بھاگ رہے ہم لوگ کہیں موت کو فراموش کر کے تو نہیں بیٹھ گئے ہم کہیں اس کہانی کے وزیر تو نہیں بن گئے مجھے یقین ہے کہ ہم لوگوں نے جس دن یہ سوچ لیا اس دن ہم غرض کے ان غلیظ پیالوں سے دور ہو جائیں گے۔

☆☆......☆☆

ترنم

ترنم سے پڑھنے والوں میں جمیل الدین عالی' ادیب سہارن پوری' قمر جلالوی' کلیم عثمانی' قتیل شفائی' ماہر القادری' حمایت علی شاعر' حفیظ جالندھری' زہرہ نگاہ' سحاب قزلباش اور حبیب جالب ان لوگوں میں ہیں جن کا ترنم دل پذیر ہوتا تھا۔ البتہ خدا کی پناہ کہ جو لوگ طفیل ہوشیار پوری' منور سلطانہ لکھنوی کا ترنم بھی برداشت کر لیتے تھے۔

(کشور ناہید کی کتاب "شناسائیاں رسوائیاں" سے اقتباس)

مرسلہ: رفیق ایس ایم۔ کراچی

خانیوال سے ارسال کردہ سچی کہانی

مقدر کا دوزخ

غلط راستے پر چلنے والوں کا انجام دنیا میں بھی دوزخ اور
آخرت میں بھی دوزخ ہے......ایک عیاش نوجوان کی داستان الم......

ڈاکٹر محمد امین قنالپوری

اعجاز بچپن سے ہی بالکل بھولا بھالا اور شریف ہونے کے ساتھ ساتھ خاموش طبع دنیا کے ہنگاموں سے بے خبر مگر تعلیمی میدان میں خاصا مقبول اور سمجھدار واقع ہوا تھا۔ اعجاز کالج کے ہاسٹل میں رہتا تھا۔ اسکول کے اور کالج کے سفر کے دوران وہ کافی حد تک بدل چکا تھا اور گزرتے ہوئے لمحوں کا اسیر ہوتا جا رہا تھا۔ اعجاز کا ایک روم میٹ سراج تھا جو کہ کافی حد تک ہوشیار اور چالاک تھا۔ سراج اور اعجاز چونکہ ایک ہی کمرے میں رہتے تھے تو ایک دن سراج نے اعجاز کو اپنے کمرے کی الماری سے ایک بند لفافہ دیتے ہوئے کہا۔

"دیکھو اس کو اعجاز...... تیرے کام کی چیز ہے......شاید تم نے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔" اعجاز نے تجسس بھرے انداز میں لفافہ اٹھایا جیسے ہی اس نے لفافے کو کھولا تو تصویریں گر پڑیں۔ بالکل اخلاق سے عاری عورتوں کی تصویریں تھیں۔ ان تصویروں کو دیکھتے ہی اعجاز کو غصہ آ گیا۔ سراج کو بڑے غصیلے انداز میں بولا۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے بہت ہی کمینے شخص ہو سراج تم......" بس پھر اعجاز نے ایک طویل لیکچر اخلاقیات پر دے ڈالا' سراج کھڑا ہنس رہا تھا۔ پھر اُس نے لفافہ اٹھایا اور الماری میں رکھتے ہوئے دوبارہ بولا۔ "اعجاز ایک بار پھر دیکھ لینا اسے بڑے کام کی چیز ہے یہ......" رات کو اعجاز بستر پر پڑا نیند کا انتظار کر رہا تھا۔ رات نے آدھا سفر ہی طے کیا تھا کہ اعجاز کی آنکھوں کے سامنے وہی سراج کی دی ہوئی تصویریں رقص کر رہی تھیں۔ مگر اعجاز بھی بے چارہ ایک انسان ہی تھا کمزور شخص تھا آخر ایمان ہار گیا۔ چند گھنٹے پہلے اخلاقیات کا درس دینے والا اب خود ہی ہار بیٹھا تھا۔ وہ دبے پاؤں اٹھا سراج کی دی ہوئی تصویریں دیکھنے لگا۔ اُس کی خواہش بڑھ گئی۔ وہ تصویر کی جگہ تصویروں والیاں دیکھنا چاہتا تھا۔ سراج بھی اس کی کیفیت سے باخبر تھا مگر اس بات کے انتظار میں تھا کہ ضرورت مند اپنی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔

بالآخر اعجاز کی ہمت ٹوٹ گئی۔ آخر اعجاز نے سراج سے دل کی بات کہہ ہی دی کہ میری ضرورت

پوری کرو اب اعجاز کو جو تعلیمی اخراجات ملتے وہ بھی عیاشیوں کی نذر ہونے لگے۔ اعجاز خوب موج مستیاں کرنے لگ گیا۔

اعجاز کی مسلسل گرتی ہوئی صحت اور اُس کے گھر والوں کے احساس کے طور پر سراج نے اعجاز کو سمجھانے کا فیصلہ کیا اور کہا۔

''اعجاز اب یہ سلسلہ بند کرو پھر یہ نہ ہو کہ واپسی کا راستہ بند ہو جائے اور سوائے پچھتاوے کے تمہارے ہاتھ کچھ نہ ہو۔'' مگر اعجاز جو ایک ایسی بری لت کا عادی ہو چکا تھا سراج کو کہنے لگا۔

''اب یہ ممکن نہیں ہے میں کوئی بچہ نہیں رہا۔'' یہ سلسلہ شیطان کی آنت کی طرح چل نکلا۔

زندگی نوچتے نوچتے اسی طرح اعجاز کو ساتھ لے جا رہی تھی۔ سراج نے ایک بار پھر اُس کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''اعجاز اب بھی کچھ نہیں بگڑا' لوٹ آؤ اپنے آپ کو ابھی سے ساری زندگی کے پچھتاوے سے بچالو۔'' مگر اعجاز کے دماغ میں اب یہ باتیں کہاں جگہ پاتیں۔ مگر وقت نے بھی تو اپنا مرہم لگانا تھا۔ دن بدن اب اعجاز خود میں کمزوری اور شرمندگی سی محسوس کرنے لگا تھا۔ ہر بُونے والا کاٹتا ضرور ہے۔

اب اعجاز کو گزرے وقت کا احساس ہونے لگا تھا۔ ماضی کی غلطیاں کسی فلم کی طرح اُس کی آنکھوں کے سامنے گزر رہی تھیں۔ اب اُسے وہ سب یاد آنے لگے جو دوست اُس کو مشورہ دیا کرتے تھے۔

اعجاز کالج سے واپسی پر اپنے کمرے میں آ کر خاموشی سے لیٹ گیا جیسے کسی کی دورانِ سفر جیب کٹ گئی ہو۔ وہ اپنے آپ کو بالکل خالی محسوس کر رہا تھا۔ اِسی کشمکش میں اعجاز نے رات گزاری۔ صبح ہوتے ہی اعجاز شہر کے قابل ڈاکٹر کے پاس گیا۔ اور



سارا حال بتا دیا۔
ڈاکٹر نے بڑی تسلی اور باریک بینی کے معائنے کے بعد اعجاز کو بتایا۔
''جناب تم ایک ایسی بیماری میں مبتلا ہو جس کا علاج ممکن نہیں ہے۔ ہاں اگر خدا مہربانی کرے تو اپنی قدرت سے تمہیں اس بیماری سے نجات دلا سکتا ہے۔'' اعجاز کو ڈاکٹر کی باتیں سمجھ نہیں آ رہی تھیں۔
''ڈاکٹر صاحب آپ کیا کہنا چاہتے ہیں میں کچھ سمجھا نہیں۔'' ڈاکٹر نے بتایا۔
''اعجاز اب تم اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکے ہو۔ یہ بیماری بازاری عورتوں سے لاحق ہوتی ہے۔ اگر تم باز نہ آئے تو تمہیں ایڈز ہو سکتا ہے۔ جو تمہاری زندگی ختم کر سکتا ہے۔ بہتر ہے تمہارے لیے کہ ان عادات سے پیچھا چھڑا لو۔''
اعجاز نے خود ہی ایک ایسے کام میں ہاتھ ڈالا تھا جس سے واپسی ممکن نہیں تھی۔ اب بھی وہ شکر کرتا تھا کہ ایڈز نہیں ہوئی۔ لمحوں کی خطا اور صدیوں نے سزا پانے والی بات تھی۔ وہ اب سنبھلنا چاہتا تھا۔

☆......☆......☆

اعجاز اب بوجھل زندگی کا بوجھ اٹھائے شرمندگی کا احساس لیے جینے پر مجبور تھا یہی اس کی تقدیر تھی۔ اب وہ اندر ہی اندر بکھرتا جا رہا تھا۔ وہ ایم اے انگلش کے فائنل میں تھا۔ ایم اے کر چکنے کے بعد اعجاز نے گھر کی راہ لی اور اپنے راز کو ہمیشہ کے لیے قبرستان دل میں دفن کر دیا۔ کچھ عرصہ بے روزگاری میں گزارا پھر اُس نے ایک کالج میں لیکچرار کی سروس جوائن کر لی اور خود کو حالات کے سپرد کر دیا۔
اور اِدھر گھر والوں کی طرف سے شادی کا مطالبہ زور پکڑتا گیا۔ اعجاز اپنی کلاس فیلو سلمٰی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ جو اُس کے لیے گھر والوں سے بھی بغاوت کرنے کو تیار تھی۔ سلمٰی کی ماں اُس کی مددگار تھی۔ کالج کی پڑھائی کے دوران اعجاز اکثر سلمٰی سے ملنے جایا کرتا تھا۔ شادی کے لیے اعجاز کی پسند کو ترجیح دی گئی۔ مگر شادی کرنے کے ساتھ اعجاز تھوڑا اولاد کی بات پر پریشان بھی تھا۔
یہ بات اعجاز کو کھائے جا رہی تھی۔ لیکن یہ کہہ کر اُس نے شادی کا ڈھونگ رچا ہی لیا کہ اس بربادی کا ذمہ دار وہ خود ہے آخر اولاد کا نہ ہونا میری قسمت میں ہی تھا۔
اعجاز کو شادی کا ڈھونگ رچائے دس سال کا عرصہ گزر چکا تھا مگر اولاد جیسی نعمت سے محروم تھا۔ سلمٰی جو اس بے قراری میں زندگی گزار رہی تھی آخر اعجاز سے کہہ ہی دیا کہ ہماری شادی کو دس سال کا عرصہ گزر چکا ہے مگر ابھی تک اولاد جیسی نعمت سے محروم ہیں۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے اعجاز کی ماں نے اعجاز سے سلمٰی کو طلاق دینے کا کہا اور بانجھ ہونے کا طعنہ دیا اور دوسری شادی کا مشورہ دیا۔
اعجاز سلمٰی کو دل و جان سے چاہتا تھا۔ اعجاز نے اپنی ماں کو سمجھایا کہ اولاد دینا تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔ سلمٰی کو طلاق دینے کا فائدہ کوئی نہیں، ایک رات اعجاز کی ماں نے سلمٰی کو پیر بابا کے پاس لے جانے کا مشورہ دیا۔
یہی بات اعجاز کو بتائی اعجاز نے نہ چاہتے ہوئے بھی کہا۔
''ہاں امی جان لے جائیں مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔'' اگلے ہی دن سلمٰی پیر بابا کے قدموں میں حاضر تھی۔ سلمٰی کی خوبصورتی کو دیکھ نام نہاد پیر بابا کی رال ہی ٹپکنے لگی۔ پیر بابا کی ذہنیت کھل کر سامنے آ گئی۔ جب پیر بابا نے سلمٰی کو ایک خاص وظیفے کے نام پر اکیلے آنے کے لیے کہا۔ اِدھر سلمٰی بھی اولاد کے حصول کے لیے مجبور تھی اگر وہ یہ نہ کرتی تو اعجاز کی ماں اِسے طلاق دلوا دیتی۔ اسی بات کا سہارا پیر بابا

نے لیا اور سلمیٰ کو بھی طلاق دلوانے کی دھمکی دی۔

طلاق کے نام پر سلمیٰ نے حامی بھرلی اُس کام کے لیے جس کام کا پیر بابا کہہ رہے تھے۔ بس پھر کمرے کی روشنی گُل کردی گئی۔ اِدھر اعجاز چھٹی پر گھر آیا تو سلمیٰ نے وہ رات بڑی خوشی سے گزاری۔

کچھ دنوں بعد اُس کو محسوس ہوا کہ اُس کے اندر کوئی دوسری زندگی کا وجود پرورش پارہا ہے۔ مگر اُسے معلوم تھا کہ یہ اعجاز کا بچہ نہیں ہے۔ اعجاز کی ماں دادی بننے والی تھی۔ مگر اسے کیا معلوم تھا کہ سلمیٰ کن مراحل سے گزر رہی ہے۔ اُس کا دل خون کے آنسو رورہا تھا۔ وہ سچ اور حقیقت کا سامنا کرنے سے ڈرتی تھی۔ وہ اندر سے کافی حد تک خوف زدہ تھی کہ کس طرح اعجاز کا سامنا کرے گی۔ یہ سب کچھ شاید اُس کے مقدر میں لکھا تھا۔

اِدھر سلمیٰ کی ساس یعنی اعجاز کی ماں آنے والے بچے کی گود بھرائی کی رسم منانے کی تیاری کررہی تھی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جارہا تھا سلمیٰ کی بے چینی بڑھتی ہی جارہی تھی۔ بالآخر وہ محشر کی گھڑی آہی گئی۔ گود بھرائی کی رسم کے دن سارا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ اور اعجاز بھی آنے والا تھا۔ اعجاز نے جیسے ہی گھر میں قدم رکھا اُس پر حیرانگی کا پہاڑ ٹوٹ پڑا اتنے سارے مہمان آخر کیوں؟ اُس کی امی نے بتایا۔

''آخر خدا نے ہماری سن لی اور تم باپ بننے والے ہو۔'' یہ سننا ہی تھا کہ اُس پر سرپر ایٹم بم گر پڑا۔

یہ خبر اعجاز کو ہضم نہیں ہورہی تھی۔ مگر بیچارہ مہمانوں کے سامنے مصنوعی مسکراہٹوں کا تبادلہ کرتا رہا رات ہوتے ہی اعجاز نے سلمیٰ سے پوچھا۔

''یہ تم نے کیا کردیا۔'' سلمیٰ اعجاز کو یقین دلانے والے انداز میں بولی۔

''میں قسم اٹھانے کے لیے تیار ہوں یہ آپ کا ہی بچہ ہے۔'' قسم کی بات سنتے ہی اعجاز نے سلمیٰ کا بازو پکڑا اور کمرے میں لے گیا اور فائل نکال کے دی اور کہا۔

''یہ رپورٹ پڑھو کہ میں باپ بننے کے قابل نہیں ہوں۔'' سلمیٰ جیسے جیسے رپورٹ پڑھتی گئی ویسے ویسے اُس کے چہرے کا رنگ اڑتا گیا۔ اعجاز نے سلمیٰ کو دھمکی دی کہ میں تمام لوگوں کو بتاتا ہوں کہ یہ میرا بچہ نہیں ہے یہ بچہ ناجائز ہے۔'' سلمیٰ نے کہا۔

''اگر تم نے اس بچے کے بارے میں لوگوں کو بتایا کہ یہ ناجائز اولاد ہے تو میں بھی لوگوں کو بتادوں گی کہ تم بھی نامرد ہو اور یہ رپورٹ اِس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔'' یہ بات سننے کے بعد اعجاز خاموش کھڑا ہوگیا۔ اعجاز کا اعتماد بھرا لہجہ ندامت میں تبدیل ہوچکا تھا۔

''سلمیٰ تم بے قصور ہو میں ہی تمہارا گناہ گار ہوں ۔ نہ میں تم سے شادی کرتا نہ تمام زندگی تمہاری اس طرح برباد ہوتی' نہ تم یہ قدم اٹھاتیں۔'' سلمیٰ نے اعجاز کو کہا۔

''آؤ آج رات ہم سمجھوتہ کریں اور ہم راز بن جائیں۔'' اعجاز کے پاس یہ بات ماننے کے سوا چارہ نہ تھا۔ پھر انہوں نے آپس میں معاہدہ کرلیا۔ اور خدا سے اپنے گناہوں کی خوب معافی مانگی دونوں اپنے کیے پر بہت شرمندہ ہوئے کچھ عرصے کے بعد خدا نے دونوں کو دو بیٹوں سے نوازا۔ شاید خدا نے دونوں کی معافی قبول کرلی تھی۔

مگر یہ خوشی بھی دونوں کے ضمیر کے بوجھ سے بڑھ کر نہ تھی۔ دونوں بظاہر خوش نظر آتے مگر اندر ہی اندر ریزہ ریزہ ہوچکے تھے۔ اعجاز اندر سے بکھرا ہوا تھا۔ اِس کو سمیٹنے والا کوئی نہ تھا' اور یہی اعجاز کا مقدر تھا۔

☆☆......☆☆

ساہیوال سے ارسال کردہ پُر ہول داستان

طاغوت

وہ بھی جادو سیکھنا چاہتا تھا' جنات اور تمام شیطانی قوتوں پر قابو پانا چاہتا تھا' پھر کامیاب بھی ہوگیا' ایسے نوجوان کی کہانی جو آج بھی منتظر ہے کہ شیطان اس سے راضی ہو جائے......

محسن علی طاب

میری داستان عجیب و غریب ہے میں اپنی والدہ کا واحد سہارا ہوں والد میری پیدائش کے چند ماہ بعد ہی دنیا چھوڑ گئے میری والدہ نے ہی مجھے پالا میرے بھی شوق نرالے تھے۔

میں جب گیارہ سال کا تھا تو فلمی اسٹار ثنا کو خط لکھا کرتا تھا۔ اس کی فلمیں مجھے بہت پسند تھیں' خط پر ثنا کا پتہ فلمی اسٹار ثنا کو ملے لکھ دیتا آج سوچتا ہوں پوسٹ آفس والے میرے خطوط پڑھ کر کتنا ہنستے ہوں گے اب مجھے نیا چسکا پُر اسرار ناولز کا لگ گیا اور مجھ میں جادوگر بننے کا شوق پیدا ہوگیا۔ مختلف کتابیں بازار سے خرید لاتا۔ والدہ سے چھپ چھپ کر منتر پڑھتا وہ ایسی چیزوں کے سخت خلاف تھیں۔ ڈانٹا کرتی تھیں ایک دن میں نے جنات والا منتر پڑھا والدہ سوئی ہوئی تھیں رات کے ایک بجے کا وقت تھا۔ میرے منتر کی تعداد پوری ہوگئی پھر میں والدہ کے قریب چارپائی پر آ کر سو گیا تھوڑی دیر بعد آنکھ کھلی تو دیکھا کمرے میں اندھیرا ہے والدہ سوئی ہیں اور دروازہ کھلا ہے میں ڈر گیا کہ کہیں جن تو نہیں آ گئے ہم دروازہ اندر سے بند کر کے سوتے تھے۔

میں نے والدہ کو اٹھایا اور سب بتا دیا والدہ بھی ڈر گئیں کہ جا کر چیک کرو کہیں کوئی چور ہی نہ آئے ہوں میں نے صاف انکار کر دیا۔ والدہ اٹھیں اور آگے بڑھیں اور جا کر دیکھا تو وہ دروازہ نہیں کھڑکی تھی دروازہ بند تھا کھڑکی جالی والی تھی ایک کھڑکی ہم کھلی رکھتے تھے۔

میں نے عمل پڑھا تھا خود بھی ڈرا اور والدہ کو بھی ڈرا دیا پھر والدہ نے مجھے اچھی خاصی سنائیں دو چار ہاتھ میں جڑ دیے اور میں بلبلا کر رہ گیا وہ دو چار جو والدہ نے مجھے سنائیں مجھے علم تھا پورے محلے نے سنی ہوگی اب صبح میرا مذاق اڑایا جائے گا۔ آپ بھی پڑھ کر ہنس رہے ہو گئے میرا یہ قصہ بہت مشہور ہوا پھر ایک دن میں اپنے دور کے رشتے داروں کے گھر گیا۔ وہاں میرا ایک اچھا دوست بن گیا نام جواد تھا مخلص دوست تھا کہا کرتا تھا کبیر یار چھوڑ جادو کو ایویں ہے مگر اس کی والدہ جو میری طرح ہی تھیں میری حوصلہ افزائی کیا کرتی تھیں۔ یہاں بھی ایک پُر

مزاح واقعہ پیش آیا ہوا یوں کہ میرے دوست کی والدہ رخسانہ میری حامی تھیں سب کے سامنے کہنے لگی۔ ”پُتر تم یہاں بیٹھ کر عمل پڑھو میں یہاں سوٹا لے کر بیٹھ جاتی ہوں کوئی آئے گا تو ڈنڈے مار مار کر بھگا دوں گی۔“ میرے ذہن میں بھی شرارت آئی۔

سب گھر والے ہمارا مذاق اڑانے کے بعد کمروں میں جا کر سو گئے اور میں اور ماں جی اپنی بات پر ڈٹے رہے میں دائرہ بنا کر پڑھائی کے لیے بیٹھ گیا۔

ماں جی مجھ سے 20 قدم کی دوری پر بیٹھی تھیں اُن کے پاس ہی سوٹا پڑا تھا صحن میں اندھیرا تھا یاد رہے میں چک میں تھا یہاں دروازے وغیرہ کا رواج نہیں تھا کیونکہ سب مل کر رہتے تھے سادہ دل لوگ تھے ڈاکوؤں کا خطرہ ہی نہ تھا یہ تو آج ہے جب مال اور دولت کی ہوس زیادہ ہو جائے تو پھر ڈاکو جنم لیتے ہیں جبکہ دیہات کے لوگ کم پر ہی گزارا کرتے ہیں اس لیے سکون سے سوتے ہیں۔

قریباً ایک گھنٹے بعد میں نے سامنے کی طرف دیکھ کر کہا۔

”او کی چیز اے......“ اس کے ساتھ ہی جوتی اٹھائی اور دوڑ لگا دی میرے ذہن میں شرارت تھی ماں جی بھی ڈر گئیں اور سوٹا پھینک بھاگ اٹھیں وہ ایک بار بکریوں کو باندھنے والے زمین میں گڑے لکڑی کے کیل سے اُلجھ کر گری اور بولی۔



”کبیر پتر مینوں وی لیندا جا......“ پر میں بہت آگے نکل گیا تھا پھر وہ بھی جوتی چھوڑ کر میرے پیچھے پیچھے بھاگ آئی ہم نے ٹیوب ویل پر جا کر سانس لیا اُن کی آواز نے گھر والوں کو جگا دیا تھا انہوں نے ہمیں بھاگتے دیکھ لیا تھا وہ بھی ہمارے پاس پہنچ گئے۔

جب انہیں اصل واقعہ معلوم ہوا انہوں نے ہم دونوں کا خوب مذاق اڑایا میرے دوست جواد اور اُس کی بہنوں کے ہنس ہنس کے آنکھوں میں آنسو آ گئے میں اور ماں جی سر جھکائے بیٹھے تھے ماں جی کبھی کبھی سر اُٹھا کر دیکھتیں تو اُن کی آنکھوں میں سوال نظر آتا۔

”وے کبیر پُتر رکھوالی دا اے صلہ دیتا......“ ہم دونوں کئی دنوں تک شرمندہ رہے۔ میں اس لیے کہ بلاوجہ انہیں تنگ کیا وہ بڑی تھیں ان سے ایسی شرارت نہیں کرنی چاہیے تھی اور وہ اس لیے کہ ایک لڑکے نے اُن کی بہادری کا بھانڈا پھوڑ دیا۔

جادوگر بننے کے لیے میں ایسے ایسے لوگوں سے ملا جن پر مجھے بہت حیرت ہوئی کمال کی بات یہ تھی کہ اُن میں سے کوئی بھی اپنے آپ میں مکمل نہ تھا اُن کے پاس محدود علم تھا۔

آخر کار میری دن رات کی بھاگ دوڑ رنگ لے آئی۔

مجھے پتہ چلا کہ ایک عیسائی پادری کالے علم کا بے تاج بادشاہ ہے میں فوراً اُس کے علاقے کی طرف روانہ ہو گیا وہاں سے چرچ کا پتہ معلوم کیا جو کہ آسانی سے مل گیا اس عیسائی پادری کا نام مائیکل جوزف تھا مگر لوگ اُسے پادری جوزف کہتے تھے میری اُس سے آسانی سے ملاقات ہو گئی وہ سیاہ فام تھا بہت معصوم اور کمزور نظر آیا مگر بعد میں پتہ چلا کہ وہ کتنا درندہ صفت شیطان ہے۔

میں نے پادری جوزف کا منت ترلہ کیا کہ مجھے اپنا شاگرد بنا لے مگر اُس نے انکار کیا۔

جب میں نے اُس کے پاؤں پکڑے تو اُس نے حامی بھر لی۔

”ٹھیک ہے تم یہاں چرچ میں کام کرو میں دیکھوں گا تم کتنے مخلص ہو پھر تمہیں اپنا شاگرد بنانے کا سوچوں گا۔“

پھر وہ کام وہاں مجھ سے لیے گئے جو میرے مزاج کے خلاف تھے باتھ روم صاف کیے کھانا بنایا کپڑے پریس کیے چرچ میں اتنا تنگ کیا گیا کہ اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو بھاگ جاتا۔ پھر آٹھ روز بعد مجھے طلب کیا اور جوزف نے مجھے اپنی شاگردی میں لے لیا۔

پہلے اُس نے مجھ سے حلف لیا کاغذات پر دستخط کروائے اِن سب باتوں کا مقصد یہ تھا کہ جو کچھ میں یہاں دیکھوں وہ صرف اپنی ذات تک رکھوں آنکھیں کان کھلی رکھوں مگر زبان بند......

پھر ایک دن جوزف مجھے لے کر اپنے دفتر میں آیا تو اُس نے ایک کیل جو دیوار میں لگی تھی دبائی تو سامنے کی دیوار ہٹ گئی وہاں سے سیڑھیاں نیچے جاتی نظر آئیں۔ سیڑھیاں اتر کر ہم نیچے آئے تو ایک خالی کمرہ تھا وہاں چند لمحے رُکے پھر سامنے کی دیوار میں دروازہ کھل گیا بعد میں پتہ چلا اس کمرے میں کیمرہ اور چاروں طرف ہتھیار چھپائے تھے۔ اگر کوئی غیر متعلق بندہ اس طرف آئے تو اُسے مار ڈالا جائے اور کسی کو پتہ بھی نہ چلے۔ آگے ایک وسیع ہال تھا وہاں اندھیرا تھا مگر کافی سیاہ لباسوں میں ملبوس لوگ نظر آئے جوزف نے ایک خالی کرسی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”وہاں بیٹھ جاؤ جو دیکھو بس اپنے تک رکھو ورنہ انجام کے ذمہ دار خود ہو گے۔“ جوزف چلا گیا۔ پھر

ہلکی ہلکی روشنی پھیل گئی وہاں سامنے شیطان کا بت نصب تھا۔ پھر ایک لڑکی کو لایا گیا جو کہ بندھی ہوئی تھی انہوں نے اُسے ذبح کیا اور خون نچوڑ لیا اور وہ خون جوزف کو پیش کیا گیا اور جوزف نے کچھ پڑھ کر پھونکا اور حکم دیا۔

''اِس کو سب کو پلا دو۔'' سب نے ایک ایک گھونٹ پیا چونکہ میرا اسفلی علوم کے ماہروں سے واسطہ رہا اس لیے مجھے علم تھا یہاں ایسا ہوگا۔ میں بھی خون پیا۔ جیسے خون حلق سے اترا ایسا لگا کہ جسم میں زلزلہ آ گیا ہو۔ ایسا محسوس ہونے لگا کہ جسم کی رگوں میں اب خون نہیں لاوا دوڑ رہا ہو۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں بہت طاقتور انسان بن گیا ہوں بعد میں جوزف نے بتایا۔

''یہ شیطان کی طرف سے اپنے چاہنے والے کے لیے پہلا تحفہ ہوتا ہے جو پی لے وہ شیطان کا چیلہ بن جاتا ہے کالا علم شیطان کا ہی جادو ہے۔ اس میں بہت سی ایسی حرکتیں کرنی پڑتی ہیں کہ بندہ سوچ بھی نہیں سکتا۔'' میں نے جوزف سے خصوصی عمل بھی سیکھ لیا تھا۔ یہ ایک خاص منتر تھا جس کو چھ لاکھ بار پڑھنا تھا تعداد پوری ہوتے ہی مطلوب کی آواز سنائی دیتی اور عمل ختم ہو جاتا۔

شروع کے چند دن تو دشواری ہوئی مگر بعد میں میں منتر پڑھنے کی مشین بن گیا۔ پتہ نہیں کتنے دن بعد ایک نرم سی آواز سنائی دی۔

''آج سے تم میرے خاص چیلے ہو جاؤ تمہیں میں نے کالے علم کی بڑی قوتیں عطا کیں۔ ہم تم سے خوش ہیں جاؤ اب جوزف کا خاتمہ کر کے اس کی جگہ سنبھال لو' تم میں وہ تمام خصوصیات ہیں جو ہمارے خاص بھگت میں ہونی چاہئیں تم نڈر ہو اور یہی بات ہمیں پسند آ گئی۔'' یہ سچ تھا مجھے عمل کے دوران بہت ڈرایا گیا کافی بار دل کیا بھاگ جاؤں مگر عمل چھوڑنے کا مطلب موت تھا بھیانک موت......

مگر میں ہمت کر کے عمل کرتا رہا اور اس لیے کامیاب بھی ہوا۔ اب اگلا قدم جوزف کو جہنم رسید کر کے اُس کی گدی سنبھالنا تھا میں اُسے نہیں مارتا تو وہ مجھے مار دیتا۔ عمل کے بعد شیطان نے مجھے طاغوت کا نام دیا اور کہا کہ اس ملک میں' میں اُس کا نمائندہ ہوں۔ میں بہت خوش ہوا اب بہت سی پُراسرار قوتیں میرے پاس تھیں میں نے سب سے پہلے جوزف کو عبرت ناک موت کا شکار بنایا اور اس کے جسم کے ٹکڑے چیلوں میں تبرک کے طور پر بانٹے اور جوزف کا خون پیا۔

چرچ کے دوسرے پادری کو شیطان کی کالی قوتوں نے آگاہ کر دیا تھا کہ اب میں جوزف کی جگہ ہوں اور شیطان نے مجھے اپنا نائب بنایا ہے اور طاغوت کا نام مجھے دیا ہے دراصل طاغوت کا مطلب بھی شیطان ہی ہوتا ہے میں نے چرچ میں پادری کو اپنا نائب بنا کر چھوڑا اور اُسے کہا۔

''میں جہاں بھی ہوں رات چرچ میں گزاروں گا۔'' پھر میں اپنے چک واپس آ گیا میری والدہ نے میری خوب خبر لی مگر میں نے یہ کہہ کر جان چھڑائی کہ میں شہر میں کام کی تلاش میں گیا تھا بڑا آدمی بننے کے لیے اور ماں کو کافی پیسے دیے ماں حیران ہوئی اور خوش بھی' وہ سیدھی سادھی تھی ماں کو میں نے بتایا کہ میں چند دن کی چھٹی پر آیا ہوں دوبارہ واپس جاؤں گا اور ہر ماہ چھٹی پر پیسے دینے اور ملنے آیا کروں گا۔''

ماں نے میرا یقین کر لیا رات کو میں الگ کمرے میں سویا اور دروازے کو اچھی طرح بند کر کے اپنے منتر کے شیطان کی ڈیوٹی لگا کر چرچ آ گیا یہاں وہی معمول رہا نئے آنے والوں سے ملاقات کی خوش آمدید کہا اور خون پیا اور پادری کو شاباش دے کر واپس آ گیا اور سو گیا۔

دوسری صبح ماں نے کھیر بنائی سب کے گھر دے کر آئی ماں بہت خوش تھی کہ میں سدھر گیا ہوں مگر انہیں کیا معلوم تھا میں تو اب دن کو کبیر اور رات کو طاغوت تھا۔

میں ماں سے اجازت لے کر جواد کی طرف چل پڑا اُس نے کافی گلے شکوے کیے اور اُس کو بھی میں نے نوکری والا چکر دے کر مطمئن کیا اور تحفے دیے ماں کی بھیجی کھیر دی اُس کی ماں نے بھی مجھے گلے لگا کر پیار کیا۔ سارا دن وہاں رہا پھر واپس آ گیا اور سو گیا کیونکہ میں شام کے بعد گھر پہنچا تھا اور دیہات میں رات جلدی ہو جاتی ہے رات کو بھی منتر کے شیطان کی ڈیوٹی لگا کر چرچ سے ہو آیا۔ دوسرے دن ماں نے بتایا۔

''نئے پڑوسی آئے ہیں جا کر مل آؤ۔'' میں اُن کے مردوں سے مل آیا دوپہر کو اُن کی ایک لڑکی صبا ہمارے گھر آئی۔

اُس نے امی کے سامنے میرا مذاق اڑایا وہ پرانے واقعات دہرائے میں خاموش رہا مگر دل میں تہیہ کر لیا اِس کو مزہ نہ چکھایا تو میں بھی طاغوت نہیں دراصل وہ جادو کو جھوٹا کہہ رہی تھی اور جنات کے وجود سے بھی انکاری تھی اُس کا کہنا تھا کہ اکیسویں صدی میں ایسا ممکن نہیں ہے۔

اُس رات چرچ میں چکر لگانے کے بعد میں غائب حالت میں صبا کے گھر داخل ہوا اور صبا کے کمرے کے سامنے آ کر رک گیا دروازہ بند تھا میں نے اوپر دیکھا تو روشن دان تھا میں نے منتر پڑھا اور دھواں بن کر کمرے میں داخل ہو گیا۔ پھر دھویں سے اپنی اصل حالت میں آیا صبا اکیلی نہیں تھی اُس کے ساتھ اُس کی بہن بھی سوئی ہوئی تھی۔

میں نے منتر پڑھ کر سب سے پہلے صبا کی زبان بندی کی اور ایک اور منتر سے اُسے جامد کر دیا پھر منتر پڑھ کر روپ بدلا جو کہ خوفناک تھا اتنا کہ انسان برداشت کر سکے۔

صبا کو جگا دیا وہ جب مکمل جاگ گئی تو پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی پھر اُس کی آنکھوں میں خوف اتر آیا۔ میں نے اُسے مخاطب کیا اور کہا۔

''تم ہمارا مذاق اڑاتی ہو ہم موجود ہیں تم حرکت نہیں کر سکتی ہو اور نہ بول سکتی ہو یہی ہماری نشانی ہے آئندہ ہمارا مذاق نہ اڑانا ورنہ بہت بری سزا ملے گی۔'' پھر صبا سے اپنا اثر ختم کر کے غائب ہو کر اپنے گھر آ کر سو گیا۔ دوسری صبح امی نے بتایا۔

''کل جو لڑکی آئی تھی وہ اچانک بہت بیمار ہو گئی ہے اچھی بھلی لڑکی پتہ نہیں کیا ہو گیا۔'' امی بہت افسردہ تھیں۔ انہوں نے ہی مجھے بتایا۔

''وہ چیختی ہے کہ وہ مجھے مار ڈالے گا اور پھر بے ہوش ہو جاتی ہے۔'' میں نے منتر پڑھ کر اُس کا تصور کر کے پھونک دیا۔ بعد میں پتہ چلا وہ ٹھیک ہو گئی تھی مگر کبھی کبھی ڈر جاتی تھی۔

میں نے اپنے علم سے کافی لوگوں کی مدد کی مگر میں دن کو کبیر اور رات کو طاغوت تھا۔

ایک دن میں ویسے ہی بیٹھا ہوا تھا جواد آیا اور بتایا۔

''چوہدری ہاشم کی بیٹی اغواء ہو گئی ہے۔''

ہاشم ہمارے چک کا رحم دل چوہدری تھا ہر شخص کی مدد کرتا تھا میں نے بھی اُس کے پاس چند دن کام کیا تھا۔

جب رات ہوئی تو میں نے ہاشم کی بیٹی کا لباس جو پہنا ہوا تھا جادوئی طاقت سے منگوایا اور اس کی جسم کی مخصوص خوشبو سے جو کہ کنوارے بدن کی ہوتی ہے۔

اس تک جا پہنچا میں غائب حالت میں تھا میں عین وقت پر پہنچا تھا وہ ایک ہندو پجاری کے مندر

میں کمرے میں تھی اور لباس تار تار تھا بہت خوفزدہ تھی اور ایک ہٹا کٹا پجاری اُس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

میں نے لڑکی کو پجاری کی آنکھوں سے اوجھل کر دیا۔

پجاری اچھل پڑا لڑکی وہیں موجود تھی مگر پجاری کو نظر نہیں آ رہی تھی۔ پجاری بولا۔

"کون ہے تو جو میرا شکار چھین کر لے گیا سامنے آ اگر ہمت ہے تو......" میں نے پجاری سے کہا۔

"تیری شامت اعمال ہوں جتنے پاپ تو نے کیے ہیں سب یاد کر لے۔" میں نے منتر سے لڑکی کو بے ہوش کر دیا تا کہ وہ یہ منظر نہ دیکھ سکے پھر ایک منتر پڑھ کر پجاری کی طرف پھونکا اور وہ لمحوں میں ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ لڑکی کو اس کے گھر اُس کی خواب گاہ تک پہنچا کر ہوش دلا کر واپس آ گیا اور پھر چرچ چلا گیا وہاں سے واپسی پر سو گیا اس طرح دن اور راتیں گزرنے لگیں میں نوکری کے بہانے شہر میں فلیٹ خرید کر رہنے لگا۔ سارا دن آوارہ گردی کرتا لوگوں کی مدد کرتا اور رات کو طاغوت بن جاتا۔

کہتے ہیں نا کہ گندے عمل کا اختتام ضرور ہوتا ہے اور عمل کرنے والے کا بھی، تو میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔

ایک گھر میں ایک بچہ بیمار تھا مجھ سے اُس کے باپ کی تکلیف نہ دیکھی گئی میں اُس سے عامل کی حیثیت سے ملا اس لڑکے پر جن تھا میں نے جن کو مار کر بچے کو آزاد کروا کر ٹھیک کر دیا۔ میں رات کو آ کر سو گیا رات کو آنکھ کھلی یہ میرے چرچ جانے کا ٹائم تھا مگر اُس وقت سیاہ لباسوں میں ملبوس کچھ لوگ میرے اردگرد کھڑے تھے۔ اُن میں ہی سے ایک بولا۔

"تم نے اُس جن کو مار کر اچھا نہیں کیا وہ شاہِ جنات کا بیٹا تھا تم سے تمہاری تمام کالی قوتیں جدا کر دی گئی ہیں اب تم ایک عام سے انسان ہو اب تم طاغوت نہیں بن سکو گے وہ چرچ بھی جلا دیا گیا ہے صرف تمہارے کچھ اچھے کاموں کی وجہ سے تمہیں چھوڑ دیا ہے مگر تمہیں سزا ضرور دی جائے گی۔ یہی سزا تمہارے لیے کافی ہے کہ اب تم ایک خالی ڈھول ہو اب تم کبھی علم حاصل نہ کر پاؤ گے۔" اس کے ساتھ ہی وہ چلے گئے میری محنت سے حاصل کی گئی طاقت ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔

دوسرے دن میں چرچ گیا تو واقعی ہی چرچ جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ اس دن مجھے جواد کی بات یاد آئی جادو دھوکہ ہے کتنا حسین دھوکہ ہے وہ دن اور آج کا دن میں نے بہت کوشش کی کہ ایک بار پھر سے وہ تمام طاقتیں حاصل کر سکوں مگر میں ہر بار ناکام ہوا حالانکہ میں نے برے عمل نہیں کیے تھے۔ مگر غلاظتیں تو کھائی تھیں انسانی خون تو پیا تھا بس یہ باتیں مجھے اکثر کچوکے لگانے لگیں۔ کچھ عرصہ تو میں جلے پاؤں کی بلی کی مانند پھرتا رہا آخر کار تھک کر بیٹھ گیا۔

آج کریانے کی ایک چھوٹی سی دکان ہے۔ امی نے صبا سے میری شادی کروا دی جواد آج بھی میرا بہترین دوست ہے۔ زندگی سکون سے گزر رہی ہے صبا آج بھی سوتے میں کبھی کبھار ڈر جاتی ہے۔ اب وہ جنات اور جادو دونوں کے وجود کو تسلیم کرتی ہے۔ جب مجھ سے کہتی ہے۔

"کبیر آپ نہیں سمجھ سکتے کہ میں نے کیسی ڈراؤنی آنکھیں دیکھی تھیں۔" تب میں مسکرا کر اپنا چہرہ دوسری جانب کر لیتا ہوں۔

مجھے یقین ہے کہ کبھی نہ کبھی شیطان مجھ سے ضرور راضی ہو جائے گا۔

☆☆......☆☆

قمبر شہدادکوٹ سے ارسال کردہ تحریر

غیرت کے نام پر بے غیرتی

ہمارے معاشرے میں لڑکی کو جاگیر سمجھا جاتا ہے......کاش

اس کو بھی انسان سمجھیں اس کو بھی جینے کا حق دیں......

مور شاہد حسین

گلابو روزانہ صبح سویرے بھینسوں کے گوبر کے اپلے بنا کر گھر کی چھت پر تھاپتی تھی قریب نہر کے کنارے کھڑا عابد نہایت ہی محبت بھری نظروں سے اُسے دیکھتا تھا۔ اُس کا جی چاہتا کہ وہ سر سے پاؤں تک اسے اپنی آنکھوں میں بسا لے۔ وہ نظروں ہی نظروں میں اس پر قربان جاتا اور اپنی محبوبہ کو دیکھ کر آہیں بھرتا تھا۔ مگر دوسری طرف گلابو اس سے بالکل بے خبر اپنی دنیا میں مگن تھی۔

ایک روز گھر کی چھت پر بھینسوں کا گوبر تھاپتے ہوئے گلابو کو محسوس ہوا کہ اُسے کوئی دیکھ رہا ہے اس نے چونک کر چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ اس کی اِدھر اُدھر جھانکتی ہوئی نظریں سیدھی نہر کے کنارے کھڑے عابد پر رک سی گئی۔

عابد نے لمحے کی تاخیر کیے بغیر کپکپاتے ہاتھ سے اُسے اشارہ کر کے اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کی۔ گلابو اس کی اس حرکت پر بری طرح چونکی اور پریشان ہوگئی کہ وہ اسے کیوں عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا ہے اور کیا چاہتا ہے وہ یہی سوچ رہی تھی کہ عابد نے ایک بار پھر فضا میں ہاتھ لہرا کر وہی حرکت دہرائی۔

گلابو کا دل دھک سے رہ گیا وہ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں سیڑھیوں کی طرف مڑی اور تیزی سے نیچے اتر گئی تو عابد کا دل ڈوبتا چلا گیا اس کے لیے جہاں کی ساری فضا ویرانی اور اُداسی میں ڈوب گئی۔

حسب معمول دوسرے دن گلابو جیسے ہی چھت پر آئی اس کی نگاہیں بے اختیار نہر کی طرف بھٹک گئیں۔ جہاں دیدار کی چاہ میں جانے کتنی دیر سے عابد اسی کا منتظر تھا۔ اسے دیکھتے ہی عابد کے دل میں خوشی کی لہر سی دوڑ گئی مگر گلابو اس پر نظر پڑتے ہی بے تحاشا بھاگی اور عابد اپنا دل مسوس کر رہ گیا ایک سسکتی آہ اس کے لبوں سے پھسل گئی اس کی سانسیں تھم سی گئیں سارا وجود ساکت ہوگیا اور آنکھوں میں ویرانی جمع ہونے لگی ایک ہی لمحے میں سارے جہاں پر ویرانی اور اُداسی بکھرتی چلی گئی وہ بے تابی سے ٹہلنے کے انداز میں چلتا رہا ٹکتا رہا۔

عابد آنکھیں بچھائے گلابو کا منتظر رہتا اُس کی

ایک جھلک کے لیے ترستا اُس کا جی چاہتا کہ بے شک وہ کوئی اشارہ نہ کرے بس اس طرح چھت پر موجود رہے کہ وہ جی بھر کے دیدار کر سکے اس کے دیدار کی پیاسی نگاہوں کی پیاس بجھائے۔ گلابو جیسے ہی اسے چھت پر نظر آئی دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوکر اسے اندر سے جھنجھوڑنے لگتیں۔ پیاسی نگاہیں اسی کا طواف کرتی بے چین دل کی دھڑکنیں رقص کرنے لگتی مگر اس کی محبوبہ گلابو اس پر نگاہ پڑتے ہی نفرت سے اپنی نگاہیں پھیر لیتی تھی۔

گلابو کو اس کی کوئی فکر تھی نہ پرواہ وہ بے رخی سے مڑ کے اپنے کام میں مصروف ہو جاتی وقفہ وقفہ نہر کے کنارے دیکھتی جہاں چلتے چلتے رُکا بے تاب عابد اسے دکھائی دیتا اسے دیکھ کر وہ غصہ ہونے لگتی تھی۔

عابد دل و جان سے گلابو پر فدا تھا وہ اس کے دل و دماغ پر اس قدر چھا گئی تھی کہ اسے ہر طرف وہی نظر آنے لگی وہ ہر وقت اسے سوچتا رہتا اس کے خیالوں میں کھویا رہنے لگا اس کی یکطرفہ محبت پوری شدت سے آگے بڑھ رہی تھی اس کے اندر جذبات و احساسات امنگیں شدت سے جنم لینے لگیں دل گلابو کے گن گانے لگا نگاہوں میں اسی کا تصور رچ بس گیا وہ اپنی یکطرفہ خاموش محبت کی آگ میں جل رہا تھا۔

شب و روز گزرتے رہے' ایک روز جب گلابو چھت پر آئی اس نے چور نگاہوں سے نہر کی طرف دیکھا اسے عابد نظر نہیں آیا تو جانے کیوں وہ اُداس ہوگئی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس نے چاروں طرف نظریں گھمائیں۔



مگر اسے عابد کہیں دکھائی نہیں دیا۔ چاروں طرف ویرانی چھائی ہوئی تھی بہت دیر تک وہ فضاؤں میں نہ جانے کیا ڈھونڈتی رہی کسی آوارہ کتے کے بھونکنے کی آواز پر چونکی اور پھر اپنا کام ختم کر کے نیچے اتر آئی لیکن اس کا وہ پورا دن عجیب سی کیفیت میں بسر ہوا وہ اندر ہی اندر بے چینی و بے قراری محسوس کر رہی تھی۔

اگلے چند روز تک گلابو کی کیفیت کچھ عجیب سی رہی اسے عابد کا خیال کئی بار آیا وہ اس کے خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک کر کسی کام میں خود کو مصروف کرنے کی کوشش کرتی مگر کوشش کے باوجود بھی اس کا دل کسی کام میں نہیں لگ رہا تھا کچھ لمحوں کے لیے وہ کھوسی جاتی پھر جلد ہی اپنی حالت پر قابو پا لیتی مگر زیادہ دیر کامیاب نہ ہو پاتی تھی پھر یوں ہونے لگا کہ چھت پر آتے ہی اس کی نگاہیں کسی بدروح کی طرح لمحے بھر میں وہاں جا اترتی جہاں عابد اسے محویت سے دیکھتا تھا اور وہ دل ہی دل میں اسے کوسنے لگتی تھی اب وہاں ویرانی سی برس رہی تھی چاروں طرف خاموشی اور اُداسی کا راج تھا اسے نہ پا کر وہ بجھ سی جاتی بہت دیر وہاں اسی کیفیت میں کھڑی عابد کے بارے میں سوچتی کہ وہ کہاں گیا اسے بہت بے چینی سی ہو رہی تھی اور دل بھی زور زور سے دھڑک رہا تھا یوں وہ اس کے حواسوں پر بری طرح چھایا جا رہا تھا۔

کبھی عابد کا خیال آتے ہی اس کا دل خوش گوار انداز میں دھڑکتا تو کبھی وہ بے بسی کی انتہا پر ہوتی وہ خیالوں ہی خیالوں میں عابد کی بانہوں میں جھول رہی ہوتی ہر گزرتے دن کے ساتھ اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ عابد سے محبت کرنے لگی ہے شدید محبت......

رات کو سارا عالم سو رہا ہوتا مگر گلابو کی نیند اڑ چکی تھی اسے شدت سے عابد کی کمی محسوس ہو رہی تھی اس کی یاد اسے بڑی شدت سے بے تاب کرنے لگی وہ اس کے دل کا چین و سکون ساتھ لے گیا تھا گلابو کا خود پر اختیار نہیں رہا بہت سے خوابوں اور امیدوں کے ساتھ اس کے دل میں جنون اور محبت کی آگ بھڑک اٹھی اسے عابد کے خیالوں' سوچوں اور یادوں نے اپنی گرفت میں اس قدر لے لیا کہ وہ ہر وقت بے قرار رہنے لگی اور اس کا دل بجھا بجھا سا رہنے لگا تھا۔

گلابو دن میں کئی بار چھت پر جانے سے خود کو نہ روک پاتی تھی اس کی بے چین نگاہیں عابد کی راہ تکتے تکتے تھک جاتی مگر وہ اسے کہیں دکھائی نہیں دیتا بالآخر وہ بوجھل قدموں سے نیچے اتر آتی تھی اسے رات کو چین نہ دن کو قرار تھا ہر آئے دن اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا اس کی اُلجھنیں اور پریشانی بڑھتی ہی جا رہی تھی پورا دن بے سکونی میں گزرتا اور رات بھر کروٹ بدل بدل کر تھک جاتی مگر کسی کروٹ اسے چین نہیں مل رہا تھا اس کی بے بسی اپنے عروج پر تھی۔

اب گلابو سے خاموشی برداشت نہیں ہو رہی تھی وہ جلد از جلد اپنی محبت کا یقین دلانے کے لیے بے تاب تھی پھر یوں ہوا کہ اس نے مجھے ہمراز بنایا اور اپنا دل کھول کر میرے آگے رکھ دیا۔ عابد میرا پڑوسی تھا اور مجھے ان کے گھر کی تقریباً ہر خبر معلوم تھی کیونکہ ہم قریبی رشتہ دار تھے اور ایک دوسرے کے گھر آنا جانا بھی خوب تھا۔

جب گلابو کو میں نے بتایا کہ عابد کئی دنوں سے سخت بیمار ہے یہ جان کر اسے بے پناہ دکھ ہوا اور بڑی فکر مندی سے عابد کی صحت یابی کے لیے دعائیں مانگنے لگی اس کا دل عابد کے لیے بے ترتیب دھڑک رہا تھا اور آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

دوسری طرف جب عابد کو میں نے گلابو کی محبت کا یقین دلایا تو اس کے دل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اس

کے مرجھائے ہوئے چہرے پر رونق اتر آئی اور خوشی سے آنکھیں چمکنے لگیں پھر جلد ہی زندگی کی طرف لوٹ آیا۔

عابد نے گلابو کے نام پہلا محبت نامہ لکھا تو جیسے اپنا دل کاغذ پہ بکھیر دیا گلابو نے دھڑکتے دل کے ساتھ محبت نامہ پڑھا اور اس کی محبت کو دل سے قبول کرلیا پھر اس نے ڈرتے جھجکتے جوابی محبت نامہ لکھا اور پھر یہ سلسلہ شروع ہو گیا اس کے بعد وہ بہت تیزی سے ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے اور کئی ملاقاتیں بھی ہوئیں۔

جب عابد اور گلابو کی پہلی ملاقات ہوئی گلابو کا دل مسلسل عجیب طرح سے دھڑک رہا تھا۔ کچھ ڈر بھی لگ رہا تھا اور کسی کے دیکھ لینے کا خوف بڑھتا ہی جا رہا تھا کہ عابد نے محبت سے اس کے ہاتھ تھام لیے تو گلابو کے پورے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔

''مجھے تم دنیا کی ہر چیز سے عزیز ہو۔'' عابد نے نثار ہوتی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا دی اس کے لبوں پر بھرپور اور چاہت بھری مسکراہٹ تھی وہ بہت دیر تک ایک دوسرے کو محبت سے دیکھتے رہے وہ دونوں خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کر رہے تھے اور مسرت سے ان کا دل دھڑک رہا تھا پیار ہوا اظہار ہوا اقرار ہوا ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائیں گئیں۔

ایک دوسرے کو قریب سے جی بھر کے دیکھا پھر گلابو عابد سے رخصت ہوئی تو وہ نثار ہوتی نگاہوں سے اسے جاتا دیکھتا رہا۔ گلابو کے جسم کی خوشبو اس کے اردگرد چکراتی رہی اس کی شیریں باتیں کانوں میں گونجتی رہیں وہ کتنی ہی دیر اس کے خیالوں میں کھویا رہا۔

عابد گلابو پر دل و جان سے فدا تھا اس کی شان میں قصیدے پڑھا رہا ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے گلابو کی تصویر رہتی گلابو بھی اپنی خوش بختی پر نازاں تھی۔ نئی زندگی کے نئے خواب اُن کی آنکھوں میں سج گئے گزرتے دن کے ساتھ ساتھ اُن کے جذبے اور زیادہ طوفانی ہو گئے اُن کی محبتوں کی شدتوں میں مزید اضافہ ہو گیا ایک دوسرے سے الگ رہنے کا تصور بھی انہیں خوفزدہ کر رہا تھا۔

ایک روز باتوں باتوں میں گلابو بولی۔

''اگر ہم الگ ہو گئے تو؟'' اس کا لہجہ خوفزدہ تھا۔

''میں مر جاؤں گا۔'' عابد نے بے اختیار کہا۔

عابد کے اس مختصر جملے پر وہ تڑپ گئی اور خود کو اس کے قریب جانے سے نہ روک پائی اس کے ہونٹوں پر اپنی نازک انگلی رکھ کر جلدی سے بولی۔

''خدا نہ کرے تمہیں کچھ ہو جائے۔'' وہ ایک عام سا دن تھا عابد اور گلابو نیم کے درخت تلے اردگرد کے ماحول سے بے نیاز ایک دوسرے کے بہت ہی قریب بیٹھے محبت کے مزے لوٹ رہے تھے کہ اچانک انہیں گلابو کا بڑا بھائی ہیرل نظر آیا ہیرل کو دیکھ کر وہ کسی جگہ چھپنے ہی والے تھے کہ ہیرل کی ان پر نظر پڑ گئی وہ وہیں سے چلایا۔

''رک جاؤ۔'' وہ رک گئے۔

مگر دونوں بہت خوفزدہ تھے خوف سے کانپ رہے تھے ان کے بدن سے پسینہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا اور حلق خشک تھا اُن کی حالت ایسی تھی کہ کاٹو تو بدن میں خون نہیں۔

ہیرل بھاگتے ہوئے اُن کے قریب آیا اور آتے ہی عابد کو گریبان سے پکڑ کر گھونسوں اور لاتوں کی بارش کر دی اسے مکوں اور لاتوں سے مار مار کر نڈھال کر دیا مارنے والے کو ہوش نہیں تھا کہ اس پر کیا بیت رہی ہے اسے کہاں اور کتنی چوٹ لگ رہی ہے۔ گلابو پاس کھڑی لرز رہی تھی رو رہی تھی اس کی سسکیاں سن کر ہیرل جیسے ہوش میں آیا۔

”جی چاہتا ہے تیرا گلا گھونٹ دوں۔“ یہ کہتے ہوئے ہیرل نے گلابو کا گلا پکڑ لیا اور اس زور سے دبایا کہ اس کی سانس رُکنے لگی وہ تڑپ رہی تھی مچل رہی تھی ہیرل نے اسے بری طرح دبوچ لیا تھا لاکھ کوشش کرنے کے باوجود بھی وہ خود کو چھڑا نہیں پا رہی تھی اس وقت شاید ہیرل کے دماغ کی رگ بہک گئی تھی۔

گلابو شدت تکلیف سے تڑپ تڑپ کر ساکت ہونے ہی والی تھی کہ ہیرل نے اسے پوری قوت سے بازوؤں سے پکڑا اور آسانی سے گھسیٹتے ہوئے گھر لے گیا۔

”اماں...... ابا......!“ گھر پہنچتے ہی ہیرل دیوانوں کی طرح چیخا۔ سب اُن کی طرف دوڑے۔

”کیا ہوا...... کیوں مار رہے ہو اسے۔“ ماں نے تڑپ کر اپنے بیٹے ہیرل سے پوچھا اور اپنی بیٹی گلابو کو تھام لیا وہ ماں سے لگ کر بے اختیار روئے جا رہی تھی۔

”ہماری عزت اور مان پیروں تلے روند کر عشق لڑا رہی تھی۔“ ہیرل غصے سے بھڑک اٹھا۔

”آج اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بھوکے کتوں کے آگے ڈال دوں گا۔“ ہیرل نے آگے بڑھ کر گلابو کے بالوں کو اس زور سے جھٹکا دیا کہ اس کی چیخ نکل گئی۔

”غرق کر دو اس بے غیرت کو......“ باپ نے گلابو کو زوردار تھپڑ رسید کرتے ہوئے خونخوار لہجے میں کہا۔ وہ اوندھے منہ زمین پر گر گئی۔

اور پھر یوں ہوا کہ میرل اور ہیرل دونوں بھائیوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جی بھر کے گلابو کی بے دردی سے پٹائی کی اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔

دونوں بھائی عابد کو جان سے مارنے کے لیے گھر سے نکلنے ہی والے تھے کہ اُن کی ماں نے دوڑتے ہوئے قرآن پاک اٹھایا اور ان کے سامنے کھڑی ہوگئی اپنے بیٹوں کو خدا نبی ﷺ کا واسطہ دے کر خاموش کر دیا۔

اس دن کے بعد گلابو اپنے ہی گھر قید ہو کر رہ گئی۔ اپنے ہی گھر کے لوگ اس کے لیے اجنبی بن گئے۔ وہ بے انتہا مجبور تھی اسی بے بسی کے عالم میں آنسو بہاتی روتی سسکتی رہتی ہر وقت ڈری سہمی سی رہنے لگی ذرا سی آہٹ پر چونک اٹھتی اپنے ہی عزیزوں نے اسے مجبور کر کے رکھ دیا وہ گھر کی خاموش دیواروں میں گھٹ گھٹ کے جی رہی تھی کھانا پینا بہت کم ہو گیا وہ دن بدن کمزور ہوتی جا رہی تھی یوں چند ہی دنوں میں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی تھی۔

دوسری طرف عابد کے خاندان نے بھی گلابو کے رشتے سے سخت انکار کر دیا مگر گلابو کی محبت کی تڑپ اس کے وجود کا حصہ بن گئی وہ تڑپ ایک جان لیوا بیماری کی صورت اسے دیمک کی طرح چاٹ رہی تھی وہ بیماری ناسور بن کر اس کے لہو میں دوڑ رہی تھی وہ سوکھ کر کانٹا ہو گیا یوں دن بدن زندگی سے دور ہوتا جا رہا تھا مگر روایتوں کے پابند خاندان کو اُن کی زندگی اور محبت کی فکر تھی نہ پرواہ......

عابد کے بھرپور اصرار پر میں نے بہت کوشش کے بعد اُن کی مختصر ملاقات کروائی۔

جب وہ ملے ان کا عجیب عالم تھا گلابو کی سسکیاں تھم نہیں ہو رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب رواں تھا وہ عابد کے سینے سے لگ کر روتی رہی عابد نے مضبوط بانہوں میں چھپا لیا۔ گلابو کے آنسو اس کے سینے میں جذب ہو رہے تھے۔

ان دونوں کی آنکھیں برس رہی تھیں وہ محبت و جذبات سے ایک دوسرے سے اس قدر لپٹ گئے جیسے صدیوں بعد ملے ہوں اُن کی چاہت دیکھ کر میری آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

اس مختصر ملاقات نے اُن کو بہت حوصلہ بخشا پھر یوں ہی اُن کی کئی مختصر ملاقاتیں ہوئیں وہ ایک دوسرے کے بغیر جینا نہیں چاہتے تھے۔

انہیں ایک دوسرے سے الگ رہنے کا تصور بھی خوفزدہ کررہا تھا۔

”گلابو میں تیری جدائی کا دکھ سہہ نہ پاؤں گا۔“ عابد کی آواز کسی کھائی سے آتی محسوس ہوئی۔

”خدارا خود کو سنبھالو۔“ گلابو بری طرح ڈر گئی اس کا وجود کپکپانے لگا اور آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

”اب میں تمہاری جدائی برداشت نہیں کرسکتا۔“ عابد کے لہجے میں بے پناہ بے بسی تھی۔

”میں بھی تمہارے بنا نہیں رہ سکتی ہمیشہ کے لیے تمہارے پاس آنا چاہتی ہوں۔“ گلابو سسک پڑی۔

اور پھر یوں ہوا کہ انہوں نے روایتوں کے خلاف انتہائی قدم اٹھانے کا فیصلہ کرلیا۔

سورج اپنا سفر طے کرکے روپوش ہو چکا تھا شام نے رات کو گلے لگا لیا۔ چاروں طرف آہستہ آہستہ اندھیرا پھیل رہا تھا۔ وقت دبے پاؤں گزرتا رہا۔ گلابو اپنی چارپائی پر سوتی بن کر سب کے سونے کی بے تابی سے منتظر تھی۔ عابد بھی بے چین انتظار کی گھڑیاں گننے لگا۔

خدا خدا کرکے سارے عالم کو نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ مقررہ وقت پر گلابو عابد کی رفاقت میں اپنوں کی عزت پیروں تلے روند کر گھر کی دہلیز پار کرگئی۔

عابد نے اپنی محبوبہ گلابو کو ساتھ لے کر شہر کا رخ کیا۔ عابد کے ایک عزیز نے انہیں پناہ دی وہ مطمئن تھے مگر حالات نے ایسی کروٹ لی کہ اس کی محبت رہی نہ وہ۔

جانے کس پہر گلابو کی بڑی بہن نازو کی آنکھ کھلی اسے شدید پیاس محسوس ہوئی وہ اپنی چارپائی سے اٹھ کر صحن میں رکھے مٹکے کی طرف بڑھی ہی تھی کہ بالکل غیر ارادی طور پر اس کی نگاہیں گلابو کی چارپائی کی طرف اٹھ گئیں۔

گلابو کو اپنی چارپائی پر نہ پاکر نازو نے سوچا وہ ضرور باتھ روم میں ہوگی مگر دوسرے ہی لمحے باتھ روم کا دروازہ کھلا دیکھ کر وہ چونکی اُس کی آنکھوں میں خوف کے سائے لہرانے لگے وہ کچھ دیر بے چینی سے اِدھر اُدھر اپنی بہن کو دیکھنے لگی جب گلابو اسے کہیں دکھائی نہیں دی تو وہ بدحواسی میں والدین کی طرف دوڑی۔

”اماں......ابا گلابو نہیں ہے۔“ نازو کی رندھی ہوئی آواز سن کر والدین کے ساتھ ساتھ میرل اور ہیرل بھی اٹھ بیٹھے اُن کو طوفانی غصہ آرہا تھا ماں سر جھکائے بیٹھی رہی باپ کی نگاہیں ایسی جھکی کہ پھر اٹھ نہ سکیں اُن کا دل چاہا زمین پھٹے اور وہ اس میں دھنس جائیں نازو کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا وہ گھر کی بربادی پر بے آواز روتی رہی۔

”جہاں بھی ملے انہیں زندہ گاڑھ دوں گا۔“ ہیرل کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا میرل کا خون بھی کھول رہا تھا وہ بندوقیں اُٹھا کر اُن کی تلاش میں آندھی طوفان کی طرح چل پڑے۔

ہیرل اور میرل بھوکے کتوں کی طرح انہیں ڈھونڈتے رہے وہ اُن کی جان کے دشمن بن گئے تھے بالآخر وہ انہیں ڈھونڈنے میں کامیاب ہوگئے اور پھر اُن کے نازک جسم پر گولیوں کی بارش کردی یوں عابد اور گلابو غیرت کے نام پر قتل کردیے گئے۔

یہ کہانی تو یہاں ختم ہوئی مگر ایسی لاتعداد کہانیاں ہیں جو جنم لیتی رہیں گی اور اسی طرح ختم کردی جائیں گی۔

☆☆......☆☆☆

ڈیرہ غازی خان سے ارسال کردہ تحریر

بے وقوف بوڑھا

فی زمانہ مخلص اور اپنوں سے محبت کرنے والوں کو بے وقوف ہی تصور کیا جاتا ہے' ایسا ہی بڑے بھائی کے ساتھ ہوا جس نے چھوٹے بھائیوں کے لیے اپنا آپ مٹا ڈالا تھا

ایم یعقوب احمدانی بلوچ

''میں تھک چکا ہوں مجھ سے اور بسوں کے دھکے نہیں برداشت ہوتے اور لوگوں کی باتیں طعنے نہیں سہے جاتے۔ ایسی جگہ کا متلاشی ہوں جہاں سکون سے زندگی کے بقایا دن گزر جائیں۔ اور کسی کی محتاجی کا سوال پیدا نہ ہو کچھ ایسا کروں کہ پیٹ بھر کے کھا سکوں۔

جگہ جگہ اجنبی راہوں پر بھٹک رہا تھا۔ کوئی راہ منزل کی طرف جاتے دکھائی نہیں دیتی۔ اپنوں کی کم ظرفی لاپرواہی سے ستر سالہ ملازم حسین ایک پرائیویٹ فیکٹری میں بوسیدہ جسم لیے کمرہ نمبر دس میں دل میں اپنوں کے درد غم اور وقت کی آزمائش کو سر آنکھوں پر رکھے قبول کیے سوچوں کے سمندر میں ڈوبا ہوا تھا۔ میرا قصور کیا تھا۔ سب سے بڑا ہوں۔

بڑا ہونے کی سزا مل رہی ہے میرے اپنے سگے بھائی جو جان سے عزیز ہیں رگوں میں ایک ہی باپ کا خون دوڑ رہا ہے۔

سب میرے بھائی ہیں ایک ہی بطن سے پیدا ہوئے۔ سفید داڑھی ہوگئی ہے میرا حال کوئی نہیں پوچھتا برسوں بیت جاتے ہیں ان کو میری یاد تک نہیں آتی کیا اتنا وقت بدل گیا ہے کیا ایسی خونی رشتے داری ہوتی ہے ایسی چاہت ہوتی ہے بھائیوں کے لیے میں مر رہا ہوں دنیا کے غموں سے چور ہو چکا ہوں در در کی ٹھوکریں کھائیں شہر شہر میں گھوم کر جوانی کے قیمتی دن برباد کیے دوسرے کے دھکے گالی گلوچ تھپڑ کھائے ان بھائیوں کے لیے جو آج مجھے دو وقت کی روٹی نہیں دے سکتے دل ماتم کدہ ہے حیرت اور افسوس نے میرا ذہن بند کر دیا ہے۔

آنکھوں میں نمی چھائی جا رہی ہے۔ یہ تو رب کی چھوٹی سی کرم نوازی ہے کہ ہاتھ پاؤں سلامت ہیں۔ آٹھ گھنٹے پاؤں پر کھڑے ہو کر ڈیوٹی سرانجام دیتا ہوں اگر خود کے لیے اتنا نہ کر سکتا تو کون اس مطلبی دنیا میں میرا سہارا بنتا' دل خون کے آنسو روتا ہے وہ دن اچھی طرح مجھے یاد ہیں میں کیسے بھول سکتا ہوں بھائی کو جس کو خود محنت مزدوری کر کے پڑھایا بڑا کیا پالا پوسہ دنیاداری سکھائی اچھے برے کی تمیز دی باپ کی طرح محبت پیار ایثار شفقت دی کیا یہ اب

اس کا صلہ ہے۔

میری محنت کا پھل آج اس طرح سود کی طرح مل رہا ہے محبت کے بجائے نفرت پیار ایثار کے بجائے لاپرواہی کیا میں اس سب کا حقدار ہوں میں مکمل مایوس ہو چکا ہوں اور آج مجھے ان اپنوں کی محبت کی ضرورت نہیں ان کے چھوٹے بڑے بچوں کی معصوم باتیں سننے کا دل نہیں کرتا' کیا میرا اتنا بھی حق نہیں رہا کہ میں اب اس بڑھاپے میں اپنوں کے ساتھ چند دن گزاروں زندگی کا کیا بھروسہ کس وقت مٹی کے پتلے کا ساتھ چھوڑ دے گھر میں تو ہوں دل کے جذبات ذہن میں تیزی سے گردش کر رہے تھے جیسے ابھی کوئی بڑی آفت آنے والی ہے۔

میرے آنسو اب آنکھوں سے نہیں بہتے بلکہ میرے دل پر گرتے ہیں کیونکہ اپنوں کی اس بے رخی سے پتھر دل بن چکا ہوں برسوں سے فیکٹریوں میں زندگی کے اچھے برے دن گزارے تھے آنکھوں سے دل تک کوئی اپنوں کی دید حسرت مر چکی تھی۔

رب نے مجھے بھائیوں سے پہلے گھر میں بھیجا شاید یہ اس کی سزا ہے یا پھر میری بدنصیبی' کتنی چاہت سے میری ماں میرے لیے آلو کے پراٹھے بناتی میں بچپن میں شرارت کرتا تھا امی پیار سے گلے لگا لیتی اور ابو بہت غصہ کرتے اور مارتے ابو کی مار سے بہت تکلیف ہوتی درد ہوتا۔

وہ بہت سخت مزاج تھے مگر یہ بھی سچ ہے کہ میں بہت شیطان تھا بڑی اولاد تھی ماں نے خوب لاڈ اٹھائے تھے اس لیے شرارتیں کرتا' ابو کی بات نہیں





سنتا تھا جانتا تھا ماں بچالے گی۔

میری شرارتوں کو ابو برداشت نہ کرتے تو مارتے مارتے مدرسے کے گیٹ تک گھسیٹتے جاتے کئی برس تک استاد کے مال مویشیوں کا چارہ کاٹتا رہا شاید میرے کرتوتوں کا پھل تھا۔ ماں کے ہاتھ کی روٹی کا ذائقہ ساری رات رونے پر مجبور کرتا ابو کی ڈانٹ مار سے جی بھر جاتا۔

شاید قدرت کو یہی منظور تھا جو میری تقدیر کتاب روح بشر میں پیدا ہوتے ہی لکھا جا چکا تھا۔ وہ دن تو قیامت صغراں تھا میرے لیے ابو کوچ کر چلے' دنیا سونی بے سود نظر آتی۔

ہر چیز بے کار بے معنی لگتی تھی۔ اعتبار ٹوٹ گیا تھا رب ناراض ہوتا نظر آنے لگا تھا۔ وہ زندگی کا کیسا حسین پل تھا جب امی نے بھائی کی شادی کی۔ بھائی کی شادی پھر سے اجڑے گھر میں بہار لائی تھی۔ ہر فرد خوشی سے جھوم رہا تھا۔

جشن کا سماں تھا۔ ہر اپنا پرایا خوشی میں جھوم رہا تھا دل باغ باغ ہوگیا تھا وہ سماں وہ پل میں کیسے بھول سکتا ہوں۔ میرے تو مجھے اس طرح بھولے کہ جیسے رات کا خواب جاگتے ہی کچھ یاد نہیں رہتا۔ کتنے خوابوں ارمانوں سے بھائی کے سر پر سہرا سجایا تھا۔ کیسے اپنے ہاتھوں سے مالا گلے میں ڈالا تھا۔ دل میں درد جاگتا ہے کوئی اپنا سننے والا نہیں میری آہ میں اسی سلوک کا حقدار ہوں۔

اپنی خواہش کو ظاہر نہ کیا میری بھی شادی ہو جبھی میرے بھی بچے ہوں پہلا نمبر تو میرا تھا مگر میں نے اپنی ساری خوشی چھوٹے بھائی کو دے دی تھی۔ یہ صلہ ملا تھا میرے خلوص کا' میری الفت کا' میرے احساس کا' لوگوں کے طعنے ابھی تک کانوں میں گردش کررہے ہیں۔ بڑے کو چھوڑ شادی چھوٹے کی کردی ' کیا اس کو کوئی لڑکی نہیں دیتا؟

پھر شادی بھی ہوگئی مگر شاید ابھی امتحان بہت تھے میں اپنی بیوی کی توقعات پر پورا نہیں اترا۔ مجھ میں کمی تھی جو میں خود نہیں جانتا تھا شاید میری قسمت میں شادی شدہ زندگی کا سکھ تھا ہی نہیں بیوی ساتھ دینے کو تیار تھی۔ ایک برس کتنی تکلیف سے گزرا ہر در پر گیا۔ مگر الہی کو میری ابھی مزید آزمائشیں منظور تھیں۔ مگر کمال میرے بھائیوں کا پوچھا تک نہیں کہ بھائی چلو علاج کروائیں کسی اور در سے ان کو کیا غرض تھی ان کے تو بچے تھے۔ میں ٹوٹ چکا تھا ماتم کدہ تھا بیوی سے شرمندہ تھا۔

بیوی نے میری عزت کو ڈیڑھ سال تک سر آنکھوں پر رکھا تھا۔ اس دن تو رونا آرہا تھا وقت حالات اور اپنی بے چارگی سے سمجھوتہ کیا تھا۔ میں نے خود اپنی بیوی کو برباد ہونے سے بچایا تھا اسے عزت سے رخصت کیا طلاق دی۔ وہ تو ماں بن سکتی تھی۔ مجھ میں کمی تھی میں کمزور تھا میں شوہر بننے سے قاصر تھا۔

بھائیوں کے سرد رویے کو دیکھ کر گھر کو خیر آباد کہا اور ایسی راہ پر چل پڑا جہاں کوئی اپنا نہ تھا کئی سالوں بھٹکتے بھٹکتے پھر سے فیکٹری میں بند ہوگیا۔ دل و دماغ پر وحشت طاری ہوتی ہے اپنوں کی سفاکی سے دکھ ملا۔ خوشی کیا ہوتی ہے آج تک دل کو پتہ نہیں مگر بھولنا بھی چاہوں تو بھی یاد آتا ہے وہ لاپرواہی وہ لمحے بہت تڑپاتے ہیں قدرت نے ایک اور آزمائش میں مبتلا کردیا کہ اس بڑھاپے میں طبیعت خراب ہونے لگی۔

چند دنوں میں سانس لینے میں دشواری اور اسکن کینسر ہوگیا ڈیوٹی کا مسئلہ اور کوئی حال نہ پوچھنے والا آخر کار دو ماہ کی سیلری ختم ہوگئی مگر کوئی فرق نہ ہوا آخر کار چارپائی پر آگیا۔

ہر نگاہ حیرت میں مبتلا تھی۔ ہر شخص سو باتیں کرتا سو طرح کے مشورے دیتا تنگ آگیا تھا کیا کروں

کس کو اپنی حالت دکھاؤں کون میرا تھا اس مطلبی دنیا میں جو کماتا تھا وہ سب بھائیوں کو دیتا اسی لیے خالی ہاتھ تھا خیر ایک محسن نے مدد کی اور گھر روانہ کر دیا۔ گھر والوں نے دیکھ کے منہ پھیر لیا ایک قدم چلنا مشکل تھا۔

دو قدم چلنے پر تیسرے قدم پر گر جاتا۔ سانس بند ہونے لگتی پورے جسم سے خون نکلتا خارش کرنے سے نجانے کس گناہ کی سزا یا آزمائش تھی۔ گھر میں دیکھ بھال کون کرتا ایسی حالت اور کینسر دیکھ کر سب دور دور سے دیکھ کر چلے جاتے خیر دن تو گزر جاتا مگر رات بہت اذیت دیتی، کوئی بیوی کی بانہوں سے اٹھ کر میرا حال، پانی روٹی کا نہ پوچھتا ساری رات روتے روتے گزرتی، اسی طرح پورے پندرہ دن گزر گئے۔

ایک دن پڑوسن دیکھنے چلی آئی تو میرا حال دیکھ کر آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات برسنے لگی۔ ساتھ بیٹھے بھائی اور بھابیوں کو خدا کا واسطہ دیا کہ اسے کسی ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔ یہ اسی حالت میں مر جائے گا۔ پڑوسن کی کڑوی باتیں سن کر بھائی نے تھوڑی سی غیرت کی ڈاکٹر کے پاس لے گیا مگر بھائی نے راستے ہی میں ڈاکٹر کے پاس لے جانے کا معاوضہ وصول کر لیا تھا۔

دل کو چیر جانے والی باتیں کیں۔ کیا رکھا ہے پہلے سے بہت ذمہ داریاں ہیں بچے جوان ہیں کوئی کام دھندا نہیں جو تم کرتے رہے کام اس سے ایک روپیہ تک نہ دیا اب کیسے تیرا علاج کریں۔ اس وقت بھائی کی باتوں پر آنسوؤں نے آنکھوں سے بغاوت کر لی تھی۔ ڈاکٹر سے کبھی سو روپے کی دوائی لے کر آتا تو پانچ سو کی سناتا کون کس کا سہارا بنتا ہے لوگ تو جنازے کو کاندھا بدل بدل کر دیتے ہیں۔ اپنے تو صرف نام کے اپنے رہ گئے تھے۔

تین بھائیوں کی شادی کی تھی اپنی محنت سے یہ ان احسانوں کا صلہ ملا۔ ستر سالہ یہ بوڑھا کمزور حالت میں

آزمائش

''سنو خدا نے بے شمار مخلوقات پیدا کی ہیں اور ہر مخلوق کو زیر کرنے کا طریقہ بھی مختلف ہے۔ درندے پکڑنے کے لیے اسے شکار کرتے ہیں۔ پرندے کو اسیر کرنے کے لیے دانہ ڈالتے ہیں۔ آبی جانور کو پھانسنے کے لیے جال ڈالتے ہیں لیکن اشرف المخلوقات کے لیے تعریف کا ایک جملہ کافی ہے اور سنو ہر مخلوق اسیر ہو کر آزادی چاہتی ہے مگر یہ آدم زاد تعریف کے جال میں قید ہو کر بھی آزادی نہیں چاہتا۔ لہٰذا اب تم قیامت تک اسے اس ہتھیار سے زیر کرتے رہو گے۔''

(منورہ نوری خلیق کے ناول ''آزمائش'' سے اقتباس)

مرسلہ: نازش درآب خان۔ میر پور خاص

آج بھی فیکٹری میں آٹھ گھنٹے ڈیوٹی دیتا جس سے اپنا علاج اور پیٹ پوجا کا بندوبست کرتا مگر نوجوان صحت مند تندرست بھائیوں کو ذرا بھی شرم محسوس نہ ہوتی کہ بڑا بھائی بیمار ہے بوڑھا لاچار ہے مدد کا حق دار ہے باپ کی جگہ اس کی خدمت کریں اور آخرت میں سرخرو ہوں اور لوگوں کی ملامت سے بچیں دل میں خیال لیے میں کمرے میں افسوس میں ڈوبا ہوں۔

آج سوچتا ہوں کاش کوئی یتیم بچہ ہی لے کر پال لیتا کم از کم وہ میرا اور میں اس کا سہارا تو ہوتے...... پھر کبھی دل میں خیال آتا ہے اپنی زندگی کا ہی خاتمہ کر لوں مگر پھر یہ سوچ کر ڈر جاتا ہوں کہ دنیا تو ملی نہیں حرام موت کو گلے لگاؤں گا تو آخرت بھی ہاتھ سے جائے گی۔ میری اپنے پڑھنے والوں سے ایک گزارش ہے جب طاقت ہو تب سب کچھ بہن بھائیوں پر لٹانا محبت نہیں بے وقوفی ہے یہ ایک بے وقوف بوڑھے کا تجربہ ہے۔

☆☆......☆☆

کراچی سے ارسال کردہ دوشیزہ کی ہردل عزیز مصنفہ کے قلم سے ایک سچی کہانی

عورت کہانی

یہ کہانی پڑھ کر آپ کو فیصلہ کرنا

ہے کہ ظالم اصل میں کون تھا......؟

فرحی نعیم

''باجی میں کل نہیں آؤں گی۔'' سکینہ تیزی سے کوفتے بناتے ہوئے پتیلی میں ڈالتے ہوئے بولی اور میں جو کیبنیٹ میں سے مصالحے نکال رہی تھی یکدم ہاتھ روک کر اُسے دیکھا اُس نے لمحہ بھر نگاہ اٹھا کر میری پریشان صورت دیکھی اور دھیرے سے مسکرا دی۔ معلوم تھا کہ ان لوگوں کے بغیر کام رک جاتے ہیں۔

''خیریت تو ہے؟ کیا کسی بچے کی طبیعت ٹھیک نہیں؟''

''نہیں، نہیں بچے تو شکر ہے سب ٹھیک ہیں، بہن سے ملنے جانا ہے لانڈھی۔''

''تو شام میں چلی جانا، کام کر کے......''

''نہیں باجی صبح ہی، دس بجے تک نکلوں گی، ڈیڑھ گھنٹے کا تو راستہ ہے، بیگم اشرف سے تو میں نے کل ہی کہہ دیا تھا، آپ سے آج کہہ رہی ہوں اگر کام کر کے جاؤں گی تو بہت دیر ہو جائے گی۔'' اُس نے آخری کوفتہ گریوی میں ڈالا اور پتیلی چولہے پر رکھی۔ پھر گوندھے ہوئے آٹے کی پرات اپنی طرف کھینچی۔

''اچھا......'' میں نے ڈھیلے ڈھالے انداز میں کہا۔

''بڑی بہن سے؟''

''نہیں جی چھوٹی بہن ہے، پانچ سال بعد مل رہی ہوں۔''

''کیوں، کیا گاؤں سے آئی ہے یا تم لوگوں کا کوئی جھگڑا، ناراضگی؟''

''کیسی ناراضگی یا جھگڑا، قسمت نے تو خود اُس کے ساتھ بہت بڑا جھگڑا کیا ہے۔'' اُس نے روٹی توے پر ڈالی اور دوسرا پیڑا بنانے لگی۔

''ٹھیک سے بتاؤ، اس طرح آدھی ادھوری بات سے میں کیا سمجھوں۔'' میں کچھ جھنجلائی۔

''کل جیل سے آئی ہے، بھائی کے گھر وہیں جاؤں گی ملنے۔''

''ہیں ں ں......جیل......!'' حیرت سے میری آنکھیں کھلیں۔

''پر کیوں؟''

''میاں کے قتل کا الزام تھا وہ بھی جھوٹا......''

''جھوٹا الزام، کمال ہے، تم نے بتایا نہیں۔''

''کیا بتاتی باجی یہ کوئی فخر کی بات تو تھی نہیں' پھر اتنے سالوں میں' میں خود اس کے پاس نہ جا سکی ملنے' شروع شروع میں تو دو دفعہ مل آئی بھائی بہن کے ساتھ' لیکن میرے میاں نے بڑا شور ڈالا' میرے جانے پر' بس پھر کیا کرتی خاموش بیٹھ گئی' اب کل آئی ہے تو ملنے کو دل تڑپ رہا ہے۔''

''ہوں' اچھا ٹھیک ہے۔'' میں نے سر ہلایا لیکن اصل قصہ جاننے کا تجسس سر ابھارنے لگا تھا۔

''چلو پرسوں آؤ گی تو تفصیل سے بتانا۔''

''یہ مرد بڑے ظالم ہوتے ہیں نہ جانے عورت اور خاص طور پر بیوی سے انہیں کیا بیر ہوتا ہے بیوی بنا کر لائے ہو تو اُسے خوش بھی رکھو بلکہ اور اُس کی جان عذاب میں کر دیتے ہیں۔'' وہ اب جلدی جلدی پھیلاوا اسمیٹ رہی تھی۔ کام اُس کا مکمل ہو چکا تھا۔ زیر لب اُس کی بڑبڑاہٹ جاری تھی۔

''نہ زندگی میں سکھ دیتے ہیں اور نہ مرنے پر۔''

''کیا بول رہی ہو سکینہ؟'' اس کی بڑبڑاہٹ سن کر میں نے گردن موڑی۔

''بس باجی ہم عورتیں بڑی مظلوم ہیں ہماری کہانیاں بھی عجیب ہیں۔'' وہ پھیکی ہنسی ہنسی۔

''بتاؤں گی آپ کو کسی وقت فرصت سے......''

اتنا کہہ کر وہ سلام کر کے چلی گئی اور میرے ذہن میں عجیب اُلجھن ڈال گئی زندگی میں تو دکھ دینے کا سمجھ آتا ہے لیکن مرنے کے بعد؟ موت کا ہی غم ہوگا اور کیا ہو سکتا ہے۔'' میں جس سرکل سے تعلق رکھتی تھی وہاں کی خواتین کی اکثریت خوش باش اور بے فکر تھیں مرد حضرات یعنی شوہر حضرات' اپنے کاروبار اور دفتری مصروفیات میں ہوتے' بیویوں کو انہوں نے ہر کام کے ملازم مہیا کر رکھے تھے ان کا ذہن اُن مسائل تک نہیں پہنچ سکتا تھا اور یہی میرے ساتھ ہوا'



میری محدود سوچ کی پرواز بھی محدود تھی۔
سکینہ کی بہن کی زندگی کی کہانی میں مجھے اچانک دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔

☆......☆......☆

''کیا کرو گی باجی مجھ بدنصیب کی کہانی سن کر......'' میرے بہت اصرار پر آج سکینہ اپنی بہن کو لے آئی تھی اور اب ہم تینوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ سکینہ نے آج دوسرے گھروں کا کام مختصر کر کے جلدی نمٹا لیا تھا اسی لیے اب اطمینان سے بیٹھی تھی۔

''شاید کچھ کر ہی لوں اور اگر کچھ نہ بھی کر سکی تو کم از کم تمہارے لیے سچے دل سے دعا تو کر ہی سکتی ہوں۔'' میرے لہجے میں شاید ایسا کچھ تھا جو اس کے دل پر اثر کر گیا تھا اُس نے سر جھکا دیا تھا آنکھوں کے کنارے گیلے ہونے لگے تھے۔

''جی باجی' اب تو مجھے دعاؤں کی بہت سخت ضرورت ہے۔ بس آپ دعا کرنا کہ میری جتنی بھی زندگی ہے وہ سکون سے گزر جائے۔ میرے بچے میرے پاس آ جائیں۔ جیل کے یہ پانچ سال' پانچ سال نہیں تھے بلکہ پچاس سال تھے۔ جس اذیت' کرب اور تکلیف میں' میں نے جھیلے ہیں' خدا کسی کو نہ دکھائے۔'' آنسو کے چند قطرے' آنکھوں سے پھسل گئے تھے۔

''وہ تو خدا بھلا کرے اُن وکیل عورتوں کا جنہوں نے میرا کیس سن کر مجھ سے ہمدردی کی اور پھر مجھے اُس جہنم سے نکالا ورنہ اگر میں چند سال اور اُدھر رہتی تو نفسیاتی بن جاتی۔'' اُس نے دوپٹے کے پلو سے چہرہ رگڑا۔

''اللہ ہے نا ہمارے ساتھ' وہ تھوڑی کسی پر ظلم ہونے دے گا۔''

''اللہ تو بے شک ہے مگر یہ جو اللہ کے ظالم بندے ہیں نا' یہ ہم عورتوں کو چین نہیں لینے دیتے۔'' وہ زہرخند لہجے میں بولی۔

''اری نورا تم باجی کو ٹھیک سے بتاؤ نا' اس طرح وہ کیا سمجھیں گی۔'' سکینہ نے جیسے میرے دل کی بات کہہ دی تھی' میں بھی یہ چاہ رہی تھی کہ نورا مجھے ابتدا سے اپنی کہانی سنائے۔

''کہاں سے شروع کروں باجی وہاں سے جب ہم اپنے ابا کے گھر رہتے تھے۔ اگرچہ خوش حال اور بے فکری تو وہاں بھی نہ تھی لیکن حالات اتنے خراب بھی نہ تھے۔ ہم چار بہنیں اور ایک بھائی وہ بھی چاروں سے چھوٹا' ابا ایک اسکول میں چوکیدار تھا' اماں خالص گھریلو عورت' ابا کی تنخواہ میں ہم سات جانوں کا گزارا کیسے ہو سکتا تھا لہٰذا اماں گھر میں سلائی کڑھائی کر کے ابا کا سہارا بنی ہوئی تھیں۔ اسکول میں ابا کی نوکری کا یہ فائدہ ہوا کہ ہم سب بہن بھائیوں نے مشکل حالات کے باوجود کچھ نہ کچھ ضرور پڑھ لکھ لیا۔ ابا کی شرافت اور دیانت داری کی وجہ سے اسکول کے مالک نے ہماری فیس معاف کی ہوئی تھی۔''

''دو بہنوں نے آٹھویں کر کے چھوڑا' اِس نے (سکینہ نے) پانچویں کی' ایک میں ہی پڑھنے میں تیز تھی' میں نے میٹرک بڑے اچھے نمبر سے کر لیا تھا مگر پھر حالات نے اجازت نہ دی اس لیے چاہتے ہوئے بھی آگے نہ پڑھ سکی۔ آہستہ آہستہ سب بہنوں کی شادیاں ہوتی گئیں۔ چوکیدار کی بیٹیوں کے رشتے بھی انہی جیسوں سے آئے تھے۔ کسی بہن کا میاں ڈرائیور تھا' تو کسی کی سبزی کا ٹھیلا لگاتا' بھائی ابھی چھوٹا تھا اس کو باپ کا سہارا بننے کے لیے ابھی کافی وقت چاہیے تھا یوں ابا نے آنے والے رشتوں کی زیادہ دیکھ بھال نہ کی اور جلدی جلدی بیٹیاں نمٹانے لگا۔ میری شادی جمال سے ہوئی وہ ایک بڑی سپر مارکیٹ میں سیلز مین تھا۔ آمدنی تو مناسب

تھی لیکن وہ دماغ کا بڑا چڑچڑا تھا۔ اپنی ماں، بہن، بھائیوں سے بات بے بات لڑتا جھگڑتا تو میں تو پھر اس کے پاؤں کی جوتی کی حیثیت رکھتی تھی۔ اپنی مرضی ہوتی تو اچھی طرح بات کرتا، پیار جتلاتا، ورنہ ہاتھ اٹھانے سے نہ چوکتا، بس زندگی گزر رہی تھی اسی دوران دو بچے بھی ہوگئے۔''

''بچوں کے بعد بھی بجائے اس کے اپنی ذمہ داری کا احساس کرتا اُس نے تو اور چیخنا چلانا شروع کردیا تھا۔ جتنی دیر گھر سے باہر رہتا سکون رہتا گھر میں آتے ہی فساد شروع کردیتا۔ اس کو برداشت کرنا میری مجبوری تھی لیکن اس کے ماں، بھائیوں کی تو نہیں، ایک دن بڑے بھائی نے اُسے صاف گھر سے نکل جانے کا کہہ دیا تھا۔ اُن کے بیوی بچے بھی تنگ آئے ہوئے تھے۔ ماں نے بھی مجھے خوب سنائیں کہ میں اپنے شوہر کو سنبھال نہ سکی اُسے ٹھیک نہ کرسکی۔''

''میں کیا کہتی جس شخص کو اُس کی ماں اور گھر والے نہ سمجھ سکیں میں نئی آنے والی کیا کرسکتی تھی اور پھر مجھے وہ کوئی اہمیت دیتا ہی کب تھا، کبھی نرمی سے اُس سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تو فوراً ہی آپے سے باہر ہوجاتا۔ نہ جانے کیا مسئلہ تھا اس اُس کے ساتھ، میری ایک دوست نے مشورہ دیا کہ اُسے کسی نفسیاتی ڈاکٹر کو دکھاؤں میں نے ڈرتے ڈرتے یہ بات سسرال میں رکھی تو خوب میرے لتے لیے گئے۔ آخر خاموش ہوگئی۔'' اتنا کہہ کر اس نے اپنا سر تھام لیا اور آنکھیں بند کرلیں۔ سکینہ نے پاس پڑا شربت کا گلاس اُسے تھمایا تو چند گھونٹ بھر کر وہ پھر گویا ہوئی۔

''ماں، بھائی کے مجبور کرنے پر آخر جمال نے چند گلیاں چھوڑ کر دو کمروں کا ایک چھوٹا سا فلیٹ کرائے پر لے لیا۔ اُس گھر میں تو ماں اور بھائیوں کے ڈانٹنے پر کسی وقت خاموش بھی ہوجاتا لیکن یہاں تو قسمت کی ماری میں اور معصوم بچے ہی تھے اب تو ہر وقت ہماری شامت آئی رہتی پھر اب تو مکان کے کرائے اور دوسرے اخراجات بھی بڑھ گئے تھے اس کی وجہ سے بھی وہ مزید بدمزاج ہوچکا تھا۔ میں نے اگرچہ چند بچوں کو ٹیوشن پڑھانا شروع کردیا تھا پھر کچھ سلائی بھی کرلیتی تھی لیکن ہر وقت کی لڑائی نے جیسے گھر میں بے برکتی ہی ڈال دی تھی۔ اور پھر ایک دن......'' اُس نے جیسے خوف سے جھرجھری لی۔

''شاید اُس کا باہر اپنے کام پر کسی سے جھگڑا ہوا تھا۔ وہ غصہ کے ساتھ پریشان بھی تھا میں نے اُس کی پریشانی جاننے کی کوشش کی لیکن بجائے کچھ بتانے کے مجھے بھی پیٹ ڈالا اور پھر ہی میں نے دیکھا کہ وہ کچھ گولیاں بھی کھاتا ہے۔ اُس نے گولیاں لیں اور کمرہ بند کرلیا۔ ہفتہ میں دو تین دفعہ وہ اسی طرح کرتا تھا) جب کافی دیر تک کمرے کا دروازہ نہ کھلا تو میں نے پریشانی سے کھٹکھٹایا پھر بھی نہ کھلا تو بمشکل کھڑکی کے ذریعے اندر کود کر دروازہ کھولا اور اُسے دیکھا تو وہ بے سدھ تھا، سانس بھی آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔''

''میں بری طرح گھبرا گئی جلدی سے اُس کے بھائی کو فون کیا پڑوسیوں کو بلایا سب جلدی سے اسپتال لے گئے اور اسپتال جاکر اُس نے مرنے سے پہلے میرے ہی خلاف بیان دے دیا کہ میں نے اُسے دھوکے سے کچھ کھلا پلا دیا۔ آہ...... یہ صلہ دیا اُس نے میری قربانی اور محنت کا، مرتے مرتے بھی مجھے قصور وار ٹھہرا کر ظلم کرگیا۔ اُس کے گھر والے تو پہلے ہی مجھ سے بیزار تھے انہوں نے فوراً پولیس بلوالی، میں کتنا ہی روئی پیٹی، دہائیاں دیتی رہی لیکن ان ظالموں کو ذرا رحم نہ آیا۔ میرے خلاف پولیس میں کیسے کیسے الزام لگادیے۔ میرے دونوں معصوم بچے مجھ سے جدا ہوگئے اور مجھے لمبی سزا ہوگئی۔ اس سے تو اچھا تھا میں اُسے گھر میں ہی مرنے دیتی۔''

''تو کیا تمہارے گھر والوں نے کچھ نہ کیا؟''

میں نے اچھنبے سے پوچھا۔

"گھر والے...... گھر میں تھا ہی کون اماں ابا تو اس دوران اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ تین بہنیں تھیں اور ان کے شوہر، بہنویوں کو کیا پڑی تھی پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑاتے، بیچارا ایک بھائی تھا اُس نے بساط بھر کوشش کی، لیکن پھر بیچارا تھک کر بیٹھ گیا۔ اور مجھے قتل کے جرم میں سزا ہو گئی۔" اُس نے ایک دفعہ پھر ہاتھ چہرے پر رکھے اور چند لمحوں بعد اُسی طرح گویا ہوئی۔

"جیل کی وہ بیرک...... آہ...... ایسا لگتا تھا وہ جگہ انسانوں کے لیے نہیں جانوروں کے لیے بنائی گئی ہے۔ اور وہاں رہتے رہتے وہ عورتیں بڑی بے درد، بے حس اور خود غرض ہو چکی تھیں۔ اکثر تو مجھے شاباشی دیتیں کہ میں نے مردوں کے اس معاشرے سے ایک مرد ذات جس کو وہ 'بدذات' زیادہ کہتی کا خاتمہ کیا۔ تین سال میں نے اُن کے ساتھ جس طرح گزارے وہ میں اور میرا خدا ہی جانتا ہے۔ پھر میرے بہت رونے پیٹنے پر دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا۔ وہاں کی عورتیں پھر کچھ ہمدرد تھیں۔

"تمہاری طرف سے وکیل نے......"

"ارے باجی کیسا وکیل؟" وہ استہزائیہ ہنسی۔

"یہاں کون وکیل کرتا، کس کے پاس پیسے تھے۔ چار سال تو بغیر کسی وکیل اور پیشی کے ہی گزر گئے۔ پھر خدا بھلا کرے اُن وکیل عورتوں کا جو بغیر کسی پائی پیسے کے ہم بے قصور مظلوم عورتوں کا کیس لڑتی ہیں۔ ایک دفعہ ایسی ہی ایک وکیلنی نے میری بھی کہانی سنی، مجھے بڑی تسلی دی، اور یقین دلایا کہ وہ مجھے یہاں سے رہا کرا دیں گی۔ کیونکہ سوائے جمال کے بیان کے اور تو کوئی ثبوت تھا نہیں، پھر جیل انتظامیہ نے بھی دیکھ لیا تھا کہ پورا دن میں نماز، قرآن اور تسبیح کے بعد خاموش بیٹھی اپنے بچوں کو یاد کرتی رہتی ہوں۔ اور پھر کئی مہینے میرا کیس چلا اور اس کے بعد میرے خدا نے مجھ پر کرم کر دیا۔ میری رہائی کا فیصلہ ہو گیا۔ میں بے قصور ثابت ہو گئی میری ساس، جیٹھ، دیور کو بلایا گیا اور وہ بھی میرے خلاف کوئی ثبوت نہ دے سکے۔ بس باجی اب وہ بچے دینے میں پریشان کر رہے ہیں۔ نہ جانے انہوں نے میرے بچوں کے دماغ میں میرے خلاف کیسا زہر بھر دیا ہوگا اگر میرے بچے ہی مجھے نہ ملے تو میری زندگی کا کیا فائدہ......" وہ ایک دفعہ پھر سسکنے لگی۔

"تم ایسا کرو اُسی وکیل سے کہو، وہ ضرور تمہاری مدد کرے گی۔"

"ہاں باجی میں نے اُسی سے کہا ہے وہ چلے گی میرے ساتھ، اس نے بڑا مجھے حوصلہ دیا، مجھے امید ہے میں اپنے بچوں کے ساتھ باقی زندگی گزاروں گی، وہ میرے پاس رہیں گے، مجھ سے اُسی طرح محبت کریں گے جیسے پانچ سال پہلے کرتے تھے۔" بھرائی آنکھوں اور لہجے میں وہ مستقبل کے خوبصورت خواب بن رہی تھی اور میں...... میں اُسے دکھے دل سے دیکھ رہی تھی۔

"واہ ری عورت تیری بھی عجیب کہانی...... اُس مرد نے تو مرتے مرتے تجھے بھی پھنسا دیا، لیکن وہ عورت جو اُس مرد کی ماں تھی اور معصوم بچوں کی دادی، اُس نے اُس ظلم پر مہر لگا کر بچوں کے باپ کے ساتھ ماں کو بھی مار ڈالا۔ جب وہ اپنی بہو سے ایسی نفرت کرتی تھی تو ان پانچ سالوں میں اُس نے بچوں کے کورے کاغذ جیسے ذہنوں میں نہ جانے کیا کچھ نہ ثبت کر ڈالا ہو۔ باپ کی شفقت سے محروم بچوں کو ممتا سے بھی جیتے جی محروم کر ڈالا۔ ایک طرف ظالم عورت تھی اور دوسری طرف مظلوم عورت اور میں ان دونوں کا موازنہ کر رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ کیا واقعی ظالم مرد ہے؟

☆☆......☆☆

کلان سر

(یہ اصلی کہانی ہے......! بیا کماری، بلوچستان میں بسنے والے ایک ہندو خاندان کا چراغ ہے۔ ۱۲ سال کی عمر میں بیا کماری، ایک لیکچرار ہے، اور تا عمر تعلیمی وظیفہ حاصل کرنے والی پہلی ایسی لڑکی ہے جو اپنی معذوری کے باوجود ایک نام بنانے میں کامیاب ہو سکی۔ میں لعل انجلو کی شکر گزار ہوں جنہوں نے بیا کی شخصیت کو نہ صرف نکھارا بلکہ دنیا کے سامنے پیش بھی کیا)

میمونہ صدف

اس کی پیدائش سے پہلے اس کا نام طے تھا۔۔۔ بیا کماری ۔۔۔ اس کی ماں خوش تھی کہ تین بہن بھائیوں اور کم و بیش دس سال کے وقفے کے بعد خدا نے ان کی گود ہری کی۔

اتنا بڑا سر! یہ تو کسی چڑیل کی پرچھائی ہے۔ رتن لال اپنی بیوی پر چلا رہا تھا۔۔۔۔ مالا کماری کی آنکھیں شوہر کی بلند آواز پر کھلی۔

میں کیا کہوں؟ بھگوان ہی جانے! کیا بنا دیا میری بچی کو۔ اس نے بچی کو سینے سے لگاتے ہوئے دکھی لہجے میں کہا۔

میں تو کہتی ہوں ناتھ۔ اسے کسی یتیم خانے میں داخل کروا دو۔ رتن لال کی ماں نے حقارت سے کہا۔

ماتا جی! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ ابھی میں زندہ ہوں اور میں اپنی اولاد کو یتیم خانے کیوں بھیج دوں ؟؟ کبھی نہیں!! مالا کماری نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

ہونہ ہو! تمھیں یہ چڑیل نقصان اور دکھ پہنچانے جا رہی ہے۔۔۔ سن لو تم میری بات!!! رتن لال کی ماں نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

ماتا جی! جو بھی ہو یہ بھی میرے جسم کا حصہ ہے، جو بھی ہے جیسی بھی ہے۔۔۔ میں اپنے جیتے جاگتے اس کو لاوارث نہیں کر سکتا۔۔۔ رتن لال نے کہا! تو اس کی ماں پاؤں پٹختے ہوئے کمرے سے باہر چل دی۔ دو آنسو مالا کماری کی آنکھوں سے بہہ کر اس کے گالوں کو بھگو گئے۔ رتن لال نے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا۔

مالا حوصلے سے کام لو،، ہمت کرنا ہوگی۔ ابھی تو آغاز ہے، ہم اس کا علاج کروائیں گے، میں ڈاکٹر سے بات کروں گا، رتن لال نے اسے تسلی دی۔

نہ جانے یہ بیا کی زندگی کے بارے میں پیشین گوئی تھی؟ جو بھی تھا رتن لال کی بات نے مالا کے دل میں ایک حوصلہ پیدا کر دیا کہ اسے اپنی بیٹی کے نہ جانے کتنے دکھ دیکھنا ہوں گے۔

جس نے بھی اس کو دیکھا کچھ نے مالا کو بد بخت قرار دیا تو کسی نے اس بچی کو عذاب سے تشبیہ دی، الغرض جتنے منہ اتنی باتیں۔

زندگی کی سانسیں چلنے لگتی ہیں تو صرف موت پر

رکا کرتی ہیں۔ دن بدن عمر میں اضافہ، ننھی خواہشات سے شروع ہوتے ہوئے، تعلیم، بنیادی ضرورتیں پوری کرنے کی خواہش بڑے بڑے خوابوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ڈاکٹروں کی ادویات، دم درود، منتوں نے اس پر کوئی اثر نہ کیا۔

اس کے سر کا سائز عام بچوں کی نسبت کافی بڑا تھا۔وہ جب بھی گھر سے باہر کھیلنے کو نکلتی بچے ڈر کر بھاگ جاتے۔اگر وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ ضد کر کے بازار چلی جاتی تو سب کی توجہ کم اور تمسخر کا نشانہ زیادہ بنتی۔دادی تو اس کے بہن بھائیوں کو بھی اس سے دور رکھتی۔انہیں بیا سے سخت نفرت تھی اور وہ اسے کسی گناہ کی سزا سمجھتیں تھیں۔عمر کے تقریباً پانچ سال اس نے گھر ہی میں گزار دیے تھے۔

وہ محلے میں بھی جاتی تو ہر طرف سے چڑیل چڑیل کی آوازیں گونجنے لگتی۔یہی وجہ تھی کہ اس کا کوئی دوست نہ بن سکا۔ہاں دوست تھی تو ایک چھوٹی سی گڑیا جو اسے ماتا جی نے اپنے ہاتھوں سے سی کر دی تھی۔اس نے اس گڑیا کا نام بھی بیا ہی رکھ چھوڑا تھا۔

دیکھو بیا! یہ سب مجھ سے ڈرتے ہیں لیکن میں کوئی ڈروانی تھوڑا ہی ہوں۔بس یہ سر نہ جانے کیوں بڑا سا ہے؟ وہ اپنی گڑیا سے اکثر و بیشتر باتیں کیا کرتی تھی۔اس دن بھی وہ بازار سے لوٹی تو حسب معمول بے حد دکھ کا شکار تھی اور گڑیا سے بات کرنے لگی۔مالا کماری یہ سب سن رہی تھی لیکن اپنی بچی کے لیے کچھ نہ کر سکنے کی وجہ سے وہ آہ بھر کر رہ گئی۔

☆......☆......☆

رتن لال! بیا اب بڑی ہو چکی ہے اب ہمیں



اسے سکول بھیجنا چاہیے، کم از کم تعلیم تو ہو!! مالا کماری ماں تھی، اسے ہر صورت اپنی بچی کو تعلیم دلوانے کا شوق تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ بیا عام بچوں کی طرح اپنی زندگی گزارے۔

ٹھیک ہے میں اسے سکول میں داخل کروا دوں گا، بس کوئی تماشا نہ بن جائے۔ رتن لال نے پریشانی سے کہا۔

بیا کو مالا کماری نے جب بتایا کہ اسے سکول داخل کروایا جائے گا تو وہ خوشی سے پھولے نہ سمائی۔ پرائیویٹ سکولوں میں عموماً بچے سے ملے بنا ہی داخلہ کر لیا جاتا ہے اور یہی ہوا! بیا کا داخلہ بھی ہو گیا۔ بنیادی کاغذات رتن لال نے مالا کو لا تھمائے تھے۔

مبارک ہو! بیا کا داخلہ میں نے کروا دیا ہے۔ رتن لال کی آواز میں خوشی سے زیادہ فکر مندی تھی۔ مالا کے زرد چہرے پر خوشی کے سرخ ڈورے چمکنے لگے تھے۔

بھگوان کی کرپا سے اب اس کی زندگی ایک اچھی ڈگر پر چل نکلے گی! مالا نے کہا اور یہ خبر بیا کو سنائی۔

اے ناتھ! یہ میں کیا سن رہی ہوں؟ تم بیا کو تعلیم دلواؤ گے۔ بھلا ڈائنیں بھی کبھی سکول میں پڑھی ہیں کیا؟ دادی ماتا کو نہ جانے بیا سے کیا چڑ تھی۔ ان کی زبان سے بیا کیلئے طنز اور طعنوں کے سوا کبھی کچھ نہ نکلا۔ آج بھلا کس طرح جانے دیتیں۔

سنو سنو بیا! میں بھی سکول جاؤں گی۔ میری بھی کتابیں ہوں گی، بستہ ہو گا اور وہ نیلے کپڑے بھی، اب میرے بھی دوست ہوں گے، میں بھی دوسروں کی طرح کھیلنے جایا کروں گی، میں بہت خوش ہوں بیا۔ وہ اپنی گڑیا کو خوشی سے چوم رہی تھی، اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، نہ جانے یہ خوشی کے آنسو تھے یا اتنے عرصے کے غم کے!؟

مالا کماری نے اگلی صبح اسے نہلا دھلا کر صاف ستھرے کپڑے پہنائے۔ وہ خوشی خوشی تیار ہو رہی تھی۔

مالا! جلدی کرو! آج پہلے ہی دن لیٹ نہ ہو جائیں۔ رتن لال کی آواز بیا کے نیم مردہ جسم میں نئی روح پھونک رہی تھی۔ سکول کے پہلے دن کی خوشی اس کے چہرے سے پھوٹ رہی تھی۔ رتن لال کے لیے یہ مسکراہٹ نئی تھی، اس کو بھی اپنی بیٹی پر بے انتہا پیار آیا اور اس نے آگے بڑھ کر اس کے گال کو چوما۔ بیا کے لیے یہ سب بے انتہا خوش کن تھا۔

رتن لال، بیا کو لے کر قریبی پرائیویٹ سکول جا پہنچا۔ وہ سکول کے صدر دروازے پر اسے چھوڑ کر اپنے کام پر چلا گیا۔ وہ ایک پرائیویٹ ادارے میں ایک چھوٹی موٹی نوکری کرتا تھا جس کی تنخواہ اس کا گھرانہ پالنے کے کافی تھی۔ اس کے بچے گورنمنٹ سکولوں میں پڑھ رہے تھے لیکن بیا کے معاملے میں وہ محتاط تھا کہ کہیں اس کی وجہ سے دوسرے بچوں کی تعلیم متاثر نہ ہو۔

بیا کی پہلی مڈبھیڑ جس سے ہوئی وہ سکول کا چوکیدار تھا، جس نے اسے حیرانی سے دیکھا۔

اف! چڑیل۔۔۔ چوکیدار کے لفظ اس کے لیے نئے نہ تھے لیکن یہ الفاظ اسے چبھ ضرور گئے تھے۔ بیا کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ خاموشی سے آگے بڑھ جائے۔ وہ جیسے ہی بچوں کے درمیان پہنچی تمام بچے چڑیل چڑیل کا نعرہ لگانے لگے، کچھ بچے وہاں سے بھاگ نکلے، کچھ نے اس کے سر کو چھو کر دیکھنے کی کوشش کی۔ بیا کے لیے یہ رویہ نیا نہ تھا لیکن اس کے اندر کچھ بڑی زور سے ٹوٹ گیا۔ سکول میں یہ سب بالکل غیر متوقع تھا۔ اسے کلاس میں جانا تھا لیکن کسی سے پوچھنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔

کیا ہو رہا ہے یہاں؟ اور۔۔۔ یہ کون ہے؟ وہ کوئی ٹیچر تھی شاید۔۔۔۔ جو بچوں کی بھیڑ دیکھ کر ادھر چلی آئی تھی۔

اپنی اپنی کلاس میں جاؤ، وہ انگریزی میں چلا کر بولی! بچوں کی بھیڑ ایک دم سے چھٹ گئی۔

آپ کا ایڈمیشن کس کلاس میں ہوا؟ بیا نے اپنی کلاس کا بتایا۔ ٹیچر اسے کلاس میں لے آئی۔ بیا کو دیکھتے ہی کچھ بچوں کی چیخ نکل گئی اور بے اختیار وہ چڑیل چڑیل پکارنے لگے۔ بیا کے دل پر گویا گھونسے برس رہے تھے۔ اس کے خوابوں کی کرچیاں اس کی آنکھوں میں چبھنے لگی تھی۔ لیکن اسے پھر بھی تسلی تھی کہ وہ پڑھ لکھ کر کچھ نہ کچھ بن ہی جائے گی۔ اس نے دل ہی دل میں طے کر لیا کہ وہ ایک دن چڑیل پکارنے والے بچوں سے کہیں زیادہ کامیاب ہو کر دیکھائے گی۔ لیکن قسمت میں کچھ سخت پتھر توڑنا ابھی باقی تھے۔ اگلے ہی دن کچھ بچوں کے والدین شکایت لے کے آگئے کہ ان کے بچے راتوں کو ڈرتے ہیں۔ پرنسپل کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ بیا کو سکول سے نکال دیں۔

بیا کو کہہ دیا گیا کہ وہ سکول نہ آئے۔ دکھ کا ایک پہاڑ تھا جو اچانک سر پر آ گرا تھا!

وہ گھر پہنچی تو اس کے چہرے پر موت کی مردنی چھائی ہوئی تھی۔ آنسو تھے کہ آنکھوں کے بند توڑ کر باہر نکلنے کو تیار تھے۔

بیا! کیا ہوا؟ کسی نے مارا یا کچھ کہا؟ مالا کماری نے اسے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

ہونا کیا تھا! ماتا جی۔ مجھے سکول سے نکال دیا گیا! بیا نے دکھ سے کہا۔ یہ کہہ کر بیا ماں سے دور ہو کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ آنکھوں کے بند ٹوٹ چکے تھے، وہ بستر پر گری اور دھاڑیں مار مار کے رونے لگی تھی مالا کماری نے اسے اپنے سینے سے لگانے کی کوشش کی جس کو وہ دھکے سے ہٹانے کی کوشش کرنے لگی۔

بیا، دیکھو! یوں ہمت نہیں ہارتے۔۔۔۔ دیکھنا ایک نہ ایک دن سب صحیح ہو جائے گا۔ مالا کماری نے اسے ایک مصنوعی تسلی دیتے ہوئے کہا۔

ماتا! کوئی فائدہ نہیں ان باتوں کا! آپ مجھے مار کیوں نہیں دیتی؟ یہاں سب مجھے چڑیل کہتے ہیں، سکول سے مجھے نکال دیا گیا، مجھے مر جانا چاہیے۔ بیا کماری کا ضبط آج ٹوٹ گیا تھا۔

بیا! ایسا نہیں کہتے۔ ہم کسی اور سکول میں تمہارا داخلہ کروا دیں گے۔ مالا کماری نے اسے سینے سے چمٹائے ہوئے کہا۔

ماتا جی اب مجھے کسی سکول میں نہیں جانا۔ اب میں خود سے گھر میں پڑھوں گی، آپ میری مدد کریں گی نا؟ بیا نے یہ فیصلہ کیسے کیا تھا وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔ لیکن وہ پھر سے یہ اذیت نہیں اٹھانا چاہتی تھی۔

مالا کماری نے شام ہوتے ہی رتن لال کو سب بتا دیا تھا۔ بیا کا فیصلہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا موڑ تھا۔ اسے بہن بھائیوں کی کتابیں اور پرانی کاپیاں دے دی گئیں۔ بڑا بھائی کبھی کبھار دادی سے چھپ کر اسے پڑھا دیا کرتا تھا۔

اب وہ تھی اور گڑیا۔ وہ گڑیا کو کہانیاں سنایا کرتی، اس نے فرمائش کر کے رتن لال سے کہانیوں کی چھوٹی چھوٹی کتابیں منگوا لی تھیں۔ وہ دن بھر کتابیں پڑھتی رہتی، اپنے کمرے میں ہی محدود ہو کر رہ گئی تھی۔

ایک دن مالا کماری اسے قریبی پارک میں لے گئے۔ وہاں کچھ بچے تقریریں پڑھ رہے تھے، ان کی ٹیچر انھیں سمجھا رہی تھی، وہ کبھی انہیں ڈانٹتی تو کبھی پیار سے سمجھاتی۔ بیا، دلچسپی سے ان بچوں اور ٹیچر کی جانب دیکھنے لگی۔ بیا کے دل میں خواہش کے پودے نے سر اٹھا لیا۔ مالا کماری اور رتن لال دوسرے بچوں کی جانب دیکھ رہے تھے، وہ آہستگی سے ٹیچر کی جانب بڑھی۔۔۔ کسی نے اسے اٹھتے ہوئے محسوس نہیں کیا تھا۔

میڈم! کیا میں بھی اس گروپ میں شامل ہو سکتی

ہوں۔ بیا نے نیم امید سے کہا۔۔ ٹیچر نے اس کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور سوچا کہ اس لڑکی کو کیا ہی آتا ہوگا۔ ان بچوں کے لیے بیا چڑیل نہ تھی۔ اس لیے انہوں نے کوئی شور نہ مچایا۔ بیا کے لیے یہ نہایت ہی خوش کن لمحہ تھا۔

بیٹے! کل ہمارا ایک فنکشن ہے۔ آپ آسکتی ہیں ! ٹیچر ایک ادارے سے منسلک تھی جس کا نام لیٹل اینجل تھا۔ یہ ادارہ، نارمل بچوں سے پیچھے رہ جانے والے بچوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرتا تھا۔ مالا کماری کی نظر بیا پر پڑی تو وہ بھی اس جانب چلی آئی۔

آپ اپنی بچی کو کل ہمارے فنکشن میں ضرور لے آیئے گا۔ ٹیچر نے تذبذب کا شکار مالا کماری کو کہا۔ مالا نے بس سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ سورج کے طلوع ہوتے ہی بیا کی زندگی میں امید کا دیا جل اٹھا۔ اس نے اپنا سب سے خوبصورت لباس چنا اور تیار ہو کر مالا کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ مالا نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا اگرچہ اس کے چہرے پر بہت رونق نہیں تھی لیکن ناامیدی بھی نہیں تھی۔ مالا نے سر پر دوپٹہ اوڑھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر فنکشن میں جانے کے لیے اٹھی۔

اب کہاں کی تیاری ہے،، ماں اور چڑیل بیٹی کی؟ دادی نے حسبِ عادت کہا۔

جاؤ۔۔ جاؤ۔۔۔ منہ کی کھا کر لوٹ آنا۔ الفاظ تھے یا تیر تھے جوان دونوں کے دلوں کو زخمی کر رہے تھے۔ مالا نے کچھ بولنا چاہا لیکن بیا نے اس کا ہاتھ تھام کر نفی میں سر ہلا دیا۔ مالا نے حیرانی سے بیا کی جانب دیکھا اور اثبات میں سر ہلا کر خاموشی سے باہر کی جانب قدم بڑھائے۔ اگرچہ دادی کے لیے یہ رویہ نیا تھا، وہ کچھ بولی نہیں بس نفرت کا ایک ہنکارا ابھرا۔

تقریری مقابلہ میں بیا کو ایک جانب بٹھا دیا گیا۔ وہ ہر ایک بچے کو بغور دیکھنے لگی، بولنے کا انداز، ابرو کا اٹھنا، سبھی نوٹ کر رہی تھی۔ مقابلہ ختم ہو گیا، بیا ٹیچر کے پاس چلی آئی۔

میڈم! کیا میں بھی تقریر کر سکتی ہوں؟ بیا نے اجازت مانگنے کے انداز میں کہا۔ ٹیچر نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

آپ کل میرے گھر آجائیں۔ یہ سامنے پلازہ میں، میں رہتی ہوں۔ میں آپ کی قابلیت کو دیکھ لیتی ہوں۔ ٹیچر کے الفاظ تھے یا مرہم کے پھاہے۔ اگلے دن علی الصبح وہ بھاگم بھاگ ٹیچر کے گھر پہنچ گئی۔ ٹیچر نے اسے دیکھا تو خوش کم حیران زیادہ ہوئیں۔ اس پلازہ میں کبھی غیر مسلم نے قدم نہ رکھا تھا۔ انہوں نے بیا سے تقریر کرنے کو کہا۔

بیا کے لہجے میں بلا کا اعتماد تھا، انداز مدلل، یہ وہ ہیرا تھا جس کو آج تک کوئی پہچان ہی نہ پایا تھا۔

تین منٹ میں وہ اتنا اچھا بول پائی کہ ٹیچر حیران سے خوش ہو گئی۔

رتن لال اور اس کی بیوی کو خصوصی طور پر اس فنکشن میں بلایا گیا تھا۔ مالا کماری کو یقین ہی نہ آرہا تھا کہ یہ بیا ہے جو کم و بیش سو بچوں کے درمیان کھڑی بول رہی ہے۔

یہ تو وہ چڑیل نہ تھی جو بچپن سے اپنے کمرے چھپ جایا کرتی تھی، جو بے آواز رویا کرتی تھی۔ رتن لال نے بیا کا ماتھا چوما، مالا، بیا کو گلے لگا کر خوشی کے مارے دھواں دھار رونے لگی تھی۔

اس دن کے بعد بیا ہر فنکشن میں شامل ہونے لگی۔ اس کی تقریر عام بچوں سے ہٹ کے امید اور زندگی کے بارے مثبت رویے پر مبنی ہوا کرتی تھی۔

کوئٹہ میں مقیم یہ بچی اپنے شہر کا ہی نہیں، صوبے بلکہ پورے ملک کا فخر بنتی چلی گئی۔

آج بیا کماری دنیا کی سب سے کم عمر موٹیویشنل ٹرینر ہے۔

☆☆.....☆☆

لاہور سے ارسال کردہ جذباتی تحریر

خواب ادھورے

مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں جگنو جھلملانے لگتے تھے‘ میں اس کی پہلی اولاد تھا اور وہ مجھے ٹوٹ کر چاہتی تھی ماں تھی ناں اس لیے‘ میرے ٹوٹنے اور بکھرنے پر بھی ثابت قدم رہی......

تسنیم کوثر

یا نبی سلام علیک
یا رسول سلام علیک
یا حبیب سلام علیک
صلوۃ اللہ علیک

سلام کی آوازیں پورے گھر میں گونج رہی تھیں۔ میلاد پڑھنے والی کی پُرسوز آواز‘ عرق گلاب اور پھولوں کی مسحور کن خوشبو نے ماحول کو بہت پُرنور بنادیا تھا۔ سروں پر آنچل ٹکائے بہت سی عورتیں لہک لہک کر سلام پڑھ رہی تھیں۔ میلاد پڑھنے والی کے داہنی طرف میری ماں بھی اس محفل سلام میں شامل تھی۔

میں اپنے کمرے سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ ماں کے اشکوں کی روانی نے اُسے بہت مقدس بنادیا تھا۔ میری ماں...... بہت حسین عورت تھی اور اس وقت تو...... آنسوؤں سے تر چہرے میں وہ یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے شبنم سے دھلا ہوا گلاب کا پھول......

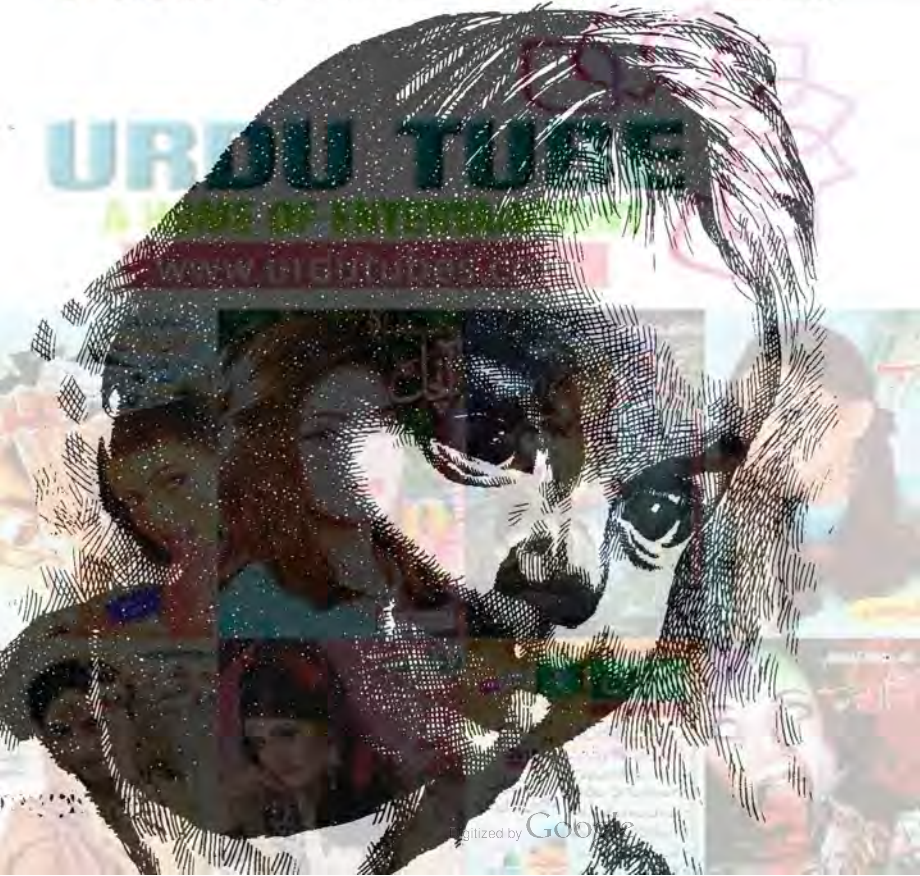
ان آنسوؤں میں جو درد تھا ماں کے چہرے پر جو کرب تھا اُسے مجھ سے زیادہ کون جان سکتا تھا۔ اپنے ڈھیر سارے بہن بھائیوں میں...... ایک میں ہی تو تھا جو ماں کے بہت قریب تھا اور جس سے ماں دل کی ہر بات کہہ دیتی تھی۔ اتنا دکھ سکھ تو ماں...... ابا کے ساتھ بھی نہیں کرتی تھی۔

یہ بات نہیں تھی کہ ماں اور ابا میں بنتی نہیں تھی۔ ماں تو ابا کی پوجا کرتی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ماں کی شادی بہت چھوٹی عمر میں ہوگئی تھی۔ پندرہ برس کی عمر میں بیاہی گئی تھی میری ماں...... پھر ابا نے اسے رکھا بھی ذرا رعب سے تھا۔

وہ تو اتنی فرمانبردار ہوگئی تھی کہ سانسیں بھی ابا کی مرضی سے لیتی تھی جس عمر میں لڑکیاں خواب بُنتی ہیں ماں اس عمر میں ایک بھرے پُرے گھر کی ذمہ داری سنبھال چکی تھی۔ ایک بچے کی ماں بن گئی تھی۔

میں اس کے آنگن میں کھلنے والا پہلا پھول تھا۔ میری نانی بتاتی تھیں۔ مجھے گود میں لے کر ماں کا

رنگ شہابی ہو جاتا تھا۔
ممتا کی خوبصورتی ماں کو اور بھی حسین بنا دیتی تھی۔ یوں تو میرے بعد بھی بہت سے پھول ماں کے آنگن میں مہکے مگر......
مگر رشتہ ماں کا میرے سنگ بنا وہ میرے کسی اور بہن بھائی سے نہ بن سکا۔ ماں نے اپنی ماں کی ممتا تو سب پر نچھاور کی مگر...... مجھے ان سب سے بلند مقام پر رکھا۔
الگ قربت و محبت سے نوازا۔ کہتے ہیں میرے گود میں آتے ہی میری ماں کچھ بہادر بھی ہوگئی تھی اور جیسے جیسے میں بڑا ہوتا گیا۔ ماں کی ہمت بڑھتی ہی گئی۔ ماں نے مجھ سے رشتے بھی تو کئی جوڑ رکھے تھے۔ کبھی وہ مجھ پر ممتا کے رنگ چھلکانے لگتی اور کبھی بڑی بہنوں کی طرح میرے ناز اٹھانے لگتی۔
وہ میری ماں ہونے کے ساتھ ساتھ میری دوست بھی تھی۔ ماں میری کسی بات کو کبھی ٹالتی ہی نہیں تھی۔ مجھے کبھی کوئی ضد منوانے کی نوبت ہی نہ آئی کیونکہ ماں تو میری آنکھ کا اشارہ جان جاتی تھی۔
میرے دل کی بات سمجھ جاتی تھی۔ ساری مائیں شاید ایسی ہی ہوتی ہیں۔ پل پل دھیان رکھنے والی' گھڑی گھڑی واری جانے والی' محبتیں نچھاور کرنے والی' مگر میری ماں اس کی تو بات ہی اور تھی۔
وہ جب مجھے اپنی ممتا کی بارش میں بھگوتی'



میں سرشار ہو کر سوچنے لگتا۔ دنیا کی کوئی ماں اپنے بیٹے کو اتنا چاہ ہی نہیں سکتی جتنا میری ماں مجھے چاہتی تھی' جب میں بڑا ہوا تو ماں کا روپ کچھ اور نکھر آیا تھا۔ لوگ کہنے لگے تھے جوانی مجھ پر نہیں ماں پر آرہی ہے۔ اس کے تو انداز ہی بدل گئے تھے۔ بیٹے کے جوان ہونے کا احساس...... عورت کو مضبوط بنا دیتا ہے اس کا اندازہ ہو گیا تھا مجھے......

میرا قد تو ابا سے بھی اونچا نکل آیا تھا۔ بوٹا سے قد کی میری ماں کو اپنی گردن اُٹھا کر مجھے دیکھنا پڑتا تھا۔ وہ جب مجھے دیکھتی اُس کی آنکھوں سے محبت کی پھلجھڑیاں چھوٹنے لگتیں۔ تب وہ گھبرا کر جھٹ سے اپنی آنکھیں نیچے کر لیتی۔ شاید اسے وسوسے گھیر لیتے تھے۔ ماں کو ڈر لگتا تھا کہیں مجھے اس کی نظر نہ لگ جائے وہ میرا صدقہ اتارتی۔ سورتیں پڑھ پڑھ کر پھونکتی میں جب بھی گھر سے باہر نکلتا وہ آیت الکرسی پڑھ کر حصار باندھ دیتی...... میری نظر اتارنے کو اس نے ڈھیر ساری لال مرچیں ڈنڈی سمیت منگوا رکھی تھیں۔ میرے بہن بھائی ماں سے گلہ کرتے کہ وہ اِن سے اتنا پیار کیوں نہیں کرتی تب ماں محبت بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہتی۔

''پیار تو مجھے تم سب سے ہے لیکن جو جگہ گل شیر کی ہے وہ کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔ خیر سے میرا پہلا پہلا پتر ہے۔'' یہ کہتے ہوئے ماں کا لہجہ بہت فخریہ ہو جاتا۔

جب میری ڈگری مکمل ہوئی تو ماں نے بڑی دھوم دھام سے جشن منایا تھا گھر میں شادی کا سماں ہو گیا تھا۔ سب عزیز رشتہ دار جمع تھے۔ خوب چہل پہل ہو رہی تھی۔ ماں نے خوشی میں شریک تمام لڑکیوں کو چنری کے بڑے خوبصورت دوپٹے منگوا کر دیے تھے اور ساتھ ہی لڈی کی شرط بھی رکھی دی تھی پھر ساری رات خوب ہلا گلا رہا۔ لڈی کی یہ محفل پو پھوٹنے تک چلی' سب لڈی سے محظوظ ہو رہے تھے اور میں...... میری نظریں تو بالی پر ٹکی ہوئی تھیں۔

ابا کے رشتے کی بھانجی...... بالی...... پھوپی فاطمہ کی بیٹی اقبال جسے پیار سے سب بالی کہتے تھے۔ لال کرتی دوپٹے میں لڈی ڈالتی بالی جیسے میرے دل میں کھب گئی تھی۔ اور دور...... رشتہ دار خواتین کے جھرمٹ میں گھری میری ماں نے میری نظریں پڑھ لی تھیں۔

تبھی تو رات فنکشن ختم ہونے کے بعد ماں نے میرے بالوں میں اپنی انگلیاں سرسراتے ہوئے مجھ سے پوچھا تھا۔

''بالی کیسی لگی گل شیر......؟'' اور میں بس ماں کو دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ جی ہی جی میں ماں کی جہاندیدگی کا قائل ہو گیا تھا۔ میں ماں سے بھلا کیا کہتا۔ ماں نے تو میرے دل کی بات کہہ دی تھی۔ پھر ماں نے پیار سے میرا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا تھا۔

''تُو فکر نہ کر...... میں فاطمہ کو راضی کر لوں گی۔'' یہ کہہ کر ماں تو چلی گئی تھی اور میں سپنوں کی نئی دنیا میں کھو گیا تھا جس روز ماں بالی کو میرے نام کی انگوٹھی پہنا کر آئی پورے گاؤں میں دھوم مچ گئی۔

ماں نے ڈھیروں مٹھائی بانٹی تھی۔ اتنی خوشی منائی کہ سب عزیز و اقارب دنگ رہ گئے تھے اور بہت سی ماؤں نے تو برملا بالی کو بھاگوان کہہ دیا تھا اور بہت سی ہم عمر لڑکیاں بالی کی قسمت پر رشک کرنے لگی تھیں۔

پھوپی فاطمہ بھی خوشی سے پھولے نہیں سماتی

تھی۔ بیٹی کی قسمت جاگ گئی تھی۔ نمبر داروں کی بہو بننے والی تھی اس کی بیٹی...... اس کا تو بس نہیں چلتا تھا کہ آج ہی بیٹی کو ڈولی میں بٹھا کر میرے گھر بھیج دے، پر ماں نے بھی تو اپنے ارمان پورے کرنے تھے۔

پہلے بیٹے کی شادی ماں بڑی دھوم دھام سے کرنا چاہتی تھی۔ وہ تو دن گن رہی تھی کہ کب میں اٹھارویں میں لگوں اور وہ میرے سر پر سہرا سجا دے۔

اس برس مونجی کی فصل اٹھنے پر شادی کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ ماں خوش تھی اور میں بھی خوش تھا اور اس کے ساتھ ساتھ بالی بھی بہت خوش تھی۔ بالی کی خوشی کا اندازہ مجھے اس کے گلابی شہابی رنگ اور جھکی ہوئی پلکوں سے ہوا تھا۔ خالہ صغریٰ کی بیٹی کی شادی پر جب میرا اس سے سامنا ہوا تو وہ شرما کر لجا کر دوپٹے کے پلو کو منہ میں دبا کر کن اکھیوں سے دیکھتے ہوئے لپک کر آگے بڑھ گئی تھی۔ اس کا یہ شرمیلا انداز مجھے بتا گیا تھا کہ وہ بھی میرا ساتھ پا کر خوش تھی۔

مونجی کی فصل تیار تھی فصل اچھی ہوئی تھی۔ من کی مرادیں پوری ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ ماں تیاریوں میں لگی تھی۔ پھوپی فاطمہ سے شادی کی تاریخ لینے جانا تھا۔ ماں اپنے شوق پورے کر رہی تھی اور ابا مصنوعی غصے سے ماں کو ڈانٹتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''ہاتھ ہولا رکھ ذرا...... گل شیر کی ماں ہمیں اور بچے بھی بیاہنے ہیں۔'' پر ماں اس کی کب سن رہی تھی۔

آخر وہ نمبردارنی تھی۔ اسے بھی تو برادری میں اپنی ناک اونچی رکھنا تھی۔ اور پھر وہ دن آ گیا ماں خوب تیار ہو کر ڈنگی جھمکی پہنے جب مجھے پیار دینے آئی تو میں ڈر سا گیا میری نظریں جھک گئیں ماں اور چھوٹی بہن سلطانہ میں زیادہ فرق نہیں لگ رہا تھا۔ ماں میری نظر اتارنے لگی اور میں دل ہی دل میں ماں کی نظر اتار رہا تھا۔ ماں اپنے قافلے کے ساتھ بالی کے گھر جا چکی تھی اور میں آنکھیں موندے پڑا تھا۔ آنے والے حسین دنوں کا تصور میرے من کو گدگدانے لگا تھا۔ میں بند آنکھوں سے کبھی ماں کو شگن کرتے دیکھ رہا تھا اور کبھی بالی کو شرماتے ہوئے، عجیب حالت ہو گئی تھی میری......

ماں ابھی وہاں پہنچی تھی اور میں اس کی واپسی کا منتظر تھا چاچا غلام رسول سے جانے کتنی بار پوچھ چکا تھا کہ ماں کب آئے گی اور چاچا حقے کی گڑگڑاہٹ روک کر پہلے مسکراتا اور کہتا۔

''اوئے پتر...... حوصلہ کر...... آجائے گی ابھی تو پہنچی ہو گی۔'' وقت گزر ہی نہیں رہا تھا۔ اس عجیب اضطراب سے بچنے کو میں نے چاچا غلام رسول کو ساتھ لیا اور منڈی جا پہنچا مونجی کا سودا کرنا تھا۔ ریٹ بڑھ گئے تھے ہر آڑھتی وہی پرانا ریٹ لگا رہا تھا۔ کتنی دیر ہم دونوں منڈی میں پھرتے رہے۔ آخر ایک جگہ ہمیں اچھے دام مل گئے۔ اس کام سے فارغ ہو کر ہم واپس لوٹے تو شام کا ملگجا اندھیرا پھیل گیا تھا کیا خبر یہ ملگجا اندھیرا میری خوشیوں کو نگل لے گا۔

میری ہنستی مسکراتی زندگی میں ہولناک سناٹے بھر دے گا تبھی تو...... دھند کی لپیٹ میں آیا ہوا ٹرانسفارمر مجھے نظر ہی نہ آیا تھا۔

ماں لڈوؤں سے بھری تھالی اٹھائے اس وقت شگن کر رہی تھی جب اسے یہ خبر ملی لڈوؤں کی تھالی، کچی مٹی کے فرش پر جا گری تھی۔ لڈو بکھر گئے تھے اور ان کے ساتھ ہی ماں کے خواب بھی، وہ اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھی تھی سنا ہے جب تک مجھے

ہوش نہیں آیا' ماں کے آنسو نہیں تھمے تھے۔ رب کے حضور' اپنے بیٹے کی زندگی کی بھیک مانگنے کو جھولی پھیلا دی تھی۔ صدقے خیرات کی انتہا کردی تھی لنگر کے منہ کھول دیے تھے مگر...... شاید دیر بہت دیر ہو چکی تھی۔ میری خوش بختی پر بدنصیبی کی سیاہ مہر ثبت ہو چکی تھی۔ مجھے زندگی تو مل گئی تھی مگر...... میں معذور ہو گیا تھا......

جوانی موت کی دہلیز پر آ پہنچی تھی۔ کاش یہ ہونی نہ ہوتی' کاش کچھ ایسا ہوتا جو اس ہونی کو بدل دیتا...... مگر چاہنے اور نہ چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا' اس حادثے نے ایک کڑیل جوان کو مفلوج کر دیا تھا۔ ریڑھ کی ہڈی کرچی کرچی ہو گئی تھی۔ اب بستر ہی میرا مقدر تھا۔ معذوری میرا نصیب بن گئی تھی۔ ماں کا دھواں دھواں چہرہ مجھے سب کچھ بتا گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کرب کی سرخ لکیریں نمایاں ہو گئی تھیں۔ دکھ کے اندھیرے اس کی خوشیوں کو نگل گئے تھے۔

ماں کی خاموشی بین کر رہی تھی۔ غم کے سناٹوں میں اس کی دل دہلا دینے والی چیخیں میں سن رہا تھا۔ اس کے دل کو درد کو اس کی روح کے کرب کو میں جانتا تھا۔ مگر اسے دلاسہ دینے کو...... اسے سنبھالنے کو...... میرے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ نہ روشنی کی کوئی کرن اور نہ ہی امیدوں کا کوئی جھلملاتا چراغ ...... زندگی ایک خوبصورت شے ہے جسے رشتوں نے اور بھی حسین بنا رکھا ہے' ہم رشتوں کے جھرمٹ میں ہی آنکھ کھولتے ہیں' عمر بھر یہ رشتے ہمیں یوں گھیرے رہتے ہیں جیسے چاند کے گرد کرنوں کا خوبصورت ہالہ مگر...... جب وقت بدلتا ہے...... حالات بدلتے ہیں تو ...... ان کے ساتھ ساتھ یہ رشتے بھی بدل جاتے ہیں نظریں چرا لیتے ہیں۔

مگر ایک رشتہ ایسا ہے جو کبھی نہیں بدلتا' کبھی آنکھیں نہیں چراتا' اور وہ رشتہ ہے ماں کا رشتہ' اس کا اندازہ مجھے ہو گیا ہے۔ بہت سے رشتے مایوس ہو کر رخ پھیر چکے ہیں مگر ماں اب بھی...... امید کی مدھم سی لو کو وسوسوں کی آندھی سے بچانے کی کوشش میں ہے۔ آس کی جوت جلائے' پروردگار سے...... میری مکمل صحت یابی کی طالب ہے۔ موت کے بے رحم ہاتھوں سے بچانے کے لیے ڈھیروں منتیں مانے ہوئے ہے۔ مگر موت دھیرے دھیرے میری رگوں میں اتر رہی ہے۔ مجھے اپنی طرف بڑھتی ہوئی موت سے کوئی ڈر نہیں......

اپنی جوانی ہارنے کا دکھ نہیں...... کسی رشتے کے چھوٹنے کا ملال نہیں...... پھوپی فاطمہ کی بے رخی کا گلہ نہیں...... بالی کے رخ پھیر لینے کا غم نہیں...... غم ہے تو صرف اپنی ماں کا...... جسے میری بیماری کے چھ ماہ نے چھ صدیاں پیچھے دھکیل دیا ہے...... وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا ہے جو موت کی آہٹ کو بھی زندگی کی نوید جان رہی ہے...... اب بھی کسی معجزے کی منتظر ہے۔ جس کی آنکھوں میں اس کے اشکوں سے دھندلایا ہوا ایک خواب ہے۔

اپنے گل شیر کے صحت یاب ہونے کا خواب اپنے بیٹے کے ارمان پورے کرنے کا خواب' بھرپور زندگی کے ساتھ اس کے جینے کا خواب' میری پاگل ماں...... یہ نہیں جانتی کہ ہر خواب کو تعبیر کہاں ملتی ہے کچھ خواب یونہی ادھورے رہ جاتے ہیں ٹوٹ جاتے ہیں...... اور ان کی کرچیاں رگ جان میں پیوست ہو کر عمر بھر رلاتی رہتی ہیں۔

☆☆......☆☆☆

پُراسرار نمبر 2

پُراسرار نمبر 1 کے ریکارڈ توڑ بزنس کے بعد

اب

پُراسرار نمبر 2

رات کی تنہائی میں مت پڑھیے گا۔

☆ سچی کہانیاں کا شمارہ فروری 2019 پُراسرار کہانی نمبر 2 ہوگا۔ اس یادگار نمبر میں نامور لکھاریوں کی ایسی کہانیاں شامل ہوں گی جنہیں آپ عرصہ دراز تک فراموش نہیں کرسکیں گے۔

جناتی کہانیاں، ارواح کہانیاں، شیطان اور آسیب پر لکھی ہیبت ناک سچی کہانیاں، دہشت سے بھری ڈراؤنی کہانیاں ہی اس نمبر کا حصہ نہیں ہوں گی بلکہ نیک روحوں اور مسلم جنات کی دوستیوں کے قصے بھی شائع کیے جائیں گے۔

☆ لکھاریوں سے درخواست ہے کہ 10 دسمبر تک اپنی کہانیاں ارسال کردیں۔

ایجنٹ حضرات سے درخواست ہے کہ برائے کرم اپنے آرڈرز سے ادارہ سرکولیشن کو فوری طور پر آگاہ کریں۔

مجبور عاشق

وہ عجیب پریشانی میں مبتلا ہو گیا تھا' کوئی سرا ہاتھ نہیں آ رہا' کیا آپ لوگ مجبور عاشق کی مدد کریں گے......

شبانہ اسلم

"میں اپنی کہانی کا آغاز کہاں سے کروں کچھ سمجھ نہیں آ رہی ہے مگر میں ایک عجیب سی کشمکش میں پھنس گیا ہوں۔" میرے آگے پہاڑ پیچھے کھائی ہے۔" نہ میں قدم آگے بڑھا سکتا ہوں نہ ہی پیچھے ہٹا سکتا ہوں بس میں ان دونوں کے درمیان پھنس کر رہ گیا ہوں مجھے رہنمائی کی ضرورت ہے میں آپ لوگوں کی رائے جاننا چاہتا ہوں تا کہ مجھے فیصلہ لینے میں آسانی ہو سکے، میرے حالات اس نہج پہ پہنچ چکے ہیں کہ میں مرنے کی تمنا کرنے لگا ہوں کیونکہ اس کے بغیر بھی تو میں مر ہی جاونگا نا۔

"آپ کہہ رہے ہونگے کہ یہ کیا پہلیاں بجھوا رہا ہے۔

تو آج میں آپ کے سامنے ساری بات رکھتا ہوں میری مدد کیجئے مجھے اس کشمکش سے نجات دلایئے یہ ایک بے بس و مجبور عاشق کی التجا ہے جو اپنی محبت، روایات اور رشتوں کے بھنور میں پھنسا ہوا ہے۔

"میری نام زاہد باجوہ ہے میں وزیر آباد کا رہنے والا ہوں اور یہ میری زیست کی سسکتی سلگتی ایک کہانی ہے۔ میں سخت اذیت میں ہوں اس وقت میں اپنے آپ کو اتنا بے بس محسوس کر رہا ہوں کہ کچھ دیکھائی نہیں دے رہا اس لیے میں اپنا دل آپ کے سامنے کھول کر رکھ رہا ہوں خدارا مجھے گائیڈ کیجئے میری مدد کیجئے۔

"میرے دل میں پیار کی کونپل پہلی بار ساتویں کلاس میں پھوٹی، منزہ میری کلاس فیلو تھی۔

اس کا لائبریری کارڈ اسکے بیگ سے گر گیا تھا میں نے اسے آواز دے کر اسکا کارڈ اسے پکڑایا۔

اس نے مسکرا کر میرا شکریہ ادا کیا اور اپنی دلکش مسکراہٹ سمیت وہ سیدھی میرے دل میں اترتی چلی گئی یوں سولہ سترہ سال کی عمر میں ہی میں اپنی کلاس فیلو کے عشق میں بری طرح گرفتار ہو چکا تھا۔ مجھے ہر وقت اسی کی یاد ستاتی ہر لمحہ اسی کا خیال رہتا، اس کا چہرہ ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے گھومتا تھا۔

میں اپنے دل کی کیفیت سے تنگ آ گیا تھا نہ میرا پڑھائی میں دل لگتا تھا نہ گھر میں اور نہ ہی کہیں اور......اسکول میں بھی میری نظریں صرف اسی کے چہرے کا طواف کرتی تھیں۔ میں خود پر سے اختیار کھوتا

جارہا تھا بالآخر میں نے اس سے بات کرنے کا فیصلہ کرلیا میں اکیلا ہی اکیلا اس عشق کی آگ میں جل رہا تھا اور اسے بھی اس آگ میں جلانا چاہتا تھا اور پھر ایک دن وہ گراونڈ میں اکیلی بیٹھی نوٹس بنارہی تھی میں اس کے قریب چلا گیا میں آج دل میں تہیہ کر کے آیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے میں ہر حال میں اس سے بات کروں گا۔

''زاہد تم۔۔۔۔کیا بات ہے؟'' وہ مجھے اپنی طرف عجیب سی نظروں سے تکتا پا کر حیران ہوئی۔

''منزہ مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے اگر آپ برا نہ مانو تو کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟'' اس کے سان وگمان میں بھی نہیں تھا کہ میں کیا بات کرنے والا ہوں اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں اس سے کچھ فاصلے پر ہو کر بیٹھ گیا وہ ہاتھ روک کر میری جانب متوجہ ہو گئی اب اسکی سوالیہ نگاہیں میرے چہرے پہ گڑی تھیں۔

''منزہ میں دراصل یہ کہنا چاہتا تھا کہ میں آپ کو پسند کرتا ہوں آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں......''

میں نے بمشکل تھوک نگلتے ہوئے بالآخر کہہ ہی دیا۔

''کیا؟'' وہ ہلکا سا اچھلی اور پھر ہولے سے وہی جادوئی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے بولی جس کا میں دیوانہ تھا

''زاہد! میں نے کبھی تمہیں اس نظر سے دیکھا ہی نہیں ابھی میرا دھیان ان باتوں کی طرف نہیں ہے.....ٹھیک ہے میں سوچ کے جواب دوں گی۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی اور مجھے یکسر نظر انداز کر دیا میں مایوس سا اٹھ آیا۔

''اور پھر میں نے تو جیسے اس کا پیچھا ہی لے لیا میں موقع بیموقع اس سے اظہار محبت کرنے لگا کہ شاید میری دیوانگی کا اس پہ کچھ اثر ہو جائے مگر اس کا ہمیشہ ایک ہی جواب ہوتا کہ مجھے سوچنے کیلیے وقت دو وہ میری بات کو قطعی طور پہ سیریس نہیں لے رہی تھی۔ میری فیلنگز جیسے اس کے لیے مذاق تھیں وہ جتنی غیر سنجیدہ تھی



ہیں اس کے لیے اتنا ہی سنجیدہ ہوتا جارہا تھا وہ جتنا مجھے اگنور کرتی میں اتنا ہی اس کی طرف لپکتا وہ مجھے گھاس تک نہ ڈال رہی تھی اور میں بس دل کا خالی کشکول لیے ہمیشہ اسکے قدموں میں اس کی محبت کی بھیک کا منتظر سر جھکائے رکھتا میری تڑپ بڑھتی جارہی تھی۔ مگر وہ ہر احساس سے بے بہرہ بنی ہوئی تھی پھر ہم میں دوستی تو ہوہی گئی تھی مگر میں اس دوستی کو کسی اور رنگ میں ڈھالنا چاہتا تھا اور وہ اتنی ہی لاپرواہی دکھاتی تھی بظاہر اسکا رویہ میرے ساتھ بہت اچھا تھا۔ کبھی کبھی مبہم سی امید بھی دل میں ابھرتی تھی کہ وہ بھی میری طرف مائل ہے مگر جب بھی اس بات کی تصدیق کرنا چاہی اس نے ہمیشہ میرے ارمانوں پہ پانی پھیر دیا اسکا وہ ہی جواب ہوتا جو وہ ہمیشہ دیتی تھی کہ مجھے سوچنے کا وقت دو

میں دن بہ دن اس کے پیار میں پاگل ہوتا جارہا تھا نہ مجھے اپنی ہوش تھی نہ پڑھائی کی میں اس کے عشق میں اتنا ڈوب چکا تھا کہ جو سبجیکٹ وہ رکھتی میں بھی وہی رکھتا......"

"پھر ایک دن ایسا آیا کہ وہ دوسرے شہر چلی گئی تب ہم بی اے میں پہنچ چکے تھے میں بھی اس کے پیچھے وہاں جا پہنچا اور وہیں پہ ہی ایڈمیشن لیلیا بی اے میں بھی میرے سبجیکٹ وہی تھے جو اس نے رکھے تھے یہ سمجھ لیں کہ میں نے اسکے قریب رہنے کے ہر جتن کیے۔ میں اسے ڈھیروں شاعری سینڈ کیا کرتا تھا اور وہ بھی......" وہ خوب صورت تھی یا نہیں یہ تو مجھے پتہ نہیں پر وہ مجھے دنیا کی سب سے حسین لڑکی لگتی تھی میرا دل پڑھائی سے اچاٹ ہو چکا تھا۔ میں اس میں اتنا مگن تھا کہ فائنل ایگزام سر پر آ گئے مگر میں نے ایک لفظ بھی نہیں پڑھا بس میرا مشغلہ اس کے گھر کے آگے بیٹھ کر اسے ہی دیکھتے رہنا تھا وہ بھی مجھے دیکھتی تھی نتیجتاً میں فیل ہو گیا اور میری پڑھائی بھی ادھوری رہ گئی......"

"مجھے اس کے پیچھے خوار ہوتے اتنے سال ہو گئے تھے مگر اس نے ایک بار بھی اظہار نہ کیا۔ یکا یک میرے گھر والوں نے میری منگنی کا فیصلہ کیا انہوں نے مجھ سے میری پسند پوچھی میں کیا جواب دیتا میں تو بار بار اس سے پوچھ پوچھ کر تھک چکا تھا مگر وہ کوئی مثبت جواب ہی نہ دیتی تھی۔ مگر میں نے پھر بھی اپنی کوشش جاری رکھی مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا گھر والوں کا اصرار تھا کہ بڑھتا ہی جارہا تھا اور منزہ تھی کہ کوئی آس ہی نہیں بندھا رہی تھی۔ اور دوسری طرف میرے لیے نئی مصیبت کھڑی ہو گئی تھی۔۔ ہوا یوں کہ میری اکلوتی سگی خالہ کے گھر میرے بھائی کی منگنی پہلے سے ہی طے ہو چکی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے ہیں میری ہونے والی بھابھی کی چھوٹی بہن میری محبت میں گرفتار ہو چکی تھی اس نے بصد اصرار اپنے گھر والوں کو کہہ کر اپنی منگنی مجھ سے کروائی تھی۔

اس نے اپنے گھر والوں سے صاف صاف کہہ دیا تھا وہ صرف شادی کرے گی تو زاہد سے کرے گی اور پھر بلا آخر گھر والوں کے بار بار پوچھنے کے بعد میں نے اپنے گھر والوں کے فیصلے کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے انہوں نے عمارہ سے میری منگنی کر دی۔

میری منگنی کی خبر منزہ تک بھی جانے کیسے پہنچ گئی اور پھر...... منگنی کے ٹھیک اگلے ہی دن منزہ آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سمیت میرے روبرو کھڑی تھی۔

"زاہد! تم ایسا کیسے کر سکتے ہو؟" "تم تو مجھ سے محبت کرتے تھے نا؟" "تم تو میرے طلبگار تھے نا تو یہ سب کیسے...... بولو جواب دو وہ سوالوں پہ سوال کیے جا رہی تھی اور میں حیران پریشان اس کا بدلا ہوا رویہ دیکھ رہا تھا اور پھر اس کے انکشاف نے تو میرے وجود کے پرخچے ہی اڑا دیے جب اس نے مزید بولنا شروع کیا۔

"زاہد...... میں بھی بہت دیر سے صرف تم سے ہی پیار کرتی ہوں مگر آپ کو کبھی بتا نہیں سکی جتنی شدت سے آپ مجھ سے پیار کرتے ہو اتنی ہی شدت سے میں بھی

آپ سے پیار کرتی ہوں اور جیسے ہی مجھے آپ کی منگنی کا پتہ چلا تو میرے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی میں تو یہی سمجھتی تھی کہ آپ بھی صرف مجھ سے لو کرتے ہو اور میرے علاوہ کبھی کسی اور کیساتھ شادی نہیں کرو گے مگر یہ میری خام خیالی تھی۔زاہد یہ آپ نے کیا کیا؟'' وہ بلک بلک کر رو رہی تھی اور میں سر پکڑے بیٹھا تھا۔

''منزہ تم ہی تو کہتی تھی کہ اگر تم نے کہیں اور شادی کروانی ہے تو جاؤ کرالو۔'' میں لاچارگی سے بولا مجھے اس پہ غصہ بھی آرہا تھا۔اف کیا کروں میں؟

مجھے عمارہ کی دھمکی بھی یاد آرہی تھی۔

''اگر آپ گھر والوں نے میری شادی زاہد سے نہ کی تو میں زندہ نہیں رہونگی۔''

''کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتے؟'' یہ دیکھو تمہاری بھیجی ہوئی شاعری میں نے اس ڈائری میں محفوظ کر رکھی ہے کیا یہ میرے پیار کا ثبوت نہیں ہے کہ میں بھی تمہیں اسی شدت سے چاہتی ہوں۔'' اس نے سسکتے ہوئے کالی جلد والی ڈائری میرے آگے کی۔

''سچ تو یہ ہے کہ میں نے صرف اور صرف تمہیں ہی چاہا ہے عمارہ سے مجھے ذرہ برابر بھی لگاو نہیں ہے۔'' میرے لہجے میں نمی سی گھل گئی۔

''تو پھر توڑ دو نا یہ منگنی میں بھی تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔'' وہ سر اٹھا کر ایک دم بولی۔

''اچھا میں کچھ سوچتا ہوں۔'' میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیکر تسلی دی مگر یہ میرا دل ہی جانتا تھا کہ میں کس عذاب میں پھنس چکا تھا۔

''کیا کروں؟ منزہ وہ لڑکی ہے جس کی خاطر میں نے اپنی لائف میں بہت کچھ کھویا تعلیم تک چھوڑ دی اسے کیسے چھوڑ دوں؟ مگر دوسری طرف اگر میں منگنی توڑ دیتا ہوں تو نا صرف میری اکلوتی خالہ ہم سے چھوٹ جائے گی اور پورا خاندان اس بات سے روٹھ جائے گا ہمارا بائیکاٹ کر دے گا میرے بھائی کی منگنی الگ متاثر ہوگی۔

میرے دماغ میں جھگڑے چلتے رہتے ہیں کچھ سمجھائی نہیں دیتا آٹھ سالوں کی محبت جو اب دس سالوں پہ محیط ہو چکی ہے اس سے کیسے دستبردار ہو سکتا ہوں تین سال سے میں سعودیہ میں ہوں اور سچ تو یہ ہے کہ میں آج بھی اس سے اتنی ہی محبت کرتا ہوں جتنی دس سال پہلے کیا کرتا تھا۔جس طرح اس نے میری شاعری کی ڈائری بنا رکھی ہے اسی طرح میں نے بھی اس کی بھیجی ہوئی شاعری کو محفوظ کر رکھا ہے میں وہ ڈائری اپنے ساتھ سعودیہ لیکر آیا ہوں جب بھی اداس ہوتا ہوں تو اس ڈائری کو پڑھتا ہوں اور منزہ کے احساس کو تازہ کیے رکھتا ہوں۔مجھے پتہ ہے کہ جب بھی میں چھٹی لیکر گھر گیا تو انہوں نے میری شادی کر دینی ہے جو کہ میں نہیں چاہتا اور دوسری طرف منزہ کا بھی اصرار بڑھتا جا رہا ہے کہ میں جلد ہی کوئی فیصلہ لوں۔میں ان دنوں بہت پریشان ہوں عجیب مخمصے میں پھنسا ہوں اگر مجھے منزہ نہ ملی تو میں مر جاونگا اور اگر منگنی توڑ دیتا ہوں تو رشتے دار گنوا بیٹھوں گا گھر والے الگ منہ موڑ لیں گے بھائی کا کیا بنے گا یہ ہے مختصر سی میری داستان......

''خدارا مجھے بتایئے کوئی مشورہ دیجئے کہ میں کیا کروں میں اس مخمصے سے کیسے باہر نکلوں جس میں میں پھنس کر رہ گیا ہوں مجھے عجیب سی گھٹن کا احساس رہنے لگا ہے۔

آپ لوگوں کی کیا رائے ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟

میں بہت پریشان ہوں کہیں اس گھٹن سے تنگ آ کر اپنی زندگی کا ہی خاتمہ نہ کر بیٹھوں۔

رہنمائی کیجیے پلیز

آپ سب سے التماس کرتا ہوں مجھے اس الجھن سے نکلنے کا کوئی سرا ہاتھ نہیں آرہا ہے۔

☆☆......☆☆

کراچی سے ارسال کردہ انتہائی لرزہ خیز کہانی

زلفوں کے اسیر

وہ جن بھی بریرہ پر عاشق ہو گیا تھا اور

اُس کو اپنے بچے کی ماں بھی بنا ڈالا......

سلمیٰ غزل

"اماں آپ کو کیا ہو گیا ہے ساری دنیا فیشن کرتی ہے میں کوئی دنیا سے انوکھی ہوں کھلے بال آج کل کا فیشن ہے مگر آپ سارا وقت میرے بالوں کے پیچھے پڑی رہتی ہیں اگر اللہ نے مجھے ایک خوبصورتی عطا کی ہے تو میں اسے چھپا کر کیوں رکھوں ہر وقت چٹیا باندھا رہا کروں، بال لپیٹو مغرب کے وقت کھلے بال لے کر درختوں کے پاس نہ جاؤ کسی کا سایہ ہو جائے گا نظر لگ جائے گی، جن بھوت پلید عاشق ہو جائیں گے۔"

"لو بھئی حد ہو گئی انسان تو عاشق ہوا نہیں جن عاشق ہو جائیں گے۔"

بریرہ نے اماں کی نقل اتاری تو انہوں نے ایک دھموکا کمر پر جڑ دیا۔ "زبان بغیر سوچے سمجھے قینچی کی طرح چلتی ہے" پھر وہ نرمی سے گویا ہوئیں۔

"دیکھو بیٹا تمہارے بھلے کے لیے ہی کہتی ہوں سورہ جن تم نے قرآن شریف میں پڑھی ہے نظر لگنا ثابت ہے، ہمارے پیارے نبیؐ سونے سے پہلے سورہ فلق اور سورہ الناس پڑھ کر خود پر دم کرتے تھے ہماری اماں نے ہمیں کبھی کھلے بال رکھنے نہیں دیے ہمیشہ تیل ڈال کر چٹیا باندھتی تھیں اور ہماری سرتابی کی مجال نہ تھی تمہارے بال مجھ پر ہی گئے ہیں احتیاط اچھی چیز ہوتی ہے، بڑوں کی باتوں میں کوئی نہ کوئی مصلحت بھی پوشیدہ ہوتی ہے مگر نوجوان نسل تو خود کو عقل کل سمجھتی ہے!"

مگر وہ بریرہ ہی کیا جو اماں کی بات دھیان سے سن لے اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے ماں باپ کی آنکھوں کا تارا تھی دونوں ہی جان چھڑکتے تھے۔

ان کو تو یہ سوچ سوچ کر ہی وحشت ہوتی تھی کہ ایک دن اسے رخصت ہونا ہے سب کچھ بیٹی کا ہی تھا پھر بھی وہ گھر داماد رکھنے کے خلاف تھے کہ اس طرح گھر داماد ہڈ حرام اور لالچی بھی ہو سکتا ہے۔

بریرہ بی ایس سی کی طالبہ تھی۔ لمبا قد، گندمی رنگت، معقول شکل وصورت مگر اس کے گھنے اور

لمبے بال سب کو مڑ مڑ کر دیکھنے پر مجبور کر دیتے تھے لمبے گھنے سیاہ بال کھولتی تو آبشاروں کا گمان ہوتا تھا ہر ایک دو ماہ بعد مٹھی بھر کاٹ دیتی پھر گھٹنوں سے نیچے آ جاتے اور انہیں بالوں پر فدا ہو کر التمش نے اسے ایک تقریب میں پسند کر لیا تھا برسر روزگار معقول قبول صورت ایک شادی شدہ بہن امریکہ میں اور بیوہ ماں اور اپنا ذاتی گھر تھا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں...... ماں باپ نے شادی کرنے میں دیر نہیں لگائی۔

التمش کے ساتھ اس کی خوب نبھ رہی تھی ساس خوش تو ماں باپ بھی مطمئن التمش اس کے بالوں کا دیوانہ تھا رات کو اس کے کھلے بالوں میں منہ چھپا کر سوتا اور ہر وقت اسے کھلے بالوں میں دیکھنا پسند کرتا تھا یوں تو ساس بے ضرر سی تھیں لیکن اماں کی طرح انہیں بھی اس کے کھلے بالوں پر اعتراض تھا اور سارا وقت ٹوک ٹوک کر اس کی جان جلاتی رہتی تھیں مگر یہاں بھی وہ التمش کی سپورٹ کی وجہ سے اس کان سن کر اس کان سے نکال دیتی تھی۔

☆......☆......☆

التمش کو آفس کی طرف سے کسی دوسرے شہر اور کبھی دوسرے ملک جانا پڑتا تھا' وہ فارماسیوٹیکل کمپنی میں اچھے عہدے پر کام کر رہا تھا مگر شادی کے چھ مہینے بعد بھی وہ اماں کے پاس رہنے نہ جا سکی تھی کیونکہ پھر التمش کی ماما اکیلی رہ جاتیں لیکن اس کی موجودگی میں وہ ہفتے میں ایک بار ضرور چکر لگا لیا کرتی تھی اس دن بھی جب التمش نے ایک



ہفتہ کے لیے لاہور جانے کا پروگرام بنایا تو اس نے اماں کے پاس جانے کی خواہش ظاہر کی التمش ہنس کر بولا۔

"بھئی میں تو تمہیں خود آنٹی کے گھر لے جانے والا تھا کیونکہ اماں میرے ساتھ ہی خالہ سے ملنے جا رہی ہیں۔" وہ بیحد خوش ہوئی۔ سچ ہے میکہ ہر لڑکی کو عزیز ہوتا ہے اور شادی کے بعد ہی ماں باپ کی قدر ہوتی ہے۔ ماں باپ بیٹی کو دیکھ کر نہال ہو گئے اور بریرہ کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ نہیں رہا تھا کیونکہ التمش کے گھر میں لان نہیں تھا اور یہاں گھر سے بھی زیادہ بڑا لان تھا جہاں ہر طرح کے پھول پودوں کے علاوہ جامن کا درخت بھی تھا جس کی جڑیں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں اور اس کے نیچے بیٹھ کر میگزین پڑھنے کا اپنا ہی مزہ تھا۔

دوشیزہ، سچی کہانیاں، آنچل، پاکیزہ وہ شادی سے پہلے بھی پڑھتی تھی اور اب التمش خرید کر لاتا تھا وہ روزانہ شام کی چائے یہیں بیٹھ کر پیتی تھی اور پھر مغرب کی اذان تک وہ یہیں پائی جاتی تھی اپنے پسندیدہ رسالوں کے ساتھ۔

☆......☆......☆

ہفتہ گزر چکا تھا اور ابھی التمش کے آنے میں ایک ہفتہ باقی تھا اور اس کو التمش کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔

اماں نے بہت چاہا کہ اس کے ساتھ ہی کمرے میں سو جائیں مگر ان کے آرام کے خیال سے اس نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ آپ تہجد کی وجہ سے جلد اٹھتی ہیں اور مجھے نیند نہیں آتی آپ ڈسٹرب ہوں گی۔"

رات کے دو بج رہے تھے چاروں طرف عجیب وحشت ناک سی خاموشی تھی بریرہ کو گھبراہٹ کے ساتھ خوف بھی محسوس ہو رہا تھا پہلے اس نے سوچا اماں کو اٹھا لائے پھر کنڈی لگا کر مطمئن ہو گئی بال کھول کر تکیے پر پھیلائے دوپٹہ سرہانے رکھا اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔

صبح اماں کے دروازہ پیٹنے پر اس کی آنکھ کھلی "کیا گھوڑے گدھے بیچ کر سو رہی ہو۔"

"اماں بس آ رہی ہوں۔" وہ گھبرا کر کھڑی ہوئی مگر اسے زور کا چکر آیا اور وہ واپس بستر پر گر گئی پھر مشکل سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔

"کیا ہو گیا دروازہ کیوں لاک کر لیا تھا؟"

"پتہ نہیں اماں رات میں نے کیوں کنڈی لگالی مشکل سے اٹھی ہوں چکر آ رہے ہیں۔"

"ہاں تو کھاتی بھی تو چڑیا جتنا ہو کمزوری تو ہو گی ناشتی کب کسی کی ہو اب جلدی سے باہر آؤ تمہارے ابو کو جلدی ناشتہ کرنے کی عادت ہے مگر وہ تمہارے انتظار میں بیٹھے ہیں۔"

"ہائے اماں آپ مجھے سویرے اٹھا دیتی ہیں...... آپ چلیں میں واش روم سے ہو کر آتی ہوں۔"

وہ اماں کے سامنے خود کو ہشاش بشاش ظاہر کرتے ہوئے باتھ روم میں گھس گئی حالانکہ کمزوری اور نقاہت کی وجہ سے دوبارہ لیٹنے کو دل کر رہا تھا دو تین دن میں ہی اس کی رنگت سرسوں کے پھول جیسی ہو گئی اور کھانے پینے سے دل اچاٹ ہو گیا اماں اس کے ساتھ سونے کے لیے بضد تھیں مگر اس نے صاف منع کر دیا آخر اماں نے کچھ سوچتے ہوئے اس سے کہا

"بریرہ تمہیں میری دوست مائرہ تو یاد ہو گی شادی کے بعد وہ ملک سے باہر چلی گئی تھی وہ اب تو اس دنیا میں نہیں رہی، اس کی بیٹی مجھ سے ملنے آئی وہ گائنا کولجسٹ کی حیثیت سے کام کر رہی

ہے تم مل کر خوش ہوگی بیحد نیک شریف اور حافظ قرآن بھی ہے۔''
ڈاکٹر کائنات سے مل کر بریرہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی سیاہ عبایا کے ساتھ سفید اسکارف نے اسے باوقار بنا دیا تھا۔
''کائنات آپ ماشاء اللہ حافظ قرآن ہیں اور نوکری بھی اتنی مشکل تو کیسے زندگی میں توازن رکھتی ہوں گی؟''
بریرہ سے صبر نہ ہوا تو پوچھ بیٹھی۔
''بہن جب اللہ ہدایت دیتا ہے اور کوئی بھی کام کرانا چاہتا ہے تو وہ کام ہو جاتا ہے میں صبح فجر کی نماز اور عصر کی نماز کے بعد روزانہ دہراتی ہوں اور اس میں میرے میاں اور ساس کا تعاون شامل ہوتا ہے اس لیے کوئی مشکل نہیں ہوتی بس ارادہ مضبوط اور نیت صاف ہونی چاہیے۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا اور بریرہ کو لے کر معائنہ روم میں چلی گئی پھر کچھ ٹیسٹ لکھ کر دیے اور ہنس کر بولی۔
''آنٹی آپ کا تجربہ صحیح بول رہا تھا مبارک ہو بریرہ پریگنٹ ہے ٹیسٹ کی رپورٹ سے اور کنفرم ہو جائے گا۔'' اماں سب کے سامنے ہی بریرہ سے لپٹ کر بھرائی ہوئی آواز میں بولیں ''بڑی خوشخبری سنادی بیٹا تم نے اس کے ابا' ساس اور التمش سن کر بہت خوش ہوں گے۔''
بریرہ کو بھی خوشی محسوس ہو رہی تھی مگر پتہ نہیں کیوں دل مرجھایا ہوا لگ رہا تھا اور وہ اپنی کیفیت سمجھنے سے قاصر تھی۔
''آنٹی اس کے کھانے پینے کا خاص خیال رکھیے گا بہت کمزور ہو رہی ہے بریرہ۔''
اماں کے پاؤں خوشی سے زمین پر نہیں ٹک رہے تھے مگر انہوں نے تنبیہ کی ''دیکھو یہ بات ابھی کسی کو مت بتانا سوائے التمش اور ساس کے ...... نظر لگ جاتی ہے۔''
''اف اماں یہ نظر کیا بلا ہے کہ جان نہیں چھوڑتی ہزاروں عورتیں روزانہ ماں بنتی ہیں میں کوئی دنیا کی پہلی عورت تھوڑی ہوں۔'' حسب عادت بریرہ چڑ کر بولی
''بیٹا نظر لگنا تو حدیث سے ثابت ہے حاسدوں' جلنے والوں اور کسی کو خوش نہ دیکھنے والوں کی نظر لگتی ہے دو چار مہینے کی تو بات ہے بغیر بتائے سب کو پتہ چل جائے گا۔''
☆......☆......☆
التمش ائیرپورٹ سے سیدھا سسرال آیا خوشی اس کے چہرے سے ہویدا تھی' بس نہیں تھا کہ ساس سسر کے سامنے ہی بریرہ کو گلے لگا لے جونہی دونوں کمرے میں آئے اس نے بریرہ کو گود میں اٹھالیا ''یار اتنی بڑی خوش خبری تم نے شیئر نہیں کی یہ تو مجھے آنٹی نے بتایا۔''
وہ خوش ہو کر بولا ''دراصل کمزوری کی وجہ سے میری فون کرنے کی بھی ہمت نہیں تھی۔'' وہ نقاہت زدہ لہجے میں بولی۔
''شکل سے بھی لگ رہا ہے لیکن یار ایک ماہ میں تمہارا وزن کافی بڑھ گیا ہے' باپ رے باپ لگتا ہے نو ماہ بعد تم کسی جن کا بچہ پیدا کرو گی۔'' وہ شوخی سے بولا۔
''خدا نہ کرے......'' بریرہ چیخی ''کیسی منحوس باتیں زبان سے نکل رہے ہو۔''
وہ بگڑ کر بولی تو التمش کو ہنسی آ گئی ''یار تمہارا میاں کیا کسی جن سے کم ہے۔''
☆......☆......☆
بریرہ التمش کے ساتھ ہی گھر واپس جانا چاہ رہی تھی مگر اس نے منع کر دیا۔

''دیکھو جب تک ماما نہیں آ جاتیں تم یہیں رہو میں صبح آفس چلا جاؤں گا تو تم گھر میں اکیلی ہوگی اور میرا کام میں دل نہیں لگے گا یہاں کم از کم آنٹی انکل تو ہیں نا۔''

''مگر آپ کو کھانے پینے کی تکلیف ہوگی آپ بھی یہیں رک جائیں۔''

''اجی بیگم صاحبہ! آپ میری فکر نہ کریں میں ہر فن مولا ہوں ناشتا کرنا مشکل نہیں دوپہر آفس میں لنچ اور رات ڈنر تمہارے ساتھ۔ کیسا؟'' اس نے پیار سے اس کے بال سنوارتے ہوئے کہا تو بریرہ کی روح اندر تک سرشار ہوگئی۔

''مگر ایک مسئلہ ہوگا۔'' وہ شوخی سے مسکرایا تو بریرہ نے سوالیہ نظریں اوپر اٹھائیں

تیری زلفوں کے بنا نیند نہیں آئے گی
دن گزر جائے گا مگر شب ہمیں تڑپائے گی

بہت خوب آپ تو شاعر ہوگئے! بریرہ کو ہنسی آ گئی تو التمش نے کالر جھاڑتے ہوئے اکڑ کر کہا ''جناب یہ میرا اپنا شعر ہے ابھی ابھی تازہ تازہ وارد ہوا ہے۔''

وہ اس کی زلفوں میں منہ چھپاتے ہوئے شرارت سے بولا پھر دونوں کے قہقہے سے گھر گونج اٹھا۔

بریرہ کا وزن بہت تیزی سے بڑھ رہا تھا اور کمزوری ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی حالانکہ حیرت انگیز طور پر اس کی خوراک بہت بڑھ گئی تھی دن بھر کھانے کے باوجود اس کو بھوک لگتی رہتی تھی۔ التمش روزانہ گیارہ بجے تک کھانا کھا کر گھر چلا جاتا تھا۔

اماں کے اصرار کے باوجود بریرہ ان ساتھ سلانے پر راضی نہیں تھی اور اکیلی ہی سوتی تھی ایک دن اماں رات پانی پینے اٹھیں تو انہیں بریرہ کے کمرے سے اس کے کراہنے کی آوازیں آئیں انہوں نے گھبرا کر دروازہ بجایا مگر دروازہ نہ کھلا تو انہوں نے چابی سے دروازہ کھلا تو ان کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

بریرہ نیم برہنہ حالت میں بے سدھ پڑی تھی انہوں نے پہلے اس کا لباس درست کیا پھر اسے گھبرا گھبرا کر آوازیں دینے لگیں ابا بھی شور سن کر کمرے میں آ گئے' بڑی مشکلوں سے بریرہ نے آنکھیں کھولیں اور نقاہت زدہ آواز میں پوچھنے لگی مجھے کیا ہوا ہے آپ دونوں میرے کمرے میں کیوں ہیں؟''

اماں نے ابا کو کمرے میں بھیجا اور بریرہ سے بولیں'' تم جس حالت میں مجھے ملی ہو اس نے میرے ہوش اڑا دیئے ہیں سچ بتاؤ کون آیا تھا تمہارے کمرے میں کس نے تمہاری یہ حالت کی ہے؟''

وہ درشتگی سے بولی۔'' کیا ہوا ہے اماں بند کمرے میں کون آئے گا میری حالت تو آپ دیکھ رہی ہیں مشکل سے اٹھی ہوں پتہ نہیں اماں مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے پورے جسم میں ایسا درد ہو رہا ہے جیسے رولے مجھے روندتے ہوئے گزر گیا ہو اماں یہ بچہ تو میری جان لے کر جائے گا میں بہت تکلیف میں ہوں۔'' وہ رونے لگی اور اماں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے دل انجانی سوچوں سے ہولنے لگا

''بیٹا التمش کو کچھ نہ بتانا ہم کل ہسپتال چلیں گے۔'' اماں میں آپ کو بتانا بھول گئی التمش تو آج صبح کی فلائٹ سے فرانس جا رہے ہیں تین ہفتے کے لیے۔

☆......☆......☆

اماں نے کائنات کو فون کر کے پہلے ہی ٹائم

لے لیا تھا اور اس لیے وہ ان کی منتظر تھی بریرہ کو دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔

''یہ اس کو کیا ہو گیا ہے اتنا زیادہ وزن کیسے بڑھ گیا؟ لگتا ہے انسان کا نہیں ہاتھی کا بچہ پیدا کر رہی ہے ویسے آج میں خود بریرہ کا الٹرا ساؤنڈ کروں گی۔''

کافی دیر بعد وہ روم سے باہر آئی تو اس کے منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں ''بیٹا سب کچھ ٹھیک ہے ناں؟'' اماں نے بیتابی سے پوچھا۔

بریرہ کو باہر بھیجنے کے بعد وہ ان سے مخاطب ہوئی ''آنٹی میری تو خود سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ کو کیا سمجھاؤں بریرہ کے شکم میں عجیب و غریب مخلوق پرورش پا رہی ہے جو انسان کی نہیں لگتی اور جس تیزی سے اس کا حجم بڑھ رہا ہے اس کو پیدا کرنا کم از کم بریرہ کے لیے ناممکن ہے اس کا زندہ بچ جانا مشکل ہوگا۔''

اماں نے بیساختہ منہ پر ہاتھ رکھ لیا'' بیٹا کائنات یہ سب کیا ہے میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا.....''

''آنٹی آپ پریشان نہ ہوں اگر کوئی خاص بات ہوئی ہے تو بتائیں۔'' پھر اماں نے اسے گزشتہ رات کا واقعہ سنایا کہ انہوں نے بریرہ کو برہنہ حالت میں دیکھا تھا اور کہا بیٹا خدا کے لیے یہ بات تم کسی کو مت بتانا ورنہ میری بیٹی بدنام ہو جائے گی۔ وہ اس کے آگے ہاتھ جوڑنے لگیں۔

''آنٹی کیا ہو گیا ہے آپ کو یہ بات کسی کو بتانے والی ہے بھی نہیں کیونکہ مجھے یہ کوئی اور چکر لگ رہا ہے۔'' وہ سوچتے ہوئے بولی'' آپ کسی پہنچے ہوئے بزرگ کو ڈھونڈیں وہی اس سلسلے میں کچھ کر سکتے ہیں۔''

''بیٹی تم حافظ قرآن ہو کچھ تم ہی کر سکتی ہو میری اکلوتی بیٹی ہے میں کیا کروں؟'' وہ رونے لگیں۔

''آنٹی حافظ قرآن ہوں مگر عالم یا روحانی علوم کی ماہر نہیں ہوں. ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے۔''

''بیٹا آج کل تو جعلی لالچی اور دکھاوے کے بزرگ پائے جاتے ہیں جنہوں نے اس نیک کام کو بھی تجارت بنا لیا ہے میں کہاں ڈھونڈوں'' روتے روتے ان کی ہچکیاں بندھ گئیں اور کائنات کو انہیں چپ کرانا مشکل ہو گیا'' آپ ایک چھوٹے سائز کا قرآن شریف بریرہ کے گلے میں پہنا دیں چاروں قل اور آیت الکرسی کا ہر وقت حصار کریں پھر دیکھیں اللہ کیا کرتا ہے۔''

☆......☆......☆

اماں کے دل میں تو جیسے پنکھے لگ گئے تھے۔ ابا نے سنا تو وہ بھی سناٹے میں آ گئے۔

''میں کیا کروں بریرہ کے ابا کوئی جناتی مخلوق میری بیٹی کو برباد کرتی رہی اور میں کچھ نہ کر سکی اس کے شوہر کو بھی نہیں بتا سکتی میری زندگی میری بیٹی .....موت کے دہانے پر کھڑی ہے۔''

''ہمت سے کام لو اور مجھے سوچنے دو خود کو سنبھالو ورنہ بریرہ کو پتہ چل گیا تو کیا ہوگا سوچو!''

ابا فوراً ہی کہیں چلے گئے اماں نے جھانکا بریرہ بے خبر سو رہی تھی انہوں نے حصار کیا اور کچن میں آ گئیں بھوک تو مر چکی تھی مگر پیٹ کا دوزخ تو بھرنا ہی تھا ابا کا کہیں پتہ نہ تھا پھر اچانک وہ آ گئے۔

''آپ کہاں چلے گئے تھے میں پریشان ہو رہی تھی۔'' اماں نے بیتابی سے پوچھا۔

''ضروری کام سے گیا تھا۔'' انہوں نے

آنکھوں سے بریرہ کی موجودگی کی طرف اشارہ کیا پھر اس سے مخاطب ہو کر بولے ''بیٹا جی تیار ہو جاؤ ہمیں کہیں جانا ہے۔''

''مگر کیوں ابا اور کہاں؟'' بریرہ نے گھرا کر پوچھا ''بھئی تمہاری حالت کے پیش نظر ایک بزرگ کے پاس تمہیں دم کرانے لے جا رہا ہوں۔'' وہ اطمینان سے بولے۔

''میں کہیں نہیں جا رہی...... میں بالکل ٹھیک ہوں آپ بلاوجہ میرے پیچھے نہ پڑیں۔'' وہ بگڑ کر بولی۔

دونوں حیران ہو کر اس کی شکل دیکھنے لگے

''بیٹا اتنی تلخ تو تم کبھی نہ تھیں کیا باپ کی اتنی سی بات بھی نہیں مانو گی؟'' ابا نے پیار سے کہا تو وہ کینہ توز نظروں سے گھورتی ہوئی بولی ''چلی تو جاؤں گی مگر نہ گاڑی سے اتروں گی نہ دم کراؤں گی سب بکواس ڈھکوسلہ ہے۔'' اس نے نفرت سے منہ بنایا پھر بڑی مشکلوں سے ڈھیروں خوشامد کے بعد جانے پر تیار ہوئی مغرب کی نماز پڑھ کر وہ لوگ روانہ ہوئے شہر ختم ہو گیا تھا اور ویران سی جگہ نظر آنے لگی تھی پھر دور سے ایک ٹمٹماتا ہوا دیا جیسا نظر آیا' گاڑی قریب لے گئے تو کسی کی جھونپڑی تھی۔ ابا نے گاڑی سائڈ میں روکی اور ان دونوں کو گاڑی میں رکنے کا اشارہ کر کے جھونپڑی میں داخل ہو گئے۔ ایک نورانی چہرے والے بزرگ ان کو دیکھ کر مسکرائے اور بولے ''تم نے دیر تو کر دی ہے مگر ابھی اتنی بھی دیر نہیں ہوئی......'' پھر ابا نے انہیں کھل کر سب کچھ بتایا تو وہ آنکھیں بند کر کے مراقبے میں چلے گئے۔ ابا نے دیکھا صاف ستھری جھونپڑی میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ ایک طرف چولہا دھرا تھا چند برتن ایک لوٹا اور بالٹی ساتھ ہی صاف ستھرا بستر۔

عجیب طرح کے سکون اور اطمینان کا احساس یہاں آتے ہی ابا کو ہوا تھا انہیں لگا کہ وہ ہر بوجھ سے آزاد ہو گئے ہیں اس ویرانی میں بھی رونق تھی دل کا سکون تھا' اطمینان تھا۔ کافی دیر بعد انہوں نے آنکھیں کھولیں ''آپ کے گھر میں کوئی درخت ہے۔'' انہوں نے سوال کیا۔

''جی جامن کا بہت بڑا درخت ہے۔''

''وہی سارے فساد کی جڑ ہے یہ جو تعویذ میں آپ کو دے رہا ہوں انہیں آج رات ہی اس درخت کے چاروں طرف گاڑھ دیں اور صبح مزدوروں کو بلوا کر اسے کٹوا دیں مشکل تو ہو گی لیکن ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے پھر جڑوں کے ساتھ جو کھڈا بنے اس میں سوکھی لکڑیاں اور گھاس پھونس ڈال کر آگ لگا دیں اور یہ آگ بجھنی نہیں چاہیے جب تک کہ پورا جل نہ جائے۔ آج رات آپ دونوں میاں بیوی کو بیٹی کے کمرے میں جاگنا ہے ایک منٹ بھی سونا نہیں ہے اور بیٹی کے سونے کے بعد دھیمی آواز میں سورۂ بقرہ جو قرآن شریف کی پہلی سورۃ ہے لگا دینا ہے اور صبح ہونے تک بار بار لگانا ہے پھر فجر کی نماز پڑھ کر بے شک آپ سو جائیں۔ کل سارے کام کرنے کے بعد آپ اکیلے میرے پاس آنا پھر بتاؤں گا کہ آگے کیا کرنا ہے۔''

''ویسے آپ کی بیٹی کے بال کیسے ہیں؟'' بزرگ نے سوال کیا ''بہت لمبے اور گھنے اپنی ماں کی طرح۔'' ابا جلدی سے بولے۔

''بس سب اسی کا شاخسانہ ہے ہر روز جنوں کے یہاں لاکھوں بچے پیدا ہوتے ہیں جنگل بھی اب شہر بن گئے ہیں اور ہر گھر میں یہ مخلوق ہے مگر ہر کسی کو ستاتی نہیں' بالوں پر سب سے پہلے جن عاشق ہوتے ہیں لیکن خیر اللہ بہتر کرنے والا

ہے اب آپ جائیں۔“ انہوں نے آنکھیں بند کرلیں گویا واپسی کا اشارہ مل گیا۔

انہوں نے گھر پہنچ کر سب سے پہلے جامن کے درخت میں تعویذ دبانے کی کوشش کی اور ان کی ساری توانائیاں جواب دے گئیں تب انہوں نے چاروں قل اور آیت الکرسی با آواز بلند پڑھنی شروع کی تو آسانی سے کام ہوگیا۔ غالباً بریرہ کو اس کی ماں نے بزرگ کی ہدایت کے مطابق سب کچھ بتادیا تھا اس لیے اس کے مسلسل رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔

☆......☆......☆

پھر بریرہ کو نیند کی دوا دے کر سلانے کے بعد دونوں سورہ بقرہ لگا کر کمرے میں ہی بیٹھ گئے اور دعائیں مانگتے رہے ساری رات جاگنا مشکل تھا مگر اولاد کی محبت مشکل کو آسان کردیتی ہے صبح ہوتے ہی ابا نے مزدوروں کو بلا کر جامن کے درخت کو جڑ سے نکلوانا شروع کیا تو مزدوروں کو دانتوں پسینہ آگیا۔ شام کو بھرپور ملبہ والا ٹرک بھروا کر چلوایا گیا تب ابا نے بریرہ اور اماں کے سامنے گڑھے میں بہت ساری لکڑیاں ڈال کر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگادی اور پھر ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں شعلوں کے ساتھ عجیب وغریب آوازیں بلند ہورہی تھیں جیسے بہت سی بدروحیں مل کر آہ وفغاں کررہی ہوں۔ عجیب کراہیت آمیز بو پورے گھر میں بس گئی تھی‘ ہر طرف گوشت جلنے کی بو اور چراند پھیلی ہوئی تھی یوں لگتا تھا جیسے کوئی ان دیکھی مخلوق باہر نکلنے کی کوشش کررہی ہو‘ بریرہ اور اماں ایک دوسرے سے لپٹی تھر تھر کانپ رہی تھیں ابا نے دونوں کو اپنی بانہوں کے حصار میں لے کر قرآنی آیات کا دم کیا تو ان کو سکون ملا‘ دو گھنٹے میں آگ سرد ہوئی تب وہ اندر آگئے۔ اسی وقت ابا بزرگ کی جھونپڑی میں پہنچ گئے اور انہیں پورا حال سنایا وہ زیرلب مسکرائے اور پھر بولے۔

”بلا تو ٹل گئی اب اس بلا کو نکالنا ہے جو بیٹی کے پیٹ میں پرورش پارہی ہے۔ یہ چار تعویذ دے رہا ہوں پانی میں گھول کر پلادیں پھر بچی سے کہیں نہ ڈرے نہ خوفزدہ ہو جب بھی پیٹ میں درد ہو باتھ روم جائے لیکن آنکھیں بند رکھے اور منہ پر کپڑا ورنہ سانس لینا مشکل ہوجائے گا ہوسکے تو بچی کی اماں کو بھی ساتھ کھڑا کردیں مگر وہ بھی کچھ نہ دیکھیں اور منہ ڈھانپ کر رکھیں جب سب کچھ نارمل ہوجائے تو شوہر کو اطلاع دیں کہ بچہ ضائع ہوگیا ہے پھر اسکے بعد بچی کو میرے پاس لائیے گا۔“

☆......☆......☆

چار دن بریرہ مسلسل تعویذ پیتی رہی اور پانچویں دن اس کو بری طرح موشن لگ گئے جن میں شدید بو تھی۔ کئی کئی مرتبہ فلیش کرنا پڑرہا تھا اور ہر تھوڑی دیر بعد بریرہ کو باتھ روم جانا پڑرہا تھا ایک وہی دن میں بریرہ کی حالت پتلی ہوگئی۔ دو دن تک موشن کے بعد حیرت انگیز طور پر بریرہ پرانی حالت میں لوٹ آئی تو دونوں میاں بیوی اس کو بزرگ کی جھونپڑی میں لے گئے ان کی ہدایت کے مطابق دونوں خواتین نے شرعی پردہ کیا ہوا تھا وہ سر جھکائے کچھ پڑھ کر بریرہ پر دم کرتے رہے آدھے گھنٹے بعد وہ بریرہ سے مخاطب ہوئے ”دیکھو بیٹا اس بات کو تم ایک حادثہ سمجھ کر بھول جانا اور کبھی کسی سے ذکر مت کرنا حتیٰ کہ اپنے شوہر سے بھی نہیں کوئی مرد اتنا اعلیٰ ظرف نہیں ہوتا تم خوامخواہ قصوروار ٹھہرائی جاؤ گی۔ نماز کی پابندی کرنا اور گھر سے باہر جاتے وقت کبھی بال نہ

کھولنا خاص طور پر مغرب کے وقت“

جب التمش کو بریرہ نے بچہ ضائع ہونے کی اطلاع فون پر دی تو وہ ناراض ہونے لگا۔

”پہلے سے بتانا تھا تم نے کیا لاپروائی کی جو یہ حادثہ ہوگیا“ وہ شدید صدمے میں تھا۔

”کوئی لاپروائی نہیں ہوئی اللہ کی مرضی یہی تھی رات کو سوتے میں اچانک طبیعت خراب ہوگئی فوراً ابا اماں ہاسپٹل لے کے بھاگے لیکن سب کچھ ختم ہوگیا آپ اتنی دور بیٹھ کر کیا کرلیتے شکر کریں میں زندہ ہوں۔“ بریرہ کی آواز بھرا گئی اور التمش اسے تسلیاں دینے لگا۔

☆......☆......☆

بریرہ بالکل ٹھیک ہوگئی تھی مگر اب وہ میکے ایک دن کے لیے بھی آنے کو تیار نہ تھی باپ کے گھر جانے کے تصور سے ہی اسے گھبراہٹ ہونے لگتی تھی ساس اور شوہر دونوں اس کے اس رویے سے پریشان تھے مگر اماں اس کی کیفیت کو سمجھتے تھے اس لیے انہوں نے اپنا پرانا گھر بیچا اور ایک اپارٹمنٹ میں شفٹ ہوگئے۔ ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ بریرہ اب التمش کی قربت سے گھبرانے لگی تھی وہ جب بھی قریب آنے کی کوشش کرتا تھر تھر کانپنے لگتی اور وہ رک جاتا مگر کب تک جب اس نے زبردستی اپنا حق جتایا اور بریرہ اس سے ناراض ہوگئی پھر التمش کو خوشامد کرنی پڑی مگر وہ پریشان ضرور ہوگیا تھا کہ بریرہ کو ہوا کیا ہے اور جب بریرہ کو پتہ چلا کہ وہ پھر امید سے ہے تو اس نے رو رو کر زمین آسمان ایک کرلیا جیسے اس سے کوئی گناہ سرزد ہوگیا ہو۔ اماں کو پتہ چلا تو زبردستی بریرہ کو کائنات کے پاس لے گئیں لیکن اس کی ایک ہی ضد تھی کہ مجھے بچہ پیدا نہیں کرنا ابارشن کرانا ہے۔“ کائنات کے لاکھ سمجھانے پر بھی اس کے دل سے خوف نہیں نکل رہا تھا الٹراساؤنڈ رپورٹ بھی نارمل تھی...... مگر نو مہینے اس نے جس کرب میں گزارے اس کا دل جانتا تھا جوں جوں ڈلیوری کا وقت قریب آرہا تھا اس کی حالت غیر ہوتی جارہی تھی اس کی حالت دیکھتے ہوئے اماں اسے اپنے گھر لے آئی تھیں کہ وہ انجانے میں سب کچھ نہ بتا دے مگر اس کی ایک ہی رٹ تھی ”اماں مجھے بچہ نہیں چاہیے مجھے ایسا کچھ کھلا دو کہ یہ پیٹ میں ہی مر جائے...... اماں میں مر جاؤں گی، زندہ نہیں بچوں گی۔“ اس نے رو رو کر برا حال کرلیا تھا۔

☆......☆......☆

اور پھر وہ دن بھی آگیا جب بریرہ کو ہاسپٹل لے جایا گیا، نرسیں حیران تھیں کہ تکلیف کے باوجود بیڈ سے اترنے اور بھاگنے کی کوشش کر رہی تھی کائنات کو دیکھتے ہی وہ پھٹ پڑی ”ڈاکٹر مجھے بچالو...... میں مرنا نہیں چاہتی“ بڑی مشکلوں سے نرسوں نے اسے قابو کیا مگر ڈلیوری کے بعد بھی اس نے بچہ کو دیکھنے سے انکار کیا۔ کائنات کے ڈانٹنے پر اس نے آنکھیں کھولیں تو ایک گل گوتھنا سا نو پونڈ کا خوبصورت بچہ ٹھہر ٹھہر کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسکی آنکھوں میں آنسو آگئے...... ممتا کے سوتے ابل پڑے اور وہ اسے سینے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پھر اللہ نے ایک بیٹے اور بیٹی کے بعد دو جڑواں بیٹے دیے تو وہ اللہ کا شکر ادا کرتے نہ تھکتی تھی۔ اب بریرہ کو کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی اسکو کافی سبق مل چکا تھا اب ایک لمبی موٹی چٹیا اس کی کمر پر جھولتی رہتی لیکن سوتے وقت آج بھی التمش اس کی زلفوں کو اوڑھ کر سوتا ہے۔

☆☆......☆☆

آپ کی ڈائری

یہ ہے آپ کی پسند' آپ کا انتخاب

قارئین

دوسرے معبود

اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

کیا انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسرے معبود اختیار کر رکھے ہیں؟ کہہ دیجیے کہ تم اپنی دلیل تو پیش کرو' یہ کتاب بھی موجود ہے جس میں میرے دور کے لوگوں کے لیے نصیحت ہے اور وہ کتابیں بھی موجود ہیں جن میں مجھ سے پہلے لوگوں کے لیے نصیحت تھی مگر ان میں سے اکثر لوگ حقیقت سے بے خبر ہیں اس لیے اس سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ (سورۃ الانبیاء (۲۱)......ترجمہ آیت (۲۴)

پسندیدہ ادا

حضرت ابنِ عباسؓ راوی ہیں کہ ایک دفعہ حضرت علیؓ نے ساری رات ایک باغ سینچا اور اجرت میں تھوڑے سے جو حاصل کیے۔ حضرت فاطمہؓ نے ان کا ایک حصہ لے کر آٹا پیسا اور کھانا تیار کیا۔ عین کھانے کے وقت ایک مسکین نے دروازہ کھٹکھٹایا اور کہا۔ ''میں بھوکا ہوں۔''

حضرت فاطمہؓ نے وہ سارا کھانا اسے دے دیا پھر باقی اناج کا کچھ حصہ لے کر پیسا اور کھانا پکایا۔ ابھی کھانا پک کر تیار ہی ہوا تھا کہ ایک یتیم نے دروازے پر آ کر دستِ سوال دراز کیا۔ وہ سارا کھانا اسے دے دیا گیا۔ خاتونِ جنت نے پھر باقی اناج پیسا اور کھانا تیار کیا۔ اتنے میں ایک مشرک قیدی نے اللہ کی راہ میں کھانا مانگا' تیار شدہ کھانا اس کو دے دیا گیا۔ غرض سب اہلِ خانہ نے اس دن فاقہ کیا۔ ان کی یہ ادا اللہ کو ایسی پسند آئی کہ اس گھر کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔

ترجمہ۔ ''اور وہ اللہ کی راہ میں مسکین' یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔'' (الدھر)

تذکارِ صحابیاتؓ از طالب ہاشمی

مرسلہ۔ فرحان' جنید' کراچی۔

ایک پرانے دوست کے نام

دیکھو ذرا......

رت بدلی جاتی ہے

آج یہ بڑے لوگوں کا

ہم جیسے خاک نشین کو پیغام کیسے آ گیا؟

یہ تو بڑے لوگ ہیں صاحب......

اگر پھر کبھی ناراض ہو گئے یا ان کا مزاج برہم ہوا تو......

پھر ہم جیسے خطا کاروں پر اپنا غصہ جھاڑیں گے۔ بڑے لوگوں کا یہ ہی تو مسئلہ ہوتا ہے صاحب...... اگر اپنا موڈ خوش گوار ہو تو...... فقیروں سے گپ شپ

کر کے اپنا وقت انجوائے کرتے ہیں۔ اور اگر اپنا مزاج برہم ہو تو ...... اس موقع پر اگر فقیر کوئی بات کرے تو ...... ان کو وہ بات بری لگتی ہے ...... اور وہ فقیر کو جھاڑ دیتے ہیں۔

تو اے فقیر......

تو محتاط رہے...... ہمیشہ یاد رکھ کہ بڑے لوگوں سے بات کرنے یا نا کرنے کا ہمیشہ ایک وقت ہوتا ہے۔

تو اے فقیر......تو یاد رکھ......

کہ اب وہ ماضی نہیں ہے۔ نا ہی وہ گزری ہوئی سردیوں کی شامیں ہیں۔ جب آج کے دولت مند ......کل کے دوست ہوا کرتے تھے۔ اور...... برابری کی بنیاد پر ایک ساتھ گھوما کرتے تھے۔ باغوں سے کچے پکے امرود اور کینو توڑا کرتے تھے ان کو نمک مرچ لگا کر مزے سے کھایا کرتے تھے۔

تو اے فقیر......

تو اب سنبھل جا کہ نا اب وہ ماضی ہے نا وہ باتیں، تو اب اِن سے ادب سے بات کیا کر، کہ دولت والے گہرے بادل کی طرح ہوتے ہیں کہ کسی زمین پر اپنی مہربانی کی خوب بارش برسائی اور کسی زمین کو اپنی بجلیاں گرا کر جلا ڈالا، خاک کر ڈالا، کہ اس وقت مزاج یار برہم تھا۔ تو اے فقیر تو سنبھل جا احتیاط کر کہ نا اب وہ پرانا وقت ہے اور نا وہ باتیں......

............*

رانا صاحب جب اپنی خوش خوراکی کے ہاتھوں موٹاپے کا شکار ہو گئے اور ایک دن وہ ڈاکٹر صاحب کے پاس موٹاپا ختم کرنے کے طریقے معلوم کرنے گئے۔

تو ڈاکٹر صاحب نے رانا مسعود مقبول صاحب کو کہا لانا صاحب آپ یہ دوائی بھی کھائیں اور ایک ماہ صبح صبح ایک کلومیٹر لازمی سیر بھی کریں ایک ماہ بعد بتائیں کہ کتنا وزن کم ہوا ہے رانا مسعود مقبول صاحب جب ایک ماہ بعد ڈاکٹر کے پاس گئے تو ان کا وزن دو کلو زیادہ تھا۔ جس پر ڈاکٹر نے پوچھا۔

''آپ نے دوائی کھائی۔'' تو رانا صاحب بولے۔

''جی ہاں باقاعدگی سے دوائی بی کھائی اور ایک کلومیٹر سیر بھی کی......مگر پتا نہیں وزن کیوں کم نہیں ہوا۔ ویسے ڈاکٹر صاحب صبح صبح واقعی کار پر ایک کلومیٹر سیر کرنے کا مزہ آجاتا ہے۔''

غلام مرتضیٰ علوی۔ گوجرہ

سنہرے اقوال

دوسروں کی غیر موجودگی میں ان کے معلق اچھے الفاظ استعمال کرو تمہاری غیر موجودگی میں وہ تمہارا تذکرہ اچھے لفظوں میں کریں۔

اُجلے اور صاف کپڑے پہننے سے رنج و غم دور ہوجاتے ہیں اور نماز بھی قبول ہوتی ہے۔

جسے قرض لینے اور خوشامد کرنے کی ضرورت نہیں وہ سب سے بڑا مالدار ہے۔

پڑھنے سے انسان بیدار ہوتا ہے بولنے کی تمیز آجاتی ہے لکھنے سے ذہین ہو کر معاشرے کے لیے بہتر انسان بنتا ہے۔

موت کو یاد رکھنا نفس کی تمام برائیوں کی دعا ہے۔

مومن بات کم کرتا ہے عمل زیادہ منافق عمل میں زیادہ گزرتا ہے اور نیکی کی تشہیر زیادہ کرتا ہے۔

کردار ایک ہیرا ہے جو پتھر کو بھی کاٹ سکتا ہے۔

شعر

چپ چاپ ہے آج کل کیا ہوا تمہیں وصی
ہماری کوئی بات دل پہ لگی یا دل ہی کسی اور سے لگا بیٹھے ہو

خضر حیات۔ روڈہ تھل

اصلاح

زندگی نے بہت کچھ سکھایا کتابوں نے بھی رہنمائی کی لیکن انسانی رویوں نے جو سبق دیا نہ تو وہ زندگی کے کسی ورق اور نہ ہی کتابوں کے کسی صفحہ پر تحریر ہے۔

اچھی باتیں

بیٹھ جاتا ہوں مٹی پر اکثر کیونکہ مجھے اپنی اوقات اچھی لگتی ہے۔ میں نے سمندر سے دیکھا ہے جینے کا طریقہ چپ چاپ سے بہنا اور اپنی موج میں رہنا' ایسا نہیں ہے کہ مجھ میں کوئی عیب نہیں ہے پر سچ کہتا ہوں کہ مجھ میں کوئی فریب نہیں ہے اور جل جاتے ہیں میرے انداز سے اکثر میرے دشمن کیونکہ ایک زمانے سے میں نے نہ محبت بدلی ہے اور نہ ہی دوست بدلے ہیں۔ ایک گھڑی خرید کر کیا باندھ لی ہاتھ پر یہ وقت کم بخت تو پیچھے ہی پڑ گیا میرے' سوچا تھا گھر بنا کر سکون سے بیٹھوں گا پر جیون کی بھاگ دوڑ نے مجھے مسافر ہی بنا ڈالا۔ سکون کی بات مت کر اے غالب وہ بچپن والا اتوار اب نہیں آتا۔ شوق تو ماں باپ کے پیسوں سے پورے ہوتے ہیں اپنے پیسوں سے تو بس ضرورتیں ہی پوری ہوتی ہیں۔ ایک سویرا تھا جب ہنس کر اٹھا کرتے تھے ہم اور آج کئی بار بنا مسکرائے ہی شام ہو جاتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہم مسکراتے بہت ہیں اور ہم تھک گئے درد چھپاتے چھپاتے' مہنگی سے مہنگی گھڑی پہن کر دیکھ لی پر پھر بھی یہ وقت میرے حساب سے نہ چلا' اگر خدا نہیں ہے تو اس کا ذکر کیوں ہے اگر خدا ہے تو فکر کیوں ہے۔ کسی کی غلطیوں کا حساب نہ کر خدا بیٹھا ہے حساب نہ کر خدا بیٹھا ہے حساب نہ کر......

چوہدری یاسر وکی۔ دیپالپور

زلزلہ ختم ہو گیا

ایک مرتبہ حضرت سیدنا عمر فاروقؓ کے دورِ خلافت میں مدینہ منورہ میں شدید زلزلہ آ گیا' آپؓ نے زمین پر اپنا درہ مارتے ہوئے با آواز بلند فرمایا۔

"اے زمین ساکن ہو جا کیا میں تیرے اوپر عدل سے کام نہیں لیتا؟" حضرت عمر فاروقؓ کا یہ فرمانا تھا کہ زمین ساکن ہو گئی اور زلزلہ ختم ہو گیا۔

آرزو

کچھ آرزو ایسی ہوتی ہیں جو خود تو پوری نہیں ہوتیں مگر انسان کی زندگی کو حسرت میں تبدیل کر کے گہرا زخم بنا دیتی ہیں انسان کی زندگی کے کچھ لمحات صرف خوشیوں کی تکمیل کے باعث آتے ہیں نادان لوگ وہ ہیں جو کسی مسکراہٹ کو سمیٹنے کے لیے زندگی کے خوبصورت لمحات ضائع کر دیتے ہیں مگر وہ لوگ نہیں جانتے کہ آرزو ہمیشہ ہی رہتی ہے۔

اچھی بات

جو اپنی خواہشات کا اسیر نہیں بنتا وہ عزت نفس رکھتا ہے اور وہ جو کسی چیز کو نہیں مانگتا اور اس کے لیے دعا نہیں کرتا وہ ہمیشہ مایوس یا بدنصیب نہیں رہتا اس دنیا میں کوئی بھی چیز عزت نفس سے زیادہ قیمتی نہیں ہے غربت مانگنے والی بھیک کی بے عزتی سے زیادہ بہتر ہے نیز محنت اور باوقار طریقے سے کمائی دولت ناجائز طریقے (رشوت) سے حاصل ہونے والی دولت سے ہزار گنا بہتر ہے۔

عامر شہزاد۔ ننکانہ صاحبہ

تبدیلی

1) ڈاکٹرز' ایم این ایز' ایس ایچ اوز اور اعلیٰ شخصیات کے ملنے میں آسانی ہوگی۔

2) ٹریفک کے قوانین کی پابندی ہوگی' بھیڑ ہرگز نہیں ہوگی ہر شخص قطار میں ہوگا۔

3) مسافروں کو بسوں اور ٹرینوں میں سفر انتہائی آسان اور پُرسکون ہوگا۔

4) ریل گاڑیوں میں فرسٹ کلاس اور آرام دہ سیٹیں ہوں گی۔
5) کوئی شخص دوسرے کا مذاق قطعی نہیں اڑائے گا۔
6) کوئی کسی پر غلط الزام یا تو ہمت نہیں لگائے گا۔
7) کسی کا جرم دوسرے کے سر نہیں تھوپا جائے گا۔
8) ٹیلی فون زیادہ دیر ہولڈ نہیں رکھنا پڑے گا اور بات کلیئر ہوگی۔
9) لاکر اور بینک میں کبھی ڈکیتی کی واردات نہیں ہوگی۔
10) بھائی' بھائی ایک دوسرے سے خلوص و محبت اور پیار کا مظاہرہ کریں گے۔
11) کرپشن' مہنگائی اور بے روزگاری کا خاتمہ یقینی بنایا جائے گا۔
12) ہر غریب' امیر کی عزت چار دیواری میں محفوظ ہوگی۔
13) اجڈ اور اَن پڑھ لوگ اعلیٰ عہدوں پر فائز نہیں ہوں گے۔
14) تمام پڑوسی ملک پاکستان پر بھروسہ اور اعتماد کریں گے۔
مگر عزیز ساتھیو! اس کے لیے ہمیں ذرا سا خود کو بھی بدلنا ہوگا' تبدیلی تبھی ممکن ہوگی۔

ایم حسن نظامی۔ قبولہ شریف

کھٹا میٹھا

سردیوں میں دن چھوٹے خاندان بڑے ہو جاتے ہیں۔
وضو سے شکل' قرآن سے عقل اور اللہ اللہ کرنے سے نسل پاک ہوتی ہے۔
تیرے اتارے ہوئے دن پہن کر اب بھی میں تیری مہک میں کئی روز کاٹ دیتا ہوں۔
تین خوبیاں انسان کو باکمال بنا دیتی ہیں ٹھنڈا دماغ' میٹھی زبان اور نرم دل۔

غرور ایک بیماری ہے جو کسی بھی کم ظرف کو لگ سکتی ہے۔
بیوی اگر بولتی نہ ہو غالب' بیوی ہزار نعمت ہے۔
اگر کوئی آپ کو دیکھ کر دروازہ بند کر لیتا ہے تو یاد رکھیں کنڈی دونوں طرف ہوتی ہے آپ بھی باہر سے کنڈی لگا کر بھاگ جائیں۔

پرنس افضل شاہین۔ بہاولنگر

ہمیشہ ساتھ رکھیں

خوشیاں لانے والی سات چیزیں۔
- قرآن پاک کی تلاوت۔
- نماز کی پابندی۔
- اللہ کا شکر ادا کرنا۔
- مجبوروں کی مدد۔
- گناہوں سے سچی توبہ۔
- عزیزوں سے اچھا سلوک۔
- صبح کے وقت سورۂ یٰس اور رات کو سورۂ واقعہ کی تلاوت۔
- اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''تم مجھے اپنے نرم بستروں سے اٹھ کر یاد رکھنا، میں تمہیں تمہاری تنگ قبروں میں یاد رکھوں گی۔''

مرسلہ: صبا مہک۔ کراچی

نالائق

انڈیا کے صوبے یوپی کے ضلع بجنور کی تحصیل نگینہ کے ریلوے روڈ پر واقع مصطفیٰ میونسپل کالج کے پرنسپل سید زاہد حسین نقوی نے کالج کا دورہ کرتے ہوئے کلاس سوئم کے طالب علم سید واجد حسین نقوی سے دریافت کیا: ''بتاؤ 1876ء میں کیا ہوا تھا؟''
سوئم کلاس کا طالب علم واجد: ''معلوم نہیں سر۔''
پرنسپل سید زاہد حسین نقوی: نالائق قائداعظم محمد علی جناح بانی اسلامی جمہوریہ پاکستان پیدا ہوئے

تھے۔" پوچھا: "بتاؤ 1880ء میں کیا ہوا تھا؟"
شاگرد سید واجد حسین نقوی: "قائداعظم محمد علی جناح چار سال کی عمر کے ہو گئے تھے۔"

مرسلہ: اشعر ظفر۔ کراچی

قلقل کی آوازیں

مشہور دانش مند البرٹ آئن اسٹائن کا کہنا تھا کہ میں نے ہمیشہ مدلل اور منطقی جواب بچوں سے سنے ہیں۔ ایک روز میں نے ایک پانچ سالہ بچے سے پوچھا کہ جب پانی اُبلتا ہے تو اس میں سے قلقل کی آوازیں کیوں آتی ہے؟

بچہ کچھ دیر سوچتا رہا، پھر بولا۔

"یہ ان جراثیموں کی چیخیں ہوتی ہیں جو پانی اُبلنے سے جل مرتے ہیں۔"

مرسلہ: شائلہ نوید۔ کراچی

مونالیزا

دنیا کی سب سے مشہور اور سب سے سادہ تصویر ایک عورت کی ہے جو نہ کوئی ملکہ تھی نہ شہزادی نہ کسی صدر یا کسی وزیراعظم کی ماں، بہن، بیٹی، بیوی نہ کوئی دولت مند عورت تھی، بس وہ ایک معمولی سی دیہاتن تھی۔ اس تصویر کا تخلیق کار عظیم اطالوی مصور لیونارڈو دا ونچی تھا اور اس عورت کا نام تھا مونا لیزا...... یہ تصویر کئی بار چرائی گئی اور کئی بار اس کی نقل بھی ہوئی۔ آج لیونارڈو دا ونچی کے ہاتھ کی بنائی یہ تصویر لوور میوزیم کے برآمدے میں ایک دیوار پر آویزاں ہے۔ مونالیزا کی مسکراہٹ یورپ بھر کو مسحور کرتی ہوئی ہمارے ایشیائی کلچر میں بھی در آئی ہے۔ اس مرقع میں سب سے اہم نکتہ مونالیزا کی دبی دبی معصومانہ، مادرانہ، خواہرانہ اور محبوبانہ مسکراہٹ ہے۔ یہ مسکراہٹ شیکسپیئر کے کرداروں یا غالب کے بہت سے اشعار کی طرح ہے جن کے ہزاروں مفہوم ہیں جن میں ہزاروں عالم چھپے ہیں۔

جمیل الدین عالی کی تصنیف "دنیا مرے آگے" سے انتخاب

حسنِ انتخاب۔ خضر فرحان، کراچی۔

مٹی کا دِیا

اباجی مجھے مارتے تھے تو امی بچا لیتی تھیں۔ ایک دن میں نے سوچا کہ اگر امی پٹائی کریں گی تو اباجی کیا کریں گے؟ یہ دیکھنے کے لیے میں نے امی کا کہنا نہ مانا۔ انہوں نے کہا۔ "بازار سے دہی لا دو۔" میں نہ لایا۔ انہوں نے سالن کم دیا۔ میں نے زیادہ پر اصرار کیا۔ انہوں نے کہا۔ "پیڑھی کے اوپر بیٹھ کر روٹی کھاؤ۔" میں زمین پر دری بچھا کر بیٹھ گیا۔ کپڑے میلے لیے، مجھے پوری توقع تھی کہ امی ضرور ماریں گی مگر انہوں نے مجھے سینے سے لگا کر کہا۔ "کیوں پتر! ماں صدقے، تو بیمار تو نہیں؟" اس وقت میرے آنسو تھے کہ تھمتے ہی نہیں تھے۔

میرزا ادیب کی کتاب "مٹی کا دِیا" سے انتخاب

حسنِ انتخاب۔ حسن، حمزہ، کراچی۔

فیصلہ

مقدمے کی سماعت کے سارے عرصے میں جج صاحب اپنے ذہن پر زور دیتے رہے کہ انہوں نے ملزم کو پہلے کہاں دیکھا تھا؟ جب سماعت مکمل ہوگئی اور صرف فیصلہ سنانا باقی رہ گیا تو وہ اپنے تجسس پر قابو نہ پا سکے اور آخر ملزم سے پوچھ ہی بیٹھے کہ انہوں نے ملزم کو پہلے کہاں دیکھا تھا؟

ملزم نے کہا۔ "جناب، میں آپ کی بیگم صاحبہ کو موسیقی کا سبق دیا کرتا تھا۔"

"چودہ سال قید با مشقت ......" جج صاحب نے فوراً فیصلہ سنا دیا۔

مرسلہ۔ محمد حنیف، اسلام آباد۔

☆☆......☆☆

سوال نامہ برائے رائٹر/ ریڈرز

☆......آج کل زندگی کیا کہہ رہی ہے؟

☆......ماضی کے جھروکوں کو وا کرنے پر کیسا محسوس کرتی ہیں/ کرتے ہیں؟

☆......لکھنے کا آغاز کب کیا اور کیا مطمئن ہیں آج کل جو چھپ رہا ہے اُس سے؟

☆......تبدیلی پر یقین رکھتی ہیں/ رکھتے ہیں؟

☆......کون سے ایسے رویے ہیں جو دکھ دیتے ہیں؟

☆......سردیوں کی بارش سے خوشی محسوس ہوتی ہے یا یاد کے جگنو آنکھوں کو نم کر دیتے ہیں؟

☆......فلموں سے دلچسپی ہے؟ کیسی فلمیں پسند ہیں؟

☆......کیسے لوگ اچھے لگتے ہیں؛ زندگی سے کیا سیکھا؟

☆...... سچی کہانیاں/ دوشیزہ کا ساتھ کیسا پایا؟

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خُدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خُدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کردینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو اِن وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہرحال محدود ہے۔ اِن ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ اِن صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/500 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کردیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات ٹوکن منی =/500 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اِس رقم میں اضافہ کرسکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔



(1)......مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)......منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3)......اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔



II 88-C۔ خیابانِ جامی۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

بلند فشار خون کے لیے دوا دستیاب ہے

دانتوں کے جملہ امراض کے لیے اکسیر دوا ہر عمر اور ہر جنس کے افراد کے لیے دستیاب ہے' اپنا آرڈر سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے نوٹ کروائیں۔

بچو! اللہ تم سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے پچھلے دنوں میری طبیعت کچھ ناساز رہی اس لیے جوابات مکمل طور پر نہیں دے سکا۔ بہر حال یہ سب تو زندگی کا حصہ ہے۔ ربیع الثانی اسلامی کلینڈر کا چوتھا مہینہ ہے۔ اس مہینے میں نوافل ادا کرنے کا بہت ثواب ہے۔ اچھے اعمال اور عبادات کا تو ویسے پورے سال ہی اجر ملتا ہے مگر کچھ مہینے خاص ہوتے ہیں اور ربیع الثانی بھی اُن میں سے ایک ہے۔ ایک خاص دعا بتا رہا ہوں جس کا بکثرت ورد نامہ اعمال میں بہت اجر لکھتا ہے۔ ' اللھم حسبنی حسبنا یسیراً ' ترجمہ: اے میرے رب میرا حساب آسان رکھنا۔ اللہ ہم سب کو توفیق دے کہ نامہ اعمال ہمارے سیدھے ہاتھ میں تھمایا جائے۔ نماز کی پابندی اور درود شریف کا کثرت سے ورد' والدین کی خدمت اور ضرورت مندوں کی امداد اس طرح کہ ان کی عزت نفس مجروح نہ ہو یہ وہ اعمال ہیں جو انسان کو بہشت سے قریب تر کر دیتے ہیں۔

□ رمشہ۔ بہاولپور

o بابا جی! میں بڑی مشکل میں گرفتار ہوں۔ میرے شوہر نے کاروبار کے لیے مختلف وقتوں میں لوگوں سے اُدھار رقم لی جو لاکھوں میں ہے واپسی تو کر نہ سکے اور خود روپوش ہو گئے۔ مہینوں بعد 5 منٹ کی کال کر کے خیریت بتا دیتے ہیں۔ روزانہ میرے دروازے پر لوگ آ کر مجھے ذلیل کر کے جاتے ہیں۔ جوان بچیوں کا ساتھ ہے خودکشی کی تو ہمت نہیں مگر دعا کرتی ہوں کہ وہ کال اب کبھی نہ آئے جس سے مجھے پتہ چلتا ہے کہ میرا شوہر زندہ ہے۔ بابا جی شوہر تو تحفظ دیتے ہیں اور اس شخص نے مجھے سر بازار لاکھڑا کیا۔ والدین نہ میرے حیات ہیں نہ سسرال میں کوئی قریبی رشتہ بچا ہے پھر مفلوک الحال رشتہ داروں کو تو کوئی نہیں پوچھتا۔ بابا جی میری بڑی بیٹیاں اسکول میں پڑھاتی ہیں ہمارا گزر بسر ہو جاتا ہے مگر اتنا نہیں کہ اُدھار چکا سکیں' قرض دینے والوں کو اگر پتہ چل جائے کہ میرا شوہر مر گیا ہے تو ہماری جان چھوٹ جائے گی میں جانتی ہوں آپ کو میرا خط پڑھ کر غصہ آئے گا مگر بابا جی میرے لیے میری اور بچیوں کی عزت اب سب سے اہم ہے میں بھی کیسی بدنصیب ہوں کہ شوہر کا ساتھ مصیبت کا سبب ہے

اطلاع عام

قارئین بھائی' بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتا نوٹ فرمالیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دیے گئے۔ اس نئے ایڈریس پر روانہ کیجیے۔

نیا پتا: 88-C-II۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7' کراچی

مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجیے۔ 021-35893121-35893122

چہرے پر رونق نہیں ہے' کیل مہاسے' جھائیاں ان سب سے نجات حاصل کرنے کے لیے خالص جڑی بوٹیوں سے تیار دوا سچی کہانیاں کے دفتر سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

اور اس کی موت میری جان خلاصی کر دے گی۔ مجھے صبر ملے اس کے لیے کچھ پڑھنے کو دیں۔

☆ بیٹی رمشہ! مجھے تمہارا خط پڑھ کر غصے کے بجائے جھرجھری آئی کہ ہم اپنے آپ کو مہذب معاشرہ کہتے ہیں، ہم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ تم دعا کرو کہ اللہ اسباب پیدا کرے کہ تمہارا شوہر ادھار چکا سکے میرے رب کے لیے سب ممکن ہے۔ بس تمہارا ایمان پختہ ہونا چاہیے۔ بہت اچھی بات ہے کہ تم اور بچیاں عزت سے روزی کما رہی ہو یہ بھی اُسی کا کرم ہے۔ بیٹی تم بعد نماز عشاء ایک بار سورۃ یٰسین پڑھو اور دعا کرو بے شک اللہ ہی مسب الاسباب ہے۔

□ غزالہ تراب۔ ہالینڈ

○ بابا جی اللہ آپ کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رکھے۔ میری بیٹی کراچی میں رہتی ہے اور آپ سے مستقل رابطہ ہے۔ آپ نے اُسے اولاد کے لیے تعویذ دیا تھا الحمدللہ شادی کے 11 سال بعد اللہ نے اُسے اپنی رحمت سے نوازدیا وہ آج کل میرے پاس ہے۔ بیٹی آپریشن سے ہوئی ہے دونوں ماں بیٹی صحت مند ہیں۔ بابا جی میں آپ کی احسان مند ہوں آپ مدد نہ کرتے تو میری بیٹی کا گھر اجڑ جاتا میرا داماد بھی اکلوتا ہے اس لیے اس کے گھر والے دوسری شادی کے لیے زور دے رہے تھے۔ کاش 11 سال پہلے آپ سے رابطہ کیا ہوتا' بابا جی بتایئے تعویذ کا کیا کرنا ہے وہ تو بیٹی کے سسرال میں اس کے کمرے میں ہے۔ دوسرے مجھے بچی کا نام بھی تجویز کر دیں بابا جی ایک بار پھر آپ کا بہت شکریہ۔

☆ بیٹی غزالہ! اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے کرم کیا میں تو بس وسیلہ ہوں۔ حسب استطاعت رقم صدقہ ضرور کر دو۔ اور بیٹی سے کہو اس عمل کو اپنی عادت میں شامل کر لے۔ جس دن ہمیں دل کھول کر اللہ کی راہ میں دینے کی عادت ہو گی اس دن سے ہمارے رزق اور دیگر معاملات بہترین ہو جائیں گے۔ بچی جب واپس جائے تب خود تعویذ تلف کر دے۔ والدین سے پوچھو انہیں جو نام پسند ہیں وہ مجھے ارسال کر دو میں بہترین نام بتا دوں گا۔ نام رکھنے کا پہلا حق تو والدین کا ہوتا ہے۔

□ روزینہ گل۔ کوئٹہ

○ بابا صاحب! میں آپ کی ادویات استعمال کرتی ہوں اور اپنے بہن بھائیوں کو جو باہر ممالک میں ہیں بھیجتی ہوں۔ پچھلے دنوں میں سچی کہانیاں کے دفتر آئی تھی اگلے دن شام میں میری فلائٹ تھی میں نے ان لوگوں سے ریکوئسٹ کی کہ زخموں والی دوا کی 12 بوتلیں اور دانت کی دوا کی 18 بوتلیں مجھے منگوا دیں مگر ان لوگوں نے کوئی واضح جواب نہیں دیا۔ اگلے دن فون کرنے پر کہا کہ دوا اتنی جلدی نہیں بن سکتی بابا صاحب مجھے بڑا دکھ ہوا اب دوا کوئٹہ کیسے منگواؤں؟

☆ بیٹی روزینہ! دیکھو میں نے بارہا یہ کہا کہ میں دوائیں بہت کم مقدار میں تیار کرتا ہوں یہ میرا کاروبار نہیں ہے۔ بس اللہ نے علم دیا ہے کوشش کرتا ہوں کہ لوگوں کو اس سے فائدہ ہو۔ تم دوائیں لیتی رہتی ہو تمہیں اندازہ ہو گا کہ دوا تیار کرنے میں کم از کم

بے اولاد جوڑوں کے لیے شرطیہ علاج' بانجھ پن یا کسی اور وجہ سے اگر اولاد نہ ہوتی ہو تو فوری رابطہ کریں۔ اور چند ماہ کے علاج کے بعد اپنی اولاد کو اپنے ہاتھوں میں کھلائیں۔

24 گھنٹے لگتے ہیں مقدار زیادہ ہو تو زیادہ وقت درکار ہوتا ہے۔ تم اگر کراچی آنے سے قبل کھلوا دیتیں تو مناسب رہتا بہرحال دوا بذریعہ بس کوئٹہ بھیجی جاسکتی ہے۔ مجھے تفصیل سے آگاہ کردو مریض کی عمر کیفیت بتانا ضروری ہے۔ میں دوا تیار کر کے کوئٹہ روانہ کردوں گا پریشان مت ہو۔

□ عبداللہ۔ لاہور

o بابا جان میں پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہوں پچھلے کئی سالوں سے کوشش کر رہا ہوں کہ باہر نکل جاؤں مگر کبھی وسائل اور کبھی حالات اجازت نہیں دیتے۔ میری والدہ مجھے جانے نہیں دیتیں اور پھر میں کمزور پڑ جاتا ہوں۔ مگر بابا جان اس طرح میں اپنا مستقبل تاریک کرلوں گا مجھے تعویذ ارسال کردیں تاکہ میں جلدازجلد پاکستان سے باہر چلا جاؤں اور اپنی ڈگری سے فائدہ اٹھاؤں۔

☆ بیٹے عبداللہ! زندگی میں آگے بڑھنا تمہارا حق ہے مگر یہ بھی تو سوچو کہ بوڑھی ماں کو چھوڑ کر چلے جاؤ گے تو کیا اُس کی آنکھیں ہر لحہ تمہاری یاد میں دروازے کی طرف نہ لگی ہوں گی۔ اللہ نے تمہیں موقعہ دیا ہے حال میں جیو مستقبل کی فکر مت کرو ماں زندہ ہے خوب خدمت کرو جنت مل جائے گی جب جنت مل جائے گی تب مستقبل بھی سنور جائے گا۔ دیکھو بیٹے والدین اولاد کو اس لیے نہیں پالتے کہ وہ بڑھاپے میں انہیں چھوڑ کر چلے جائیں تم اس دکھ کو محسوس ہی نہیں کرسکتے جو بوڑھے والدین تنہائی میں محسوس کرتے ہیں۔ نماز پابندی سے ادا کرو ماں کی خدمت کرو اور خوب درود شریف پڑھا کرو کامیاب ہو جاؤ گے۔

□ سمیعہ شہاب۔ پشاور

o بابا جان! اللہ آپ کو جیتا رکھے میں نے اپنی دوست کے کہنے پر آپ سے رابطہ کیا تھا۔ میرا مسئلہ بہت سنگین تھا میرے شوہر غیر عورتوں میں دلچسپی لیتے تھے۔ ان پر بہت پیسہ اڑاتے تھے۔ میں صبر کررہی تھی مگر پھر ان کی ایک رشتے کی بہن جو طلاق یافتہ ہیں پیچھے لگ گئیں بات شادی تک جا پہنچی تھی آپ کو یاد ہوگا میں نے آپ کو تفصیل تحریر کی تھی آپ نے مجھے تعویذ دیا باباجی الحمدللہ میرا مسئلہ حل ہوگیا۔ شوہر نے خود اس عورت سے جان چھڑالی اور مجھ سے وعدہ بھی کرلیا کہ آئندہ وہ مجھے دھوکا نہیں دیں گے۔ بابا جان میں اللہ کے بعد آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں شکرانے کے طور پر کچھ رقم ہدیہ کررہی ہوں قبول فرمائیں اور اس رقم کو بچیوں کی شادی میں استعمال کریں مجھے خوشی ہوگی۔ بتایئے تعویذ کا کیا کروں؟

☆ بیٹی سمیعہ! اللہ کا شکر ادا کرو، تم نے میری نصیحت مانی اس لیے آج خوش ہو۔ تعویذ تلف کردو، تمہاری ارسال کردہ رقم میں دو بچیوں کی شادی میں استعمال کرلوں گا۔ خوش رہو۔

□ طاہرہ احسن۔ گجرات

o بابا صاحب! پچھلے دنوں آپ سے بالوں کے لیے تیل اور زخموں کی دوا منگوائی تھی۔ مجھے معاف کردیجیے گا کہ وہ دوا میری بڑی بہن زبردستی مجھ سے

اندرونی اور بیرونی زخموں، آپریشن کے بعد ٹانکوں کا کچا رہ جانا یا کسی بھی قسم کی چوٹ کے لیے دوا دستیاب ہے۔
جن گھروں میں چھوٹے بچے ہیں وہاں اکثر کھیل کود کے دوران سر پر چوٹ لگ جاتی ہے ایسے میں یہ دوا سر میں خون جمنے نہیں دیتی، دوا حاصل کرنے کے لیے سچی کہانیاں کے دفتر فون کریں۔

لے گئیں اور استعمال بھی کرلی۔ ان کو اس سے بہت فائدہ ہوا۔ کئی سالوں سے ڈاکٹر سے علاج کروا رہی تھیں اور ڈاکٹرز نے آپریشن تجویز کردیا تھا مگر چند دنوں میں ہی وہ بہتری محسوس کررہی ہیں۔ بابا صاحب دوا تو میں نے اپنی کیفیات بتا کر منگوائی تھی اس لیے آپ کو بتاتے ہوئے ڈر رہی تھی کہ کہیں آپ ناراض نہ ہوجائیں۔ اب میں چاہتی ہوں کہ آپ میرے لیے چار اور بہن کے لیے آٹھ بوتلیں تیار کردیں میرے بہنوئی اپنے کام کے سلسلے میں اگلے ماہ کراچی آرہے ہیں وہ خود سچی کہانیاں کے آفس سے لے لیں گے۔ بابا صاحب تیل ابھی ہے میرے پاس لیکن اگر اس کی بھی دو بوتلیں دے دیں تو ممنون ہوں گی۔

☆ بیٹی طاہرہ! میری ادویات ہر کسی کو فائدہ ہی دیتی ہے نقصان نہیں کیونکہ وہ دم کی ہوئی ہوتی ہیں لہٰذا اطمینان رکھو تم نے کوئی غلطی نہیں کی وہ دوا بہن کے نصیب میں تھی لہٰذا اس نے ہی استعمال کی۔ میں تمہارے لیے دوائیں اور تیل تیار کردوں گا۔

□ بیں خاتون۔ اسلام آباد

☆ بٹی جبیں! اللہ کا شکر ادا کرو کہ تمہارے بیٹے کو عقل آگئی ورنہ تمہارا بڑھاپا بہت تکلیف میں گزرتا۔ بس میری نصیحت پر عمل کرتی رہنا۔ روپیہ پیسہ جمع کرنے کی چیز نہیں اس کو ضرورت مندوں پر خرچ کروگی تو زندگی بہت پُرسکون گزرے گی۔

تعویذ اپنے پاس حفاظت سے رکھو۔

□ بٹی۔ مقام نامعلوم

o بابا جی! میں آپ کی بہت دکھی بٹی ہوں۔ میرے والدین نے میری شادی مجھ سے دگنی عمر کے آدمی سے یہ کہہ کر کرادی کہ پیسے والا ہے تمہیں عیش کرائے گا۔ عیش تو کیا کرتی میں روز مار کھاتی ہوں، نوکروں کے سامنے ذلیل کرتا ہے، ملنے والوں کے سامنے گالیاں دیتا ہے مجھے اپنے کسی رشتے دار سے ملنے کی اجازت نہیں۔ اللہ نے دو بیٹے دیے دونوں کو ہی اتنی چھوٹی عمر میں باہر بھجوا دیا وہاں وہ اپنی پھوپو کے پاس رہتے ہیں اور یہ خوب بھر بھر کر پیسہ بھیجتا ہے۔ بابا جی میں سونے کے پنجرے میں قید ہوں۔ دنیا کی ہر نعمت ہے مگر عزت اور آزادی نہیں ہے۔ آپ نے اتنے لوگوں کی مدد کی ہے میری بھی کردیں۔ مجھے اپنے بچے مل جائیں اور اس جلاد سے میری جان چھوٹ جائے۔ آپ کو میں یہ بتادوں کہ میرا شوہر بہت طاقتور آدمی ہے سوائے اللہ کے کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

☆ بٹی! تمہارے حالات جان کر دکھ ہوا۔ اگر تمہارے لیے ممکن ہو تو سچی کہانیاں کے دفتر سے اپنے تعویذ منگوالو۔ تمہارے گھر پر بھیجنا مجھے مناسب نہیں لگتا نہ ہی محفوظ بیٹی بس اللہ ہی ہے جو سب سے زیادہ طاقت ور ہے۔ تمہارے حالات تکلیف دہ ہیں مگر ایسا بھی نہیں کہ تم ہمیشہ دکھ اٹھاتی رہو گی مجھے یقین

بچیاں جن کی شادی میں رکاوٹ ہے اپنی والدہ کے نام کے ساتھ لکھیں کلام الٰہی سے شرطیہ علاج انشاء اللہ چند دنوں میں رکاوٹ دور ہوں گی اور من پسند شخص ملے گا۔

ہے کہ جلد تمہارے مشکل دن دور ہو جائیں گے۔ بس ہمت اور مکمل ایمان کے ساتھ حالات کا سامنا کرو۔ بعد نماز فجر ایک بار سورۃ کہف ضرور پڑھو' چلتے پھرتے پڑھو' یا قہار' صدقہ خیرات خوب کیا کرو۔ کیا پتہ کب کس کی دعا لگ جائے اور تمہاری مشکلات کا خاتمہ ہو جائے۔

□ نور اللہ۔ سوات۔

○ عزیز بابا جی! السلام علیکم! میں ایک شادی شدہ' بے روزگار 28 سالہ نوجوان ہوں۔ اپنے والدین کے ساتھ رہتا ہوں۔ میرا کوئی کاروبار نہیں ہے' کاروبار ختم ہو گیا۔ اب تو سر پر قرضے کا بوجھ بھی ہے۔ آپ سے التماس ہے کہ کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ خدائے بزرگ و برتر اپنی رحمت اور کرم سے روزگار یا کوئی کاروبار عطا کر دے۔ اللہ تعالیٰ کے کرم سے نماز تو میں پڑھتا ہوں مگر عبادت میں دل نہیں لگتا۔

☆ بیٹے نور! کوئی انسان کسی دوسرے انسان پر احسان نہیں کر سکتا ہے۔ ایک دوسرے کی مدد کرنا ہی انسانیت ہے۔ پروردگار اپنے بندوں سے بہت محبت رکھتا ہے۔ تم صرف اس پاک ذات سے مدد مانگو' وہ ضرور کرم کرے گا۔ نماز کی پابندی رکھو اور نماز فجر اور عشاء کے بعد سورۃ الزمر آیت 49' 71-71 بار پڑھو اور دعا کرو۔ نماز ادا کرنے سے قبل دعا کیا کرو کہ رَبّ العزت! میری نیت صرف تیری رضا حاصل کرنا ہی ہے۔ تو میرے سجدے قبول فرما' دین اور دنیا لے کر چلنا ہی کامیابی ہے۔ وقت ضائع مت کرو اور جدوجہد جاری رکھو۔ مجھے 2 ماہ بعد مطلع کرو۔

□ لائبہ۔ کھاریاں۔

○ قابلِ احترام بابا جی! السلام علیکم! میں بہت ہی دکھی لڑکی ہوں مگر اپنے دکھ کسی کو بتا بھی نہیں سکتی کیونکہ والدین جیسے رشتوں کے دکھ کسی اور کو کیسے بتائے جا سکتے ہیں؟ میرے ابو نے دوسری شادی کی ہوئی ہے۔ میں پہلی بیوی سے ہوں۔ اس وقت دادی کے گھر میں رہتی ہوں۔ میرے ابو کو مجھ سے کوئی دلچسپی پیار نہیں' صرف دوسری امی کے بچوں کو پیار کرتے ہیں اور وہ اگر بیمار ہو جائیں تو ان کا علاج توجہ سے کراتے ہیں۔ مجھے کئی سال سے دانتوں اور مسوڑھوں کی بیماری ہو گئی ہے۔ مسوڑھوں سے خون آتا ہے' دانت پیلے اور منہ میں بدبو ہو گئی ہے۔ ٹوتھ پیسٹ وغیرہ سے فرق نہیں پڑتا۔ اس وجہ سے بہت فکرمند اور لوگوں سے دور دور رہتی ہوں۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ بچپن میں ایک جگہ منگنی کر دی گئی تھی۔ وہ لڑکا بری عادتوں میں پڑ گیا ہے مگر اپنا رشتے دار ہے جبکہ غیروں میں رشتہ کرتے نہیں۔ خاندان میں دوسرا لڑکا دکھائی نہیں دیتا۔ ابو کبھی کہتے ہیں' رشتہ کریں گے' کبھی کہتے ہیں' نہیں کریں گے۔ میں بہت فکرمند ہوں۔ کوئی اچھا انسان اللہ تعالیٰ نصیب کرے۔ بابا جی! انٹر کا امتحان دیا ہے۔ میڈیکل میں جانے کی خواہش ہے۔ کوئی دعا بتائیں کہ اچھے نمبر آئیں۔ بابا جی! اپنوں کے ہوتے ہوئے بھی یتیم کی طرح ہوں۔ ماں دوسرے گھر ہے اور باپ کے گھر میں باپ کا پیار نصیب نہیں۔ سوتیلی ماں کی نوکرانی ہوئی ہوں۔

☆ بیٹی لائبہ! اللہ تعالیٰ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ سرسوں کا تیل اور نمک ہم وزن ملا کر رکھو اور انگلی کی مدد سے دانتوں میں اچھی طرح لگاؤ پھر نہ تو کلی کرو اور نہ آدھے گھنٹے تک کچھ کھاؤ پیو۔ لعاب تھوک دیا کرو۔ یہ عمل دن میں دو تین دفعہ کرو۔ مکمل افاقہ ہو گا۔ بیٹی! تم معصوم بچی ہو۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ تمہیں زندگی میں بہت خوشیاں عطا فرمائے۔ نماز فجر اور عصر کے بعد 3-3 تسبیح یَانَافِعُ کی پڑھو۔ کرم ہو گا۔ مدت 41 دن ہے۔

☆☆......☆☆☆

شعروسخن

حمد

اے میرے رب گر تو مجھ سے راضی ہوجائے
اُس پل زندگی میری بھی سنور جائے
کس قدر ہے اپنے بندوں پر مہربان تُو
جو بھی ہو تنہا تو اُس کا ساتھی ہوجائے
جب کبھی بے چین اپنے دکھوں سے ہوجاؤں
یاد کرکے تجھے میں سکوں پاؤں
خوشی میں تجھے بھول جاتا ہوں میں
یہ نادانی ہر بار مجھ سے ہوجائے
دنیا کی محفلوں میں اب دل نہیں لگتا میرا
کاش تیرے محبوب ﷺ کا در نصیب ہوجائے
دور تجھ سے رہنے والا بھٹک جاتا ہے
زندگی اب میری بھی یاد میں تیری گزر جائے

شاعرہ: حمیرا وحید۔ واہ کینٹ

بیٹے اور بہو کی یاد میں

دعا کرو کسی کا کوئی رشتہ گم نہ ہو
شدتِ غم سے بن جاتے ہیں چہرے پتھر
جاتے ہوئے ہرگز وہ خوش نہ تھے
تقدیر بھی بنادیتی ہے فیصلے پتھر
ہاں! یادِ ماضی بھی عذاب ہے یارو
سوچوں پہ بھی پڑجاتے ہیں بھاری پھر
ہوتا ہے کوئی بھی تہوار ناچتی ہے خوشی ہرسُو
میرے قلب وجاں پہ دے رہے ہیں پہرہ پتھر
جاتے ہوئے وقت رخصت دیکھا جو اُن کو
زندہ تو تھیں آنکھیں مگر شدت غم سے پتھر
دیکھتا ہوں کبھی بھولے سے تصویر اُن کی
مارے حیرت کے ہوجاتیں ہیں آنکھیں پتھر
غم کے ماروں کا نہ پوچھ کبھی حال اُن کا
سینے میں دھڑکن تو ہے مگر دھڑکتا ہے پتھر
اُن سے لفظوں کا نہیں روح کا تعلق تھا میرا
یہی سوچ کے میں بھی ہوجاتا ہوں اکثر پتھر
مجھ کو کہاں ہے اتنا فہیم کہ سمجھوں تقدیر کو
یہی سوچتے سوچتے ہوجاؤں گا میں بھی پتھر
یاد آتی ہے تو اُن کی کلیجہ منہ کو آتا ہے
امین دھڑکن دل کی اب رفتہ رفتہ ہورہی پتھر

شاعر: ڈاکٹر امین۔ قتالپور

غزل

اے محبت تو میری محبت کا خیال رکھنا
میں رہوں نہ رہوں تو اُسے سنبھال رکھنا
محبت نادان ہے وہ میری جان وفا
تو اس کی ہنسی کو ہمیشہ برقرار رکھنا
نہ گرے آنسوؤں کی ایک بوند بھی اس کی آنکھوں سے
تو موتیوں کی طرح اس کے آنسوؤں کو سنبھال رکھنا
جب بھی وہ رویا میرے یار تو اسے اتنا کہنا
کہ میں لوٹ آؤں گا بس مجھ پر تھوڑا اعتبار رکھنا
اور جب تک میں لوٹ نہ آؤں تب تک اے محبت
تو میری محبت کا خیال رکھنا

شاعر: خضر حیات۔ روڈہ تھل

غزل

اُس کے نیناں کٹار کی باتیں
اُس کے نقش و نگار کی باتیں
اُس کے سولہ سنگار کی باتیں
آج کرتے ہیں پیار کی باتیں
میرے جیسا مجھے وہ لگتا ہے
جو بھی کرتا ہے یار کی باتیں

کب محبت میں جیت ہوئی ہے
یہاں تو ہوتی ہیں ہار کی باتیں
اُس کی آنکھوں میں ڈوب کر ساگر
میں نے جانا خمار کی باتیں
شاعر: ولسن ساگر

غزل

کسی رہ گزر سے ہٹ کر کبھی آسکو تو آؤ
کبھی ہم کو آزماؤ کبھی خود کو آزماؤ
ہے کڑی راہ محبت کہیں پڑ نہ جائیں چھالے
کہیں رہ گزار نہ بدلو کہیں لوٹ ہی نہ جاؤ
میری انجمن میں آکے کبھی بیٹھ کر تو دیکھو
کہ یہاں سکوں ملے گا مگر کاش تم جو آؤ
میرے دل کے آئینے میں کبھی جھانک کر بھی دیکھو
ایک تم ہی جلوہ گر ہو فری دیکھنے تو آؤ
میری انجمن میں آکر کبھی بیٹھ کر تو دیکھو
کہ یہاں سکوں ملے گا مگر کاش تم جو آؤ
شاعرہ: فریدہ فری۔ لاہور

غزل

لفظوں کو جوڑتا ہوں غم بھلانے کے لیے
یہ بے درد دنیا چلی آئی آزمانے کے لیے
اس کی یادوں کے بحر میں ڈوبا رہتا ہوں
اب ہمیں فرصت بھی نہیں ملتی مسکرانے کے لیے
پھول تھے تو مسل ڈالا سب نے، تو اب حیرت کیسی؟
دیر کتنی لگتی ہے خود کو خار بنانے کے لیے
سر راہ پامال ہوئیں ہیں وفائیں دیکھو تو
ہر کوئی بولی بول رہا ہے دام بڑھانے کے لیے
دفن ہوں میں اپنی خواہشوں کے تاریک مزار میں
کوئی تو آئے میری ذات پر اگربتی سلگانے کے لیے
شاعرہ: مریم شاہ بخاری۔ سرگودھا

غزل

درد دوسروں کے کبھی دل میں بسا کے دیکھو
خواب اوروں کے آنکھوں میں سجا کے دیکھو
یوں سمجھتے ہو خود کو پائیدار بہت تم
جنائے وفا کے ہاتھوں سے اُٹھا کے دیکھو
کیا ہوتی ہے لذات اس درد محبت میں یارو
یہ درد کبھی اپنے سینے میں بسا کے دیکھو
پھولوں سے تو سبھی پیار کیا کرتے ہیں
دل ہے تو کبھی کانٹوں سے لگا کے دیکھو
ہم لوگ محبت پہ خود کو بھی لٹا دیتے ہیں
ہو فرصت تو کبھی ہم کو بھی آزما کے دیکھو
خود کو بھلا بیٹھنے ہو کس غرور میں آکر
اک بار تو اپنے ماضی کو دہرا کے دیکھو
کرتے ہو تم سدا دوسروں پہ نکتہ چینی
آئے بہار کبھی خود کو تو بنا کے دیکھو
شاعر: عامر شہزاد۔ ننکانہ صاحب

غزل

کوئی جنتر منتر کر سائیں
ٹونہ عشق دا چھڈ دے جان میری
او میرا اے تے مینوں مل جاوے
میں تے کڈے تن تو جان میری
کینوں دساں اپنے دل دا حال
تو ہی نیڑے ہو کے سن فریاد میری
نہ میں بلھے وانگوں نچ سکدا
نہ میں ہجر دی سولی چڑھ سکدا
نہ میں مجنوں وانگوں رُل سکدا
نہ ہی مار عشق دی سہہ سکدا
کوئی اسم اعظم دے سائیں
ٹونہ عشق دا چھڈ دے جان میری
شاعرہ: حنا بشریٰ۔ لاہور

پاکستانی شوبز

شوبز سے جڑی تہلکہ خیز خبریں......

اور نئی ریلیزز.......

ادارہ

ہر دیوار رکاوٹ نہیں ہوتی

عاصم اظہر کوک اسٹوڈیو میں پرفارم کرنے والے کم عمر ترین سنگر ہیں اس وقت اُن کی عمر صرف 22 سال ہے۔ اُن کا گانا تیرا وہ پیار جو مومنہ مستحسن کے ساتھ ہے۔ اس نے ریکارڈ بزنس کیا ہے صرف یوٹیوب پر 100 ملین لوگوں نے یہ گانا دیکھا ہے۔ عاصم چوتھے پاکستانی سنگر ہیں جن کے گانے کو اس قدر پذیرائی ملی' پاکستانی Justin Bieber کا مستقبل بہت تابناک ہے۔ عاصم کا ماننا ہے اُن کی کامیابیوں میں اس دیوار کا بہت بڑا ہاتھ ہے جو اُن



کی والدہ نے ان کے لیے سجائی ہے۔ بچپن سے لے کر اب تک انہیں جو شخصیت اچھی لگتی تھی اس کی تصویر کا فریم اس دیوار پر موجود ہے اور عاصم اپنے پسندیدہ لوگوں کی کامیابیوں سے سیکھ سیکھ کر ہی بڑے ہوئے ہیں عاصم کو سائرہ شہروز بے حد پسند ہیں اور اس دیوار پر سائرہ کے ساتھ بھی تصویر موجود ہے۔

اذان سمیع جو پروڈیوسر ہیں نے اپنی تازہ ترین تصویریں اپ لوڈ کر کے ان تمام لوگوں کو حیران کر دیا جو دو سال پہلے تک اذان کو موٹا اور بھدا کہتے تھے۔



اذان کہتے ہیں کہ میری بیٹی کی پیدائش کے بعد میری والدہ نے ایک بار پھر اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ وہ مجھے کیمرے کے سامنے بھی دیکھنا چاہتی ہیں بس ان کی بات نے ایسا اثر کیا کہ میں نے اپنے اوپر مکمل توجہ دی اور دو سال کی سخت ورزش اور ڈائٹ کے بعد آج میں آپ سب کے سامنے ہوں۔ وہ اپنے پرسنل ٹرینر پرویز ریانی کے بھی مشکور ہیں ان کے بغیر شاید یہ سب ممکن نہ ہوتا۔ آج کل اذان مایا علی اور شہریار منور کے لیے میوزک کمپوز کر رہے ہیں اس کے علاوہ ماہرہ خان اور بلال اشرف کی فلم پر بھی کام کر رہے ہیں۔ ایک اور پراجیکٹ بھی لائن میں ہے مگر اذان ابھی اس پر بات نہیں کرنا چاہتے۔

میری ننھی پری

علیزے شاہ جن کے ڈرامے عشق تمام نے TRP کے تمام ریکارڈ توڑ دیے ہیں اپنی کم عمری کے بھی تمام ریکارڈ توڑ چکی ہیں۔ علیزے شاہ کی عمر صرف 17 سال ہے اور ان کے پاس قومی شناختی کارڈ بھی

ہیرو ایک بار پھر...

فلموں کے شوقین بہت جلد چوہدری اسلم پر بننے والی فلم دیکھ سکیں گے۔ پروڈیوسر نہا لاج جو چوہدری



اسلم کے کارناموں کی بہت بڑی فین ہے فلم پر کام شروع کر رہی ہیں یہ فلم ان کے بچپن سے لے کر شہادت تک کے واقعات پر مبنی ہوگی۔ ان کا ماننا ہے کہ چوہدری اسلم نے پولیس فورس کا نام بہت روشن کیا ہے اور لوگ انہیں بطور پولیس افسر ہی جانتے ہیں وہ ان کی زندگی کے ان پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالیں گی جو منظر عام پر نہیں آسکے۔ ماڈل زارا عابد فلم میں مرکزی کردار ادا کریں گی۔ فلم کے ڈائریکٹر عبداللہ بادینی ہیں فلم آئندہ سال فروری میں شروع ہوگی اور امید ہے کہ 11 مہینوں میں مکمل ہو جائے گی۔

ہیروئن کا بیٹا ہیرو

زیبا بختیار اور عدنان سمیع کے صاحبزادے

نہیں، مذاق رات میں جب ہوسٹ نے اُن سے اُن کی عمر پوچھی تو وہ فقط 17 سال کی نکلیں۔ جس پر میزبان واسع چوہدری بھی حیران رہ گئے۔ مگر پھر اپنی حیرانی کو یہ کہہ کر دور کیا کہ ٹیلنٹ تو ٹیلنٹ ہے بھئی......



لوٹ کے بدھو...

باکسر عامر خان اور ان کی بیگم پچھلے دنوں کافی خبروں میں رہے ان کی شادی طلاق تک پہنچ گئی تھی اور ایک دوسرے پر رکیک الزامات کی بوچھاڑ جاری تھی جیسا کہ عموماً ہوتا ہے۔ مگر اب دونوں آپس میں



خوش ہیں اور اپنی غلطیوں پر نادم بھی...... پچھلے دنوں وہ عمرے پر بھی گئے اور وہاں کی تصاویر بھی خوب اپ لوڈ کیں۔ جس سے ان کے فینز کو خوشی ہوئی۔

محبت کی ہوگئی بلے بلے

محبت مرزا وہ اداکار ہیں جو اپنی شرائط پر کام کرتے ہیں۔ ٹی وی اسکرین سے شہرت پانے والے اس اداکار نے آمنہ شیخ سے شادی کی اور پھر زندگی بھی اپنی شرائط پر گزاری ٹی وی پر دوبارہ آنے کے سوال پر محبت مرزا کا کہنا ہے کہ وہ جاندار



اسکرپٹ کے منتظر تھے جو دیدن کی صورت انہیں مل گیا ہے۔ مین رول ہی سب کچھ نہیں ہوتے، بارہا دہرائی جانے والی کہانی ان کی توجہ بھی حاصل نہیں کرسکتی۔ کچھ نیا اس وقت کی اشد ضرورت ہے۔

انعم سدھاری پیا دیس

انعم فیاض بھی اپنے گھر کی ہوگئیں۔ زرد موسم مرجائیں بھی تو کیا، عشق عبادت، بند کھڑکیاں جیسے بڑے پراجیکٹ میں کام کرنے والی نازک سی اداکارہ کا نکاح 2016ء میں حرم شریف میں ہوا تھا۔ نکاح کے بعد انعم اپنے شوہر کے ساتھ کئی مارننگ شوز میں آئی تھیں۔ جس سے ان کے فینز کو یہ تاثر ملا کہ انعم کی رخصتی بھی ہوگئی ہے مگر یہ درست نہیں، ہم نئے جوڑے کو زندگی کے اس سفر پر کامیابی کی دعا دیتے ہیں۔

☆☆......☆☆